حصہ اول

ہمزاد کی واپسی

اب میرے مرنے میں صرف آٹھ دن باقی ہیں۔ میں تمہیں اپنی سرگزشت اس لیے نہیں سنا رہا کہ تم مجھ سے ہمدردی کرو۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں گا' اگر تم مجھے اس آخری وقت میں کچھ نفرت ہی دے سکو۔ میں اس عذاب میں مرنا نہیں چاہتا کہ مجھ سے نفرت بھی نہیں کی گئی۔ تو سنو کہ میرے چہرے اور بقیہ جسم میں تضاد کیوں ہے؟ یہ دراصل عمروں کا فرق ہے۔ میرے چہرے کی عمر اس وقت تقریباً" ایک سو تیس سال ہے جب کہ بقیہ جسم کی عمر پچیس سال۔ لوگ تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ شیخ کرامت' چاٹگام کا ایک امیر ترین شخص ہے' یعنی میں! جو کینسر میں مبتلا ہو کر بستر مرگ پر پڑا ہے' لیکن حقیقت یہ نہیں۔ مجھے جاننے کے لیے تمہیں میرے ماضی میں سفر کرنا پڑے گا۔

میں نے جب ہوش سنبھالا تو خود کو یتیم پایا۔ میری پرورش اس وقت میرے ضعیف نانا اور نانی کر رہے تھے۔ میرے نانا نے مجھے درس و تدریس کی طرف مائل کیا کیوں کہ ان کا ذریعہ معاش بھی یہی تھا۔ نانا کے انتقال کے بعد میری گزر بسر کا دارومدار درس و تدریس پر تھا' لیکن یہ آمدنی انتہائی قلیل تھی۔ میں اب بیس سال کا جوان تھا۔ میرے دل میں اچھی زندگی گزارنے کی امنگ تھی۔ میں اپنی زندگی سے قطعی غیر مطمئن تھا۔ ایک شام میں بیزار سا بیٹھا اپنے حالات پر غور کر رہا تھا کہ میری نظر گھر میں مدتوں سے پڑی ہوئی پرانی بوسیدہ کتابوں پر پڑ گئی ایک کتاب میں نے یوں ہی اٹھالی اور پڑھنے لگا۔ وہ ایک قلمی نسخہ تھا' زبان فارسی تھی جس سے میں بہ خوبی واقف تھا۔ میں پڑھنے لگا۔ تحریر کچھ یوں تھی کہ ہر ذی روح کے دو جسم ہوتے ہیں' ایک مرئی' دوسرا غیر مرئی' ایک کثیف دوسرا لطیف' ایک مادی دوسرا روحانی..... میری دلچسپی قلمی نسخے میں بڑھتی گئی۔ اس میں روحانی جسم کا نام "ہمزاد" تحریر تھا جس کے بارے میں لکھا تھا اسے قابو میں کیا جا سکتا ہے' اور جس کے قبضے میں ہمزاد آجائے وہ دنیا کا خوش نصیب آدمی ہو سکتا ہے۔ اس میں جسم لطیف یا ہمزاد کی صفات کے بارے میں بھی تحریر تھا' مثلاً" پلک

جھپکتے ہی ہمزاد دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جا کر واپس آ سکتا ہے' پہاڑوں کی بلندیوں اور سمندر کی گہرائیوں کی خبر لا سکتا ہے۔ بڑی سے بڑی وزنی شے جسے سینکڑوں آدمی مل کر نہیں اٹھا سکتے' اسے ہمزاد اکیلا کہیں سے بھی اٹھا کر لا سکتا ہے۔ وہ مشکل سے مشکل مسائل حل کر سکتا ہے۔ سخت اور مہلک بیماریوں کے علاج تجویز کر سکتا ہے۔ مستقبل میں جو کچھ ہونے والا ہے' ہمزاد اس سے آگاہ کر سکتا ہے۔ ہمزاد مدفون خزانوں کے راز بتا سکتا ہے اور گم شدہ لوگوں کا سراغ بھی لگا سکتا ہے۔ وہ لوہے اور پتھر کی دیواروں میں سے گزر سکتا ہے اور خطرناک سے خطرناک جانوروں کو ٹھکانے لگا سکتا ہے۔ ہمزاد' دیو ہیکل سے دیو ہیکل شخص یا اشخاص کو چشم زدن میں زیر کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی وہ لاتعداد پُراسرار قوتوں کا مالک ہے۔

ہمزاد کی لاتعداد اور پُراسرار قوتوں کے بارے میں پڑھ پڑھ کر میں خوابوں کی دنیا میں کھو گیا۔ قلمی نسخے میں لکھا تھا کہ ہمزاد کو قابو میں کیا جا سکتا ہے۔ اسی وقت میں نے فیصلہ کیا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ہمزاد کو قابو میں کرنے کا عمل کروں گا۔ ہمزاد کو قابو میں کرنے کے لیے متعدد عمل بھی قلمی نسخے میں درج تھے' تمام احتیاطیں اور طریق عمل بھی موجود تھا۔ عمل کی مدت چالیس دن تھی۔ اس کے ساتھ درج شرائط ایسی تھیں کہ مجھے بچوں کو پڑھانا ترک کرنا پڑا۔ میرے پاس بہت ہی کم پیسے جمع تھے جن سے میں نے یہ انتظام کیا کہ عمل کے دوران میں کھانے پینے کی پریشانی نہ ہو۔ پھر میں نے اپنے لیے ایک عمل کا انتخاب کیا اور عمل شروع کر دیا' لیکن عمل کے دوران میں مجھے عجیب' عجیب واقعات سے سابقہ پڑا اور میں اپنا عمل اکیس دن سے زیادہ جاری نہ رکھ سکا۔ میں نے دوبارہ عمل شروع کیا' مگر اس مرتبہ بھی ناکام رہا۔ میں طے کر چکا تھا کہ ہر حال میں اپنے ہمزاد کو بس میں کروں گا اس لیے تیسری مرتبہ عمل شروع کر دیا۔ دس دن سکون سے گزر گئے' مگر گیارہویں دن سے پھر وہی سب کچھ شروع ہو گیا' طرح طرح کی ڈراؤنی آوازیں' ہیبت ناک مناظر دل ہلا دینے والا شور چیخیں' کراہیں اور سسکیاں! لیکن اب میں فیصلہ کر چکا تھا کہ کسی قیمت پر عمل کے دوران میں ان باتوں سے خوف زدہ نہیں ہوں گا۔ اس مرتبہ میں نے چالیس دن پورے کر لیے۔ میں نے چالیسویں دن جیسے ہی عمل ختم کیا' مجھے حویلی کے دروازے پر دستک سنائی دی۔ وہ کوئی مسافر تھا جو اسٹیشن کا راستہ پوچھ رہا تھا۔ میں نے اسے راستہ بتا دیا۔ اس نے جانے سے پہلے اجازت چاہی۔ میں نے کہا کہ جاؤ' اب کیا ہے! اس نے اسی طرح تین مرتبہ پوچھا کہ جاؤں' مجھے اجازت ہے؟ میں جھنجلا گیا اور بلند آواز میں کہا کہ ہاں جاؤ! میری طرف سے تمہیں جانے کی اجازت ہے۔

"اچھا تو اب میں چلتا ہوں' اب مجھے نہ بلانا!" یہ کہہ کر اس نے اپنے چہرے سے کپڑا ہٹایا اور پھر دوسرے ہی لمحے غائب ہو گیا۔

وہ ہو بہو میرا ہم شکل تھا' میرا ہمزاد! تو وہ اس بار بھی جل دے گیا! میری اجازت سے چلا گیا! میں بہت ملول ہوا' چیخا چلایا' مگر بے سود! دور دور تک اس کا نام و نشان نہ تھا۔ وہ مجھے آخری فریب دینے میں بھی کامیاب رہا تھا۔ اب میرے سامنے پھر وہی پیسوں کا مسئلہ تھا' چالیس دن کے کھانے پینے کا انتظام یا مکمل تباہی اور رسوائی!

میں جس حویلی میں رہتا تھا' وہ بہت وسیع و عریض تھی۔ پرانے وقتوں کی اس حویلی کا آدھا حصّہ زمانے اور وقت کی دستبرد سے اب تک محفوظ تھا۔ آدھے حصّے میں میرا قیام تھا اور آدھا حصّہ شکستہ حالت میں بلکہ ملبے کی صورت میں پڑا تھا۔ میرے ذہن میں ترکیب آ گئی۔ میں نے ایک ٹھیکیدار سے بات کر کے سارے ملبے کا سودا بہت سستے داموں کر ڈالا۔ اب میرے پاس پیسے آ گئے تھے۔ میں نے سب سے پہلے اپنے کھانے پینے کا انتظام کیا اور اسی رات سے عمل بھی شروع کر دیا۔ میں اس عمل کے دوران میں پوری طرح چوکنّا تھا۔ بالآخر میں نے عمل کی مدت پوری کر لی۔ میں ابھی عمل پورا کر کے سویا ہی تھا کہ ملبا اٹھانے والے مزدوروں نے مجھے جگا دیا۔ وہ ایسا حیرت انگیز اور سمجھ میں نہ آنے والا واقعہ تھا۔ مزدوروں کو ملبا اٹھاتے ہوئے ایک بنیاد میں تقریباً" دس فٹ نیچے کانسی کا ایک چراغ جلتا ہوا ملا تھا۔ میں' مزدوروں کے ساتھ وہاں پہنچا اور یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ یہ وہی چراغ تھا جس کی مدد سے میں عمل کر رہا تھا۔ میں نے وہ چراغ بنیاد سے اٹھا لیا اور آیت الکرسی پڑھ کر پھونک ماری' چراغ بجھ گیا۔ وہ چراغ اپنے ساتھ لے آیا۔

مزدور اس واقعے سے اتنے خوف زدہ ہوئے کہ کام چھوڑ کر بھاگ گئے۔ رات ہوئی تو میں نے اس چراغ کو گھس کر دیکھا' مگر کچھ نہ ہوا۔ تنگ آ کر میں نے اسے تکیے کے نیچے رکھا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی اور میں نے سوچا کہ اب مزید عمل نہیں کروں گا۔ اس لیے کہ مقررہ وقت گزرنے کے باوجود میں اپنے ہمزاد کو بس میں نہیں کر سکا تھا' لیکن اسی رات مجھے وہ سب کچھ مل گیا جس کے لیے اتنی مصیبتیں برداشت کی تھیں۔ میں اپنے ہمزاد سے ہم کلام تھا اور اس سے شرائط طے کر رہا تھا۔

"تم نے کتنی مدت کے لیے مجھے اپنے قابو میں کیا؟" میرے ہمزاد نے سوال کیا۔

میں نے خوب سوچ سمجھ کر جواب دیا۔ "سو سال کے لیے۔"

اس نے مجھے بتایا کہ وہ ایک روح ہے اس لیے اگر ناپاکی کی حالت میں اسے طلب کیا

گیا تو نہ آسکے گا کیوں کہ روح پاک ہوتی ہے۔ جب بھی اسے بلایا جائے ہمیشہ پاک ہونا ضروری ہے۔

پھر اس نے میری اور میں نے اس کی شرائط مان لیں۔

اس رات کے بعد میری زندگی بدل گئی۔ میں یکسر بدل گیا۔ روپے پیسے کی میرے پاس کمی نہ رہی۔ میں نے چند ہی دنوں میں کھنڈر جیسی حویلی کی جگہ محل تعمیر کرا لیا۔ میرے تعلقات بھی اب کافی وسیع ہو گئے تھے۔ میرا شمار شہر کے معززین میں ہونے لگا۔ لوگ اس بات سے بھی آگاہ ہو گئے کہ میرے پاس کچھ نادیدہ اور پُراسرار قوتیں ہیں۔ وہ میرے معتقد ہوتے گئے۔ میں نے اب تک ایک فٹن بھی خرید لی تھی۔

ایک شام میں اپنی فٹن میں سیر کر کے واپس ہو رہا تھا کہ ایک گھر کے دریچے پر میری نظر پڑی۔ وہ لڑکی اتنی ہی حسین تھی کہ اسے ایک نظر دیکھ کر اس پر جان و دل قربان کیے جا سکتے تھے۔ میں اسے دیکھ کر بے تاب ہو گیا۔ اپنی محل نما حویلی میں پہنچ کر میں رات گئے تک اسی کے تصور میں کھویا رہا۔ ہمزاد سے میری یہ حالت نہ دیکھی گئی۔ اس نے کہا کہ اے شیخ! اگر آپ چاہیں تو میں آپ کے لیے اسی وقت اس لڑکی کو لا سکتا ہوں۔

اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں! میں راضی ہو گیا۔ ہمزاد نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اس لڑکی پر اپنی اصلیت ظاہر نہ کروں۔ اس کا نام رضیہ تھا۔ ہمزاد اسے سوتے ہوئے اٹھا لایا۔ میں نے اس پر خود کو کسی اور دنیا کا فرد ظاہر کیا۔ وہ کچھ یقین اور بے یقینی کی کیفیت میں میری آرزوؤں کی تکمیل بن گئی۔ صبح دَم میں نے غسل کر کے ہمزاد کو طلب کیا اور رضیہ کو اس کے گھر بھیج دیا، اس وعدہ پر کہ آئندہ رات اسے پھر بلاؤں گا۔ اس نے میری کہانی، اپنے گھر والوں کو بھی سنائی کہ میں عالم ارواح کا ایک شہزادہ ہوں۔ اس کہانی پر کسی نے یقین نہیں کیا، مگر دوسری رات وہ پھر میری حویلی میں تھی۔ یہ سلسلہ چلتا رہا، یہاں تک کہ ایک روز مجھے معلوم ہوا۔ رضیہ ماں بننے والی ہے۔

کچھ دن بعد ہمزاد نے مجھ سے کہا۔ "ضروری تو نہیں یہی شہر ہو۔ یہاں رضیہ کی نظر آپ پر پڑ سکتی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا، "تم کسی بھی شہر سے چاند کے ٹکڑے لا سکتے ہو۔ میں بہر حال تنہا نہیں رہ سکتا۔"

اسی رات ہمزاد، میرٹھ کے نواب صاحب کی لڑکی کو اٹھا لایا۔ اس کی عمر بہ مشکل تیرہ سال تھی۔ وہ مجھے رضیہ سے بھی زیادہ پسند آئی اس لیے میں نے اس کے احتجاج کی بھی پروا نہ

کی۔ صبح اسے میرٹھ بھیج کر میں نے ہمزاد سے اس کی کیفیت منگائی۔ اس لڑکی نے اپنے گھر پہنچ کر ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا۔ لڑکی کو حکیموں نے دیکھا اور اس کے بیان کی تصدیق کر دی۔ پھر عاملوں کو طلب کیا گیا کیوں کہ واقعہ پُراسرار تھا کہ بند دروازوں سے لڑکی کس طرح اٹھا لی گئی اور پھر کیسے اسے واپس پہنچا دیا گیا؟ عاملوں نے اس لڑکی کے گرد حصار کھینچ دیا۔ دوسری رات ہمزاد خالی ہاتھ واپس آیا تو میں اس لڑکی نرگس کے لیے بہت مضطرب تھا۔ ہمزاد نے بتایا کہ نرگس حصار میں ہے جس سے اسے نہیں نکالا جا سکتا۔ میں بہت تڑپا، مگر مجبوری تھی۔

صبح ہوئی تو پھر میں نے ہمزاد کو میرٹھ بھیجا تاکہ تازہ حالات سے آگاہ رہوں۔ نواب صاحب کے طبیب خاص اور عاملوں نے صبح ہوتے ہی نرگس سے پوچھا۔ "رات تو کوئی نہیں آیا۔"

"ہاں وہ آیا تھا۔" نرگس نے جواب دیا۔ "مگر حصار کے باہر ہی سے اشارے کر کے مجھے بلا رہا تھا۔ وہ قریب نہیں آیا اور میں ہدایت کے مطابق حصار سے نہیں نکلی۔"

نواب صاحب یہ سن کر چراغ پا ہو گئے اور بولے۔ نرگس کو آخر کب تک اس طرح حصار میں بٹھا کر رکھا جائے گا؟"

طبیب خاص نے انہیں نرمی سے سمجھایا۔ "حضور والا! عاملوں کا کہنا یہ ہے کہ وہ بھی کوئی عامل ہے جو گناہ کے راستے پر پڑ گیا ہے۔ وہ نرگس کو اپنے ہمزاد کے ذریعے اٹھوا لیتا ہے۔ سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ ہے کہاں؟ مگر یہ جاننے کے لیے نرگس کو پھر ایک بار اس کے پاس جانا پڑے گا۔"

یہ سن کر نواب صاحب پہلے تو بہت خفا ہوئے، مگر پھر راضی ہو گئے۔ نرگس کی اطراف سے عاملوں کا کھینچا ہوا حصار اٹھوا لیا گیا۔ طبیب نے نرگس سے تخلیے میں بات کی اور بہت دیر تک کچھ سمجھاتا رہا۔ میں اس بات سے بے خبر ہی رہا کہ یہ جال مجھے پھانسنے کے لیے بچھایا جا رہا تھا۔ عشق میں عقل گم ہو جاتی ہے اور یہی معاملہ میرے ساتھ تھا ورنہ نرگس کو مزید طلب نہ کرتا۔

میں نے جب سنا کہ نرگس حصار میں نہیں تو اسی رات سے بلوا لیا۔ اس نے جانے کیسے میرے شیطان کو برداشت کیا! بہر حال صبح پاک ہو کر جب میں اسے رخصت کرنے والا تھا اس نے مجھ سے ایک خواہش کا اظہار کیا۔ "اے شہزادے! مجھے اپنی دنیا کی کوئی عمدہ چیز کھلاؤ۔"

نرگس کو بھی میں نے وہی کہانی سنائی تھی جو پہلے رضیہ کو سنا چکا تھا اس لیے اس نے مجھے شہزادے کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

بدایوں میں ظاہر ہے پیڑوں سے عمدہ کیا چیز ہو سکتی تھی۔ وہاں کے سے پیڑے سارے ہندوستان میں نہیں بنتے تھے۔ میں نے ہمزاد سے فوراً پیڑے منگوائے جو کچھ اس نے کھائے اور کچھ مجھے کھلائے۔ اس کے بعد وہ بولی۔ "اب مجھے میرے گھر پہنچا دو۔" آج اس کا رویہ بالکل بدلا ہوا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ شاید اب وہ راہ پر آ گئی ہے، مگر بعد میں یہ خوش فہمی ہی ثابت ہوئی۔

پھر ہمزاد اسے لے گیا اور میں سو گیا۔ دوپہر کو میں سو کر اٹھا تو ہمزاد نے مجھے عجیب اطلاعات دیں۔ نرگس کے گھر پہنچتے ہی طبیب خاص اس سے ملنے آیا اور کچھ طلب کیا۔ نرگس نے مٹھی کھول دی۔ اس کے ہاتھ میں پیڑا تھا۔ اس وقت وہاں نواب صاحب بھی موجود تھے۔ حکیم نے فوراً کہا۔ "وہ شخص بدایوں میں ہے۔"

نواب صاحب نے یہ سنتے ہی اپنے چند عاملوں اور خاص آدمیوں کو بدایوں روانہ کر دیا کہ وہاں جا کر سراغ لگائیں، کیا وہاں کوئی عامل ہے؟

میں یہ جان کر متفکر ہو گیا، مگر اس کے باوجود مجھے اپنی قوت کا اتنا نشہ تھا کہ محتاط رویہ اختیار نہیں کیا۔ شاید مجھے کچھ زیادہ ہی گھمنڈ ہو گیا تھا کہ میرے قبضے میں بہت بڑی طاقت ہے جسے کسی طرح زیر نہیں کیا جا سکتا۔ میں جب چاہوں ہر کام کر سکتا ہوں۔

وہ لوگ اسی دن بدایوں پہنچ گئے اور انہیں بہت جلد میرے بارے میں معلوم ہو گیا۔ وہ یہ اطلاعات لے کر میرٹھ واپس ہو گئے۔ نواب صاحب نے فوراً اعلیٰ افسران سے رجوع کیا کہ مجھے حراست میں لے لیا جائے مگر بدایوں میرا وطن تھا جہاں ہر شخص مجھ سے مرعوب اور میرا معتقد تھا۔ شہر کوتوال اور پولیس کے بڑے بڑے ہندوستانی اور انگیز افسران مجھ سے اتنے متاثر تھے کہ انہوں نے دارالحکومت کو لکھ دیا۔ "ہم نے پوری تحقیق کر لی ہے کہ شیخ کرامت کے بارے میں دارالحکومت کو غلط اطلاعات دی گئی ہیں۔ وہ شہر کے معززین میں سے ہے۔" وغیرہ وغیرہ۔ جب نواب صاحب کو معلوم ہوا تو وہ بہت بگڑے کہ میرا کچھ نہیں بگڑا۔ ان کے تعلقات بہت وسیع تھے۔ انہوں نے اس مرتبہ حکومت کے بڑے بڑے لوگوں پر دباؤ ڈالا کہ کسی طرح مجھے گرفتار کر لیا جائے۔ اس کے بعد پھر دارالحکومت سے بدایوں کے افسران کو تاکید کی گئی کہ ہم خود معاملے کی تحقیق کے لیے ایک کمیشن بھیج رہے ہیں اس لیے کہ یہ معاملہ میرٹھ کے نواب صاحب کا ہے جنہیں انگریزی سرکار بہرحال خوش رکھنا چاہتی ہے۔ یہ کمیشن بدایوں پہنچ کر تحقیقات کرے گا۔ اس کے ساتھ ہر ممکن تعاون کیا جائے۔

ادھر نواب صاحب نے عاملوں سے بھی مشورہ کیا۔ جنہوں نے بتایا کہ میرے پاس یقیناً

ہمزاد کی قوت ہے جسے زیر کرنا ان کے بس میں نہیں اور نہ ہی کوئی کسی ایسے شخص کا کچھ بگاڑ سکتا ہے جس کے قبضے میں ہمزاد ہو اس لیے کہ ہمزاد سینکڑوں ہزاروں افراد پر بھاری ہے۔ ہاں ایک صورت ممکن ہے کہ اس شخص کو کسی طرح ناپاک ہونے کی حالت میں قتل کر دیا جائے اس لیے کہ اس حالت میں وہ ہمزاد سے مدد حاصل نہیں کر سکے گا۔

نواب صاحب کو یہ تجویز پسند آئی۔ انہوں نے اسی وقت اپنے پروردہ غنڈوں کو طلب کیا اور ان کے سپرد یہ کام کیا کہ بدایوں جا کر مجھے قتل کر دیں، لیکن اس وقت جب میں ناپاک ہوں۔ وہ غنڈے تعداد میں پندرہ بیس تھے۔ طے یہ ہوا کہ صبح یہ سب چند عاملوں کے ہمراہ بدایوں روانہ ہو جائیں گے اور کل رات ہی مجھے قتل کر دیا جائے گا۔

میں نواب صاحب کے گنڈوں کا منتظر تھا کہ وہ کب آئیں اور میں انہیں مزہ چکھاؤں، لیکن اس سے پہلے حکومت کا بھیجا ہوا کمیشن بدایوں پہنچ گیا۔ اس کمیشن کا سربراہ جان ولیم عام انگریزوں کی طرح توہم پرست نہیں تھا۔ اس نے آتے ہیں میری گرفتاری کے احکام جاری کر دیے۔ میں نے ہمزاد کے ذریعے اس کمیشن اور اس کے ارکان کے بارے میں پوری معلومات حاصل کر لیں تھیں۔ شہر کے تقریباً تمام اعلیٰ حکام یا تو میرے مرید تھے یا معتقد نتیجہ یہ کہ جان ولیم تو میری جان کا دشمن، مگر کوتوال شہر اور ایس پی میرے ہم نوا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ جان ولیم میرا غصہ ان پر اتارے اور انہیں کچھ نقصان پہنچا دے اس لیے بے چون و چرا کوتوالی پہنچ گیا۔ وہاں میں جان ولیم کی موجودگی تک حوالات میں رہا اور اس کے جاتے ہی کوتوال کے کمرے میں آ گیا۔ ہم سب نے دوپہر کا کھانا ساتھ کھایا۔ اسی وقت مجھے ایک شرارت سوجھی اور میں نے ہمزاد کو حکم دیا کہ جان ولیم اور اس کے ساتھی پیٹر پر کھانا اور نیند حرام کر دی جائے۔ یہی ہوا بھی۔ جان ولیم اور پیٹر دونوں، ہمزاد کی چیرہ دستیوں کا نشانہ بنے۔ جب بھی ان کے سامنے کھانا چنا گیا، ہمزاد نے پلیٹیں ان کے کپڑوں پر الٹ دیں۔ شام کو جان ولیم بھوکا پیاسا کوتوالی آیا۔ تو ایس پی کو بتا چکا تھا کہ اقبال جرم کرانے کے لیے مجھ پر تشدد کرے گا۔ اس نے آتے ہی ننگے ہونٹ چمڑے کے کوڑے لانے کا حکم دیا اور مجھے کوتوالی کے صحن میں نیم کے درخت سے بندھوا دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر کوڑے برساتا، کوڑے خود اس پر اور اس کے ساتھی پیٹر پر برسنے لگے۔ یہ صرف میں ہی دیکھ سکتا تھا کہ انہیں کوڑے مارنے والا ہمزاد ہے۔ آخر کار وہ دونوں کوڑوں کی مار سے بچنے کے لیے کوتوالی سے بھاگ نکلے۔ میں نے وہ رات کوتوالی میں گزاری۔ جیسا کہ میں نے ہمزاد کو حکم دیا تھا کہ ولیم اور پیٹر پر نیند بھی حرام کر دی جائے، ہمزاد نے اس پر بھی عمل کیا، مگر بڑے دلچسپ انداز میں۔ ہمزاد رات بھر انہیں طرح طرح سے تنگ

کرتا رہا اور یہ واقعہ خود ایس پی نے بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا جو صبح آ کر اس نے کوتوال کو بھی سنایا۔

آج ولیم کے نام دارالحکومت سے ایک خط بھی آیا تھا۔ اسے سختی سے تاکید کی گئی تھی کہ مجھے بلاتاخیر گرفتار کر کے جیل بھی دیا جائے۔ ولیم کوتوالی پہنچا تو فوراً" یہ خط اسے دے دیا گیا۔ مجھے پھر حوالات میں جانا پڑا اس لیے نہ تو میں وہ خط دیکھ سکتا تھا اور نہ یہ کہ ولیم اس وقت کیا لکھ رہا تھا۔ سب کچھ مجھے ہمزاد نے بتایا۔ غالباً" جان ولیم مجھے جیل بھیجنے کا آرڈر لکھنا چاہتا تھا' مگر ہمزاد نے اس کا قلم پکڑ لیا۔ پھر اسی صبح لوگوں نے دیکھا کہ میری پراسرار قوتوں کے سامنے جان ولیم ایسے باختیار' خود سر اور ضدّی شخص نے سپر ڈال دی۔ مجھے خود جان ولیم کے حکم پر رہا کر دیا گیا۔

جب رات ہوئی تو میرا شیطان پھر جاگ اٹھا کیونکہ گذشتہ شب خالی گزری تھی۔ ہمزاد نے میری حیوانی جبلّت کا سامان فراہم کر دیا۔ پھر صبح قریب تھی کہ میرے دروازے پر موت نے دستک دی۔

میں جھنجلا گیا۔ اس وقت میرے ذہن میں دور دور تک یہ خیال نہ تھا کہ اس شہر میں میرے کچھ اور دشمن بھی پہنچ چکے ہیں جو میری جان کے درپے ہیں اور انہیں میرے قتل کا حکم دیا گیا ہے۔ میں غصے میں اٹھا اور جا کر دروازہ کھول دیا۔ وہاں میں نے واقعی اپنی موت کو منتظر پایا۔ نواب صاحب کے بھیجے ہوئے غنڈے میری طرف لپکے۔ میں نے ہمزاد کو پکارا مگر بے سود۔ میں اس وقت پاک نہیں تھا۔ اور مجھے یہ احساس ہو گیا تھا۔ یہ خیال ذہن میں آتے میں آنگن میں رکھی گھڑونچی کی طرف بھاگا' لیکن غنڈے پہلے ہی سے ہوشیار تھے۔ انہوں نے تمام گھڑے توڑ کر پانی بہا دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ فیصلہ کرتا۔ ان میں سے ایک نے مجھ پر حملہ کر دیا مگر میں گرتے گرتے سنبھلا اور ایک ٹوٹے ہوئے گڑھے کا پانی اپنے سر پر ڈال لیا' پانی اتنا کم تھا کہ بہ مشکل میرے سر' چہرے اور گردن ہی کو بھگو سکا۔ اسی وقت کسی کی تلوار کام کر گئی۔ میرا سر کٹ کر زمین پر گرا اور گرتے ہی فضا میں بلند ہوتا چلا گیا۔ میرا کٹا سر جو پاک ہو چکا تھا' ہمزاد نے شہر سے دور ایک ویران خانقاہ میں پہنچا دیا۔ یہ جان کر مجھے سخت حیرت ہوئی کہ میں اب بھی زندہ تھا۔ ہمزاد نے بتایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے اپنے جسم لطیف' یعنی ہمزاد کو قبضے میں کر رکھا ہے۔ جب تک جسم لطیف میں زندگی ہے' مادی جسم بھی نہیں مر سکتا' مگر اب میرا بقیہ جسم چھن جانے کی وجہ سے ہمزاد بھی بے بس ہو گیا تھا۔ اس کی بہت سی قوتیں وقتی طور پر مفلوج ہو گئی تھیں۔ ہمزاد نے مجھے بتایا کہ اس کی یہ قوتیں اس وقت تک واپس نہیں مل

سکتیں جب تک میں کوئی اور جسم حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ ہمزاد کی رائے یہ تھی کہ اب تک جن لڑکیوں سے میرے تعلقات رہے ہیں ان میں رضیہ مجھ سے سچی محبت کرتی ہے۔ رضیہ نے اسی لیے شادی سے بھی انکار کر دیا تھا اور میرے بچے کو پال رہی تھی کہ نواب صاحب کے غنڈوں نے میرے جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔ ہمزاد کی اطلاع کے مطابق رضیہ 'اختر نامی جس لڑکے سے منسوب تھی' ہمزاد کا خیال تھا کہ رضیہ اس سلسلے میں میری مدد کر سکتی ہے نیا جسم حاصل کرنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ نواب صاحب کے غنڈوں نے میرے جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔ ہمزاد کی اطلاع کے مطابق رضیہ 'اختر نامی جس لڑکے سے منسوب تھی' وہ اب بھی رضیہ کی چشم عنایت کا طلب گار تھا اور اس نے بھی شادی نہیں کی تھی۔ ہمزاد کا خیال تھا کہ اگر رضیہ 'اختر کے قتل پر آمادہ ہو جائے تو اختر کے جسم کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہ کام بہت کٹھن تھا مگر اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔

ہمزاد جب پہلی رات مجھے خانقاہ سے رضیہ کی حویلی میں لے گیا تو وہ میرا کٹا ہوا سر دیکھتے ہی چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی' لیکن پھر میں تیسری رات رضیہ سے اظہار مدعا بیان کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے اسے ایک اور کہانی سنائی۔ میں بغیر جسم کے بھی زندہ ہوں' یہ عجیب و غریب اور ناقابل یقین منظر دیکھ کر اور کچھ میری محبت سے مجبور ہو کر وہ اس خطرناک کام پر آمادہ ہو گئی۔ وہاں سے لوٹتے ہوئے میں بہت خوش تھا کہ ایک بار پھر زندگی کی نعمتوں سے مالا مال ہو جاؤں گا۔

مجھے کچھ یہ احساس بھی تھا کہ رضیہ بہرحال ایک عورت ہے' کہیں ڈر نہ جائے اور اپنا فیصلہ بدل نہ دے۔ میں اسی لیے ہر شب اس سے ملتا رہا۔ ایک شب رضیہ سے طویل گفتگو کے سبب مجھے واپسی میں دیر ہو گئی۔ ہمزاد نے مجھے کئی بار مشورہ دیا تھا کہ صبح قریب ہے' نکل چلیں' مگر دیر ہو گئی۔ واپسی میں خانقاہ کی طرف لوٹتے ہوئے بستی کے لوگوں نے میرے سر کو فضا میں پرواز کرتے ہوئے دیکھ لیا۔ شہر میں کھلبلی مچ گئی۔ ہمزاد یہ صورت حال دیکھ کر میرے سر کو ناقابل قیاس بلندیوں تک لے گیا اور میں جلد ہی لوگوں کی نظروں میں اوجھل ہو گیا جو آسمان کی طرف منہ اٹھائے تصویر حیرت بنے ہوئے تھے۔ اس اچانک ذہنی جھٹکے نے میرے حواس کو معطل کر دیا۔ اتنی اونچی پرواز میں نے کبھی نہیں کی تھی۔ میں بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آیا تو میں نے خود کو اپنے عارضی مسکن خانقہ میں پایا۔ ہمزاد نے مجھے بتایا کہ لوگوں نے مجھے شناخت کر لیا ہے اور اب شہر بھر میں میرا ہی چرچا ہے۔ میرے معتقدین خوش ہیں اور دشمن ہراساں۔ میں سخت پریشان ہو گیا کیوں کہ ان حالات میں رضیہ پر بھی یہ راز فاش ہو سکتا تھا میں شیخ کرامت ہوں نہ کہ کسی دوسری دنیا کا باسی۔ کیے کرائے پر پانی پھرنے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔

میں نے فیصلہ کیا کہ رضیہ سے اب میری بجائے ہمزاد ملے' اسے بھٹکنے نہ دے اور اختر کے قتل میں مدد کرے۔ پھر ہمزاد میرے ہی حکم پر رضیہ کے پاس چلا گیا۔ ہمزاد سے جدائی کے سبب حالات سے میرا باخبر رہنا ممکن نہیں تھا۔ ہمزاد نے یہ مشکل بھی آسان کردی اور مجھے ایک ایسی پُراسرار قوت بخش دی کہ جس کی مدد سے میں میلوں دور رہ کر بھی سب کچھ دیکھ اور سن سکتا تھا' اس کے علاوہ ہمزاد سے بھی ہم کلام ہو سکتا تھا۔

ہمزاد' رضیہ کے پاس پہنچا تو وہ اسے شیخ کرامت ہی سمجھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ مجھی سے مخاطب ہے۔ ہمزاد کے وجود سے وہ قطعی لاعلم تھی۔ میں جب چاہتا ہمزاد سے بات کرلیتا۔ ہمزاد مجھے جواب دیتا [illegible] رضیہ نہ سن پاتی۔ میرے عشق میں گرفتار ہو کر رضیہ جن اذیت ناک حالات کا شکار تھی' یہ اندازہ مجھے اب ہوا۔ رضیہ کے گھر والے کنوارپنے ہی میں اس کے ماں بن جانے پر اس سے شدید نفرت کرتے تھے کیوں کہ وہ کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہے تھے۔ ہمزاد اسے تسلیاں دیتا رہا کہ اختر کا جسم ملتے ہی میں اسے اپنی دنیا میں لے جاؤں گا۔ رضیہ کا منگیتر اختر پڑوس ہی میں رہتا تھا۔ اب ان دونوں کو ملانے کا مسئلہ تھا۔ دونوں گھرانوں میں سخت ناچاقی ہو چکی تھی لیکن اس مسئلے کو خود رضیہ نے حل کر دیا۔ رضیہ نے حویلی کے پچھواڑے والے باغ میں اختر سے ملنا شروع کر دیا۔ وہ ہر شب اختر سے جھوٹا عشق جتاتی۔ ہر چند کہ یہ ڈراما میرے ہی اشاروں پر کھیلا جا رہا تھا مگر اختر اور رضیہ کو ساتھ دیکھ کر مجھے شک ہوتا کہ رضیہ اپنے وعدنے سے پھر نہ جائے۔ ایک رات رضیہ کی ماں نے ان دونوں کو اکٹھے دیکھ لیا اور خوش ہو گئی۔ اس نے دونوں خاندانوں کے دوبارہ ملاپ کے لیے راہ ہموار کی اور رضیہ کی شادی اختر سے طے کردی۔ پانی اب سر سے اونچا ہو رہا تھا اور اختر کا فوری قتل ضروری ہو گیا تھا۔ ہمزاد نے رضیہ کو قتل پر اکسانا شروع کر دیا۔ پھر رضیہ کو اس نے ایک پھول دیا کہ ملاقات کے دوران میں وہ اس پھول کو سنگھا دے جب اختر بے ہوش ہو جائے تو پھر اس کی گردن پر خنجر پھیر دے۔ لمحہ لمحہ گنتے آخر وہ رات بھی آ گئی۔ ہمزاد مجھے بھی وہاں لے گیا تاکہ دوسرا جسم مل جائے۔ اب میں بہ ذات خود اس غار میں موجود تھا جسے اب تک اپنی چشم تصور کی قوت سے دیکھتا رہا تھا۔ ہمزاد نے میرا سر' ایک پیڑ کی دو شاخوں کے درمیان رکھ دیا تھا۔ برابر ہی وہ کنج تھا جس میں رضیہ اور اختر مصروف راز و نیاز تھے۔

جب دیر ہو گئی تو ہمزاد نے رضیہ کو مخاطب کیا۔ "رضیہ اور وقت مت ضائع کو! اسے زیادہ باتوں میں نہ الجھاؤ۔" ہمزاد کی آواز صرف میں اور رضیہ ہی سن سکتی تھی۔

رضیہ نے فوراً ہی اختر کو ہمزاد کا دیا ہوا پھول سنگھا دیا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔

فوراً ہی رضیہ کے ہاتھ میں خنجر نظر آیا' جسے اس نے اختر کی گردن پر رکھ کر تیزی سے پھیرنا شروع کر دیا۔

پھر جیسے ہی اختر کا سر کٹ کر گرا' ہمزاد نے میرا سر' شاخوں کے درمیان سے اٹھایا اور نیچے کنج کی طرف بڑھنے لگا۔ میرا کٹا ہوا سر دیکھ کر رضیہ کی چیخ نکل گئی۔ اب وہ بالکل پاگلوں کی طرح چیخ رہی تھی۔ اسی لمحے ایک جھٹکے کے ساتھ میرا کٹا ہوا سر' اختر کی گردن سے مل گیا۔ اسی وقت تیز تیز سیٹیاں بجنے اور دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ وقت ضائع کیے بغیر ہمزاد نے مجھے اٹھایا اور فضا میں بلند ہوتا چلا گیا رضیہ چیختی ہی رہ گئی۔

فضا میں بلند ہوتے ہی میں نے پولیس والوں کو دیکھ لیا تھا۔ ہمزاد مجھے لے کر پھر اسی قدیم ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر ہمزاد نے مجھے سلا دیا۔ میں جاگا تو رضیہ کا خیال آیا۔ میں نے ہمزاد کی عطا کردہ قوت کی مدد سے اسے تلاش کر لیا۔ میری چشم تصور نے اسے حوالات میں دیکھا اور میں سب کچھ سمجھ گیا۔ رضیہ اختر کے قتل میں ماخوذ تھی۔ حالات جاننے کے لیے میری تصور کی قوت بدایوں کے گلی کوچوں میں بھٹکتی رہی۔ لوگوں کی گفتگو سن کر مجھے معلوم ہوا کہ جس رات اختر کا قتل ہوا' اس کا دوست عابد بھی ایک قریبی کنج میں موجود تھا جو اپنے دوست کی محبوبہ کو دیکھنا چاہتا تھا اور اس میں خود اختر کی مرضی بھی شامل تھی۔ حالات اتنی تیزی سے پیش آئے کہ عابد اپنے دوست کو قتل ہونے سے نہ بچا سکا۔ لیکن اس نے فوراً پولیس کو مطلع کر دیا۔ رضیہ کی چیخیں سن کر اس کے اور اختر کے گھر والے بھی پولیس کے ساتھ ہی باغ میں پہنچ گئے جہاں انہیں صرف اختر کا کٹا ہوا سر ہی مل سکا۔ رضیہ نے حالات سے گھبرا کر پولیس کو میرے بارے میں وہ سب کچھ بتا دیا جو میں نے اسے اپنے متعلق بتایا تھا اور یہ بھی بتا دیا کہ میں نے اسے کس طرح قتل پر آمادہ کیا! پولیس کے لیے یہ واقعہ حیرت انگیز تھا اور شہر والے بھی گومگو کے عالم میں تھے۔ میری حالت یہ تھی کہ مجھے اختر کے جسم سے مکمل رابطہ قائم کرنے کے لیے اکیس دن کی ضرورت تھی۔ ان اکیس دن سے پہلے میں اور ہمزاد رضیہ کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ جس دن رضیہ عدالت میں پیش ہوئی میں سترہ دن پورے کر چکا تھا۔ قتل کا عینی شاہد عابد موجود تھا اور دوسرے لوگ بھی جنھوں نے بعد میں رضیہ کے ہاتھ میں خون آلود خنجر دیکھا تھا۔ ان حالات میں رضیہ کو پھانسی کی سزا کا حکم ہو جانے میں کوئی کسر نہ تھی۔ میں' رضیہ کے مقدمے کی ساری کارروائی دیکھ اور سن رہا تھا' اس وقت میرے بس میں صرف یہی تھا۔ آخر کارروائی ختم ہوئی۔ آئندہ تاریخ فیصلے کی تھی۔ تاریخ آئندہ ہفتے کی پڑی اور میں خوش ہو گیا۔ بقیہ چار دن سخت عذاب اور انتظار میں گزرے۔ پوری طرح صحت یاب ہونے کے بعد اب

میرے لیے یہ مسئلہ تھا کہ میں' بدایوں میں کس طرح رہوں؟ ہمزاد کے مشورے پر میں نے جلد ہی اپنے وطن کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا' لیکن رضیہ کی رہائی سے پہلے میں ایسا نہیں چاہتا تھا۔

جس دن رضیہ کے مقدمے کا فیصلہ سنایا جانے والا تھا' ہمزاد میرے حکم پر صبح ہی کچہری پہنچ گیا۔ عدالت بھری ہوئی تھی۔ ہر شخص فیصلہ سننے کا منتظر تھا۔ جج نے قلم اٹھایا۔ میں اپنی چشم تصور سے خانقاہ میں آنکھیں بند کیے یہ سب دیکھتا رہا۔ اچانک مجھے جج کی کرسی کے پیچھے ہمزاد نظر آیا۔ میں سمجھ گیا کہ اب کیا ہونے والا ہے! جج پر ہمزاد پوری طرح مسلط ہو چکا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا اور پھر خود اپنے لکھے کو حیرت سے دیکھنے لگا۔ ہمزاد نے اس کی حیرت پر قابو پاتے ہوئے اسے فیصلہ سنانے پر مجبور کر دیا۔ جج کی آواز قطعی سپاٹ اور بے تاثر تھی۔ اس نے رضیہ کو باعزت طور پر رہا کر دیا تھا اور دلیل یہ دی کہ رضیہ کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں ہے جو اس کے عجیب بیان سے ظاہر ہے اور اختر کا قتل بھی اسی کا نتیجہ تھا۔

فیصلہ مختصر ہونے کے باوجود جامع تھا۔ رضیہ بچ گئی۔ بدایوں میں وہ میری آخری رات تھی جو میں نے رضیہ کی حویلی میں گزاری۔ میں نے رضیہ کو یقین دلا دیا تھا کہ چند دن کے لیے اپنی دنیا میں واپس جانے پر مجبور ہوں' چند دن بعد آ کر اسے ہمیشہ کے لیے اپنی دنیا میں لے جاؤں گا۔

صبح سے پہلے میں خانقاہ لوٹ آیا اور غسل کر کے میرٹھ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ روانگی کے وقت ہمزاد نے مجھے احتیاطاً" بے ہوش کر دیا تاکہ اونچی پرواز کے وقت میرے حواس پر برا اثر نہ پڑے۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک کنویں کی مینڈیر پر لیٹے ہوئے پایا۔ یہ میرٹھ کا ایک قریبی گاؤں تھا جہاں سے مجھے میرٹھ پہنچنا تھا۔ فضا میں پرواز کرتے ہوئے ہمزاد نے مجھے کچھ فاصلے ہی پر اتار دیا تھا۔ چند منٹ بعد ہی ہم شہر میں داخل ہو گئے۔ وہ رات میں نے ایک سرائے میں بسر کی۔ صبح ہوتے ہی ہمزاد نے میری جیبیں روپوں سے بھر دیں تاکہ قیام کا مسئلہ حل ہو جائے۔ میں نے بیگم پل کے علاقے میں ایک مکان خرید لیا۔ نواب صاحب کی کوٹھی بھی اسی علاقے میں تھی اور میرے مکان سے اس کا فاصلہ زیادہ نہ تھا۔ اسی دن ہمزاد نے مکان کو اعلیٰ درجے کے سامان سے آراستہ کر دیا۔ میں نے مصلحتاً اپنا نام وہاں رشید یار جنگ ظاہر کیا تھا۔ پڑوسیوں پر میرا یہی تاثر قائم ہوا تھا کہ میرا تعلق نوابین کے خاندان سے ہے۔ ان کاموں سے فارغ ہو کر مجھے نواب صاحب کا خیال آیا۔ انھی سے انتقام لینے کی خاطر میں نے میرٹھ کا رخ کیا تھا ورنہ کہیں بھی چلا جاتا۔ ان کی خبر لینے میں نے ہمزاد کو روانہ کیا اور اپنے تصور کی قوت سے اسے دیکھتا رہا۔ ہمزاد ایک بڑی سی حویلی میں داخل ہو گیا جس کی شان و

شوکت میری بدایوں والی حویلی سے کم نہیں تھی۔ پھر وہ ایک بڑے کمرے میں پہنچا جہاں میز پر ایک ضعیف شخص اور ایک نوجوان لڑکا شراب پینے میں مصروف تھا۔ ہمزاد سے مجھے معلوم ہوا کہ یہی ضعیف شخص میرٹھ کا نواب ہے اور یہ لڑکا اس کا منظور نظر ہے۔ ہمزاد نے کام دکھایا۔ ایک مرتبہ جب وہ لڑکا شراب کا گلاس نواب صاحب کے ہونٹوں کی طرف بڑھا رہا تھا تو ایک دم اس نے ساری شراب ہی نواب صاحب کے منہ پر پھینک دی۔ نواب صاحب' لڑکے پر سخت برہم ہو کر اٹھ کر کھڑے ہوئے حالانکہ یہ کارنامہ ہمزاد کا تھا۔ نواب صاحب کھڑے ہوئے تو ہمزاد نے اس کے پیروں کے نیچے بچھا ہوا قالین کھینچ لیا۔ وہ چیختے ہوئے منہ کے بل گر پڑے۔ پورا گھر وہاں جمع ہو گیا۔ نرگس کو بھی اتنے دن بعد دیکھ کر مجھے مسرت ہوئی۔ نواب صاحب کا منظور نظر اس ہنگامے میں غائب ہو گیا۔ نواب صاحب زخمی ہو گئے۔ اب میں نے ہمزاد کو واپس بلا لیا اور اس سے نواب کے غنڈوں کے بارے میں پوچھا جنھوں نے اچانک حملہ کر کے مجھے بدایوں میں قتل کیا تھا۔ ہمزاد نے کہا کہ آپ چاہیں تو میں آج ہی رات ان سب کو قتل کر دوں گا مگر میں نے اسے روک دیا۔ میں سب کو تڑپا تڑپا کر مارنا چاہتا تھا' وہ بھی باری باری! ہمزاد نے مجھ سے کہا کہ آپ بھی ساتھ چلیں۔ آپ کو کرنا کچھ نہیں ہے مگر صرف قاتلوں کا حشر اپنی آنکھوں سے دیکھنا ہے۔ میں راضی ہو گیا۔

ہمزاد مجھے ویلی بازار کے ایک تاڑی خانے میں لے گیا۔ وہاں اس نے ایک شخص کیطرف اشارہ کر کے بتایا کہ آپ کے قاتلوں میں سے ایک یہ ہے۔ پھر اس کا جو حشر ہوا۔ وہ بہت ہول ناک تھا۔ لکڑی کے جن کندوں پر بیٹھ کر وہ لوگ تاڑی پی رہے تھے' ان میں سے کچھ خالی تھے۔ تاڑی پینے والوں نے معاً" ایک حیرت انگیز منظر دیکھا۔ لکڑی کی ایک کندی دیکھتے ہی دیکھتے فضا میں بلند ہوئی اور اس قاتل کے سر پر پڑی۔ پھر تو کندی اس وقت تک نہیں رکی جب تک قاتل کے سر کا بھرتا نہ بن گیا۔ اس بھیانک قتل نے میرے اعصاب پر بھی برا اثر ڈالا اور میں فوراً" ہی ہمزاد کو لے کر اپنی حویلی کی طرف لوٹ گیا۔ ابھی میں اپنی قیام گاہ سے کچھ دور ہی تھا کہ ایک مکان کے دروازے پر ایک برقع پوش لڑکی کو نقاب الٹے دیکھا جو کسی نوجوان کو الوداع کہہ رہی تھی۔ اس کی ایک ہی جھلک مجھے پاگل بنا گئی۔ وہ چلی گئی' مگر میں بت بنا وہیں کھڑا رہا۔ ہمزاد نے مجھے ٹوکا تو میں حواس میں آیا۔ حویلی پہنچ کر میں نے ہمزاد سے اس فتنہ قیامت کے بارے میں معلوم کیا۔ ہمزاد نے بتایا کہ وہ نواب صاحب کے طبیب خاص کی بیٹی مہ پارہ ہے۔ طبیب خاص کا میں پہلے ہی دشمن تھا' میرے قتل کی سازش میں اس کا بھی ہاتھ تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ آج رات مہ پارہ میرے پاس ہو گی۔ رات گئے ہمزاد اسے اٹھا لایا' لیکن

جیسے ہی میں اُس کے قریب گیا' وہ خود بہ خود اٹھ بیٹھی اور بولی۔ آج تک کوئی میری مرضی کے بغیر مجھے ہاتھ لگانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ تم نے میری مرضی کے خلاف مجھے اٹھوایا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں خود تمہاری مردانہ وجاہت دیکھ کر کچھ نہ کہتی' لیکن اب یہ ناممکن ہے۔"

میں نے اس کی بات کا کوئی اثر نہ لیا۔

وہ مجھے اپنی طرف دیکھ کر ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولی۔ "میں کہتی ہوں' رک جاؤ! جو شعبدے تمہیں آتے ہیں' میں بھی ان سے واقف ہوں۔" پھر بھی میں نہ رکا تو اس نے کہا۔ "ٹھیک ہے' آؤ! تمہیں میری قوت کا اندازہ ہو جائے گا۔" یہ کہہ کر خود اس نے میری طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ "تو پکڑو میرا ہاتھ!"

اب مجھے بھی اس کی دیدہ دلیری پر غصہ آ گیا اور میں نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو اپنی طرف کھینچنا چاہا۔ جیسے ہی میرا ہاتھ' اس کے ہاتھ سے مس ہوا مجھے بہت زور کا جھٹکا لگا جیسے میں نے بجلی کے ننگے تار کو چھو لیا ہو۔

وہ مجھے زمین پر گرتے دیکھ کر زور سے ہنسی۔ "بس ختم ہو گئی مردانگی! میں جا رہی ہوں' اگر روک سکتے ہو تو روکو۔" یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھی۔

اسی وقت میں زور سے چیخ اٹھا۔ "ہمزاد!..... ہمزاد!"

ہمزاد میرے حکم پر مہ پارہ کے پیچھے لپکا' لیکن جب وہ لوٹا تو اکیلا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ مہ پارہ کے پاس کچھ ایسی ناقابل فہم قوتیں ہیں جن کے بل بوتے پر اس نے کچھ دیر کے لیے مجھے بھی معطل کر دیا۔ وہ قوتیں ہمزاد کے پاس بھی نہیں تھیں۔ ان قوتوں کی تفصیل جاننے کے لیے ہمزاد کو تین دن درکار تھے۔ میری عزت نفس کو مہ پارہ نے جو ٹھیس پہنچائی تھی' اس نے مجھے اندر سے پاش پاش کر دیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہمزاد کے باوجود میں بے بس تھا۔ ستم یہ کہ اس بے عزتی کا انتقام لینا بھی فی الحال میری دسترس سے باہر تھا۔ اس وقت میری شکست خوردہ انا کوئی مشغلہ چاہتی تھی۔ اس کے لیے نواب صاحب کے ایک غنڈے کو منتخب کیا۔ وہ بھی میرے قاتلوں میں شامل تھا۔ ہمزاد کے ہمراہ میں اس کے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ غنڈے کے پاس اس وقت ایک حسین و بے باک طوائف موجود تھی۔ اس حسین طوائف کو دیکھ کر میرے اندر چھپا ہوا برا آدمی مچلنے لگا۔ غنڈے کو قتل کرنے کے بعد میں اس شانتی نامی طوائف کو اپنی حویلی میں اٹھوا لایا۔ اس کی بے باکی مجھے بہت پسند آئی۔ صبح ہوتے ہی میں نے اسے ہمزاد کے ذریعے اس کے ٹھکانے ؟ دہلی بازار میں پہنچا دیا۔ اسی صبح میں نے ہمزاد کو مہ پارہ کی پُراسرار قوتوں کے بارے میں تفصیل جاننے کے لیے تین دن کی مہلت دے دی۔ دن بھر سو کر شام

ہوتے ہی میرٹھ کے بازار حسن دہلی بازار میں پہنچ گیا۔ اپنے تصور کی قوّت سے میں نے شانتی کو تلاش کیا اور اس کے کوٹھے پر چڑھ گیا۔ میں نے شانتی کی "ماں جی" سے بات کر کے شانتی کو صرف اپنا پابند کر لیا۔ وہ رات میں نے امینہ بائی کے کوٹھے پر شانتی کے ساتھ گزاری۔

دوسرے دن جب میں رات بھر کی تھکن سے نڈھال اپنی حویلی میں سو رہا تھا تو دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے اپنے تصوّر کی قوّت کو بروئے کار لا کر معلوم کیا کہ حویلی کے دروازے پر ایک باریش شخص' پولیس کے ہمراہ موجود ہے مجھے یاد آیا کہ صبح دہلی بازار سے لوٹتے ہوئے بھی یہی باریش شخص مجھے دیکھ ٹھٹکا تھا۔ میں خطرہ محسوس کر کے حویلی کے پچھلے دروازے سے فرار ہو گیا۔ اب پھر میری منزل دہلی بازار تھی۔ میں شانتی کے پاس خود کو پولیس کی دسترس سے محفوظ رکھ سکتا تھا۔ وہاں پہنچ کر میں نے اپنی پُراسرار قوتوں کے ذریعے یہ معلوم کر لیا کہ وہ باریش شخص' نواب صاحب کے انہی عاملوں میں سے تھا جو مجھے بدایوں میں دیکھ چکے تھے۔ مجھ پر سب کچھ روشن ہو گیا۔ میں نے اپنے تصوّر اور قوّت سماعت سے نواب صاحب' طبیب خاص اور عاملوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سن لی تھی۔ دراصل جب نواب صاحب کو اپنے باریش عامل سے یہ معلوم ہوا کہ میں زندہ ہوں تو انہوں نے پولیس حکام سے رجوع کر کے مجھے گرفتار کرانا چاہا' مگر میں خوش قسمتی سے بچ نکلا۔ ہمزاد کے لوٹنے میں ابھی دو دن باقی تھے اس سے پہلے میں' نواب صاحب کے عاملوں کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکتا تھا۔

یہ تین دن مجھے تین صدیاں محسوس ہوئے تھے اور ہمزاد لوٹ آیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ گزشتہ رات ہی واپس آ چکا تھا۔ صبح ہونے تک وہ میرے تمام دشمنوں کو ٹھکانے لگاتا رہا تھا۔ اب ان میں سے کوئی زندہ نہیں تھا۔ مجھے اب نرگس کے سوا میرٹھ میں کوئی پہچاننے والا نہیں تھا جس سے فی الحال مجھے کوئی خطرہ نہ تھا۔ میں ہمزاد کے ساتھ شانتی کے کوٹھے سے اپنی حویلی میں آ گیا۔ میں' مہ پارہ کی پُراسرار قوّت کے بارے میں سب کچھ جاننے کے لیے بے چین تھا۔ ہمزاد سے یہ سن کر میرا خون کھول اٹھا کہ مہ پارہ سے ٹکر نہ لی جائے تو بہتر ہے۔ ہمزاد کا کہنا تھا کہ یہ میری اور اس کی سلامتی کے لیے بے حد ضروری ہے۔ لڑکیاں اور بھی مل سکتی تھیں مگر یہ مسئلہ میری عزت نفس کا تھا۔ ذلیل اور بزدل بن کر زندہ رہنے سے میرے نزدیک مر جانا کہیں بہتر تھا۔ میں نے ہمزاد کے مشورے کو رد کر دیا اور اس سے وہ تفصیلات معلوم کیں جو اب تک اس نے حاصل کی تھیں۔

پھر ہمزاد نے مجھے جو کچھ بتایا' وہ پُراسرار اور عجیب ہونے کے علاوہ تشویش ناک بھی تھا کہ بظاہر معمولی سی لڑکی نظر آنے والی مہ پارہ میں اتنی پُراسرار قوتیں موجود ہیں۔ ہمزاد سے مجھ

جو کچھ معلوم ہوا وہ یہ تھا۔

میرٹھ کے نواب صاحب کے طبیب خاص کا نام ارشاد احمد خان ہے اور اسی کی بیٹی مہ پارہ تھی۔ ایام جوانی میں ارشاد احمد خان نے بڑے نواب کے ساتھ افریقہ کا سفر کیا تھا۔ اسی سفر کے دوان میں اس نے ایک افریقی ساحرہ سے شادی کرلی تمی اور اسے ہندوستان لے آیا تھا۔ مہ پارہ جوان ہوئی تو اس کی ساحرہ ماں مرگئی' مگر اپنی موت سے پہلے اپنی تمام پُراسرار قوتیں مہ پارہ کو سونپ گئی جن کے بل بوتے پر مہ پارہ ہمیشہ جوان بھی رہ سکتی تھی۔ ان قوتوں کو برقرار رکھنے کی خاطر مہ پارہ کو ہر سال چند مخصوص راتوں میں کچھ عمل کرنا پڑتا تھا۔ اب اس عمل میں صرف سات دن باقی رہ گئے تھے۔ ہمزاد کا کہنا تھا کہ اگر کسی طرح وہ عمل کے دوران میں مہ پارہ کی توجہ ہٹانے میں کامیاب ہو گیا تو اس پر قابو پانا ممکن ہو جائے گا۔ اسی عرصے میں مہ پارہ نے اپنی پراسرار قوت کے ذریعے تنبیہہ کی تھی کہ میں اس سے ٹکرانے کی کوشش نہ کروں اور خیریت چاہتا ہوں تو یہ شہر چھوڑ کر چلا جاؤں۔ مہ پارہ کوئی باکردار لڑکی نہیں تھی' مگر اسے مجھ سے چڑ سی ہو گئی تھی۔ وہ کسی قیمت پر میرے سامنے جھکنے پر آمادہ نہ تھی بلکہ اب تو وہ مجھے شہر چھوڑنے کی دھمکی دے رہی تھی۔ میں اسے نیچا دکھانے کے درپے تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہمزاد کی تاکید کے باوجود میں اس خطرناک' پُراسرار لڑکی سے ٹکر لینا چاہتا تھا۔ ہمزاد نے مجھے یقین دلایا کہ وہ پوری کوشش کرے گا کہ مہ پارہ اپنا عمل پورا نہ کر سکے۔ ہمزاد کی بات سن کر جیسے مجھ میں زندگی آ گئی۔ "مجھے تم پر ناز ہے بلکہ اگر میں یہ کہوں تو زیادہ صحیح ہے کہ مجھے خود پر ناز ہے اس لیے کہ تم میرا ہی تو جسم لطیف ہو۔ تم مجھ سے جدا کب ہو۔"

میں سمجھ رہا تھا کہ مہ پارہ نے مجھے صرف دھمکی دی ہے اس سلسلے میں وہ کوئی عملی قدم نہیں اٹھائے گی' لیکن یہ میری بھول تھی۔ جلد ہی مجھے اس کی طرف سے کچھ اذیتیں برداشت کرنا پڑیں۔ ہمزاد بھی مجھے ان اذیتوں سے بہ مشکل بچا سکا۔ مہ پارہ چاہتی تھی کہ میں اس کا شہر چھوڑ کر چلا جاؤں' لیکن میں اپنی یہ توہین برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ ایک لڑکی کے مقابلے میں بھاگ جاؤں۔ میں ہمزاد پر بہت بگڑا' لیکن وہ بہ دستور یہی کہتا رہا کہ ایک ہفتہ گزرنے سے پہلے کچھ نہیں ہو سکتا۔ دوسری طرف مہ پارہ مجھے ایک دن کے لیے بھی اپنے شہر میں دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ آخر ہمزاد کے مشورے پر میں نے یہ چال چلی کہ مہ پارہ سے چکنی چپڑی باتیں کر کے اس سے ایک ہفتے کی مہلت لے لی۔

مہ پارہ نے مجھ پر اسی دوران میں ایک اور ضرب لگائی تھی کہ حسین اور میری پسند شانتی کو مجھ سے چھین کر میرٹھ کے نواب صاحب کی داشتہ بنوا دیا تھا۔ میں نے نواب صاحب

سے انتقام لینے کے لیے ان کی بیٹی نرگس کو اپنا ہدف بنا رکھا تھا۔ ایک شب' تیسرے پہر کے قریب نرگس میری حویلی سے نکل کر بھاگنے میں کامیاب ہو گئی اور اس نے باپ کو سب کچھ بتا دیا۔ نواب صاحب نے پولیس کو اطلاع کر دی۔ یہ الگ بات کہ ہمزاد کے ہوتے میری گرفتاری ممکن نہ تھی ہمزاد نے ان پانچوں پولیس والوں کو ہلاک کر دیا اور مجھے دیلی بازر کی اس سرائے میں لے جا کر ٹھہرایا جہاں میں نے میرٹھ آ کر پہلی رات گزاری تھی۔ دوسرے دن میں نے عبدالجبار نامی ایک شخص سے اس کا مکان خرید لیا۔ عبدالجبار جوئے کا دھنی تھا۔ اس نے اپنی ساری دولت جوئے میں برباد کر دی تھی۔ مکان بیچ کر اسے جو رقم حاصل ہوئی' اسے بھی جوئے میں ہار گیا۔ اگر میں اس کی مدد نہ کرتا تو اس کی حالت بہت خستہ ہو جاتی۔ میں نے اسے اس عمل کے بارے میں بتایا جس کے ذریعے وہ اپنے ہمزاد کو حاصل کر سکتا تھا۔ دراصل یہ تدبیر مجھے میرے ہمزاد نے سمجھائی تھی کہ اگر دو ہمزاد مل جائیں تو مہ پارہ سے بہ آسانی ٹکر لے سکتے ہیں۔ دراصل ہمزاد نے مجھ سے سات دن کی جو مہلت لی تھی' اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ ہمزاد کوشش کے باوجود مہ پارہ کے عمل میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈال سکا تھا۔ اس کے بعد مہ پارہ کی طرف سے کچھ ایسے شدید حربے آزمائے گئے کہ جان بچانا مشکل ہو گئی۔ مجبوراً" میں میرٹھ سے بھاگ کھڑا ہوا' لیکن اب مہ پارہ مجھے آسانی سے نہیں نکلنے دینا چاہتی تھی۔ میں جس ٹرین میں بیٹھ کر فرار ہو رہا تھا' اسے ایک اسٹیشن پر روک لیا گیا اور پولیس نے اس کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ معلوم ہوا کہ پولیس کو کسی مجرم کی تلاش تھی۔ پولیس اب اس بات کی منتظر تھی کہ میرٹھ سے ایک اعلی افسر وہاں آ کر اس مجرم کو شناخت کرے جو اس ٹرین میں بیٹھ کر فرار ہو رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ مجرم میں ہی ہو سکتا ہوں اور یہ ساری شرارت مہ پارہ کی ہے۔

ہمزاد میرے ساتھ تھا اس لیے مجھے زیادہ پریشانی نہیں ہوئی اور میں پولیس سے جان بچا کر نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ ہمزاد نے مجھے ایک تحصیل "کول" میں پہنچا دیا۔ یہی وہ تحصیل تھی جو بعد میں علی گڑھ شہر بنی۔ میں نے اس چھوٹی سی بستی کی ایک سرائے میں قیام کیا اور بستر پر لیٹ کر اپنے حالات پر غور کرنے لگا۔ مہ پارہ سے ذلت آمیز شکست میرے ضمیر کو کچوکے لگا رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں' کیا نہ کروں! دن اسی سوچ بچار میں گزرا۔ جب رات ہوئی تو میری روح کا بوجھ اور بڑھ گیا۔ ان سب باتوں سے ذہنی قرار حاصل کرنے کے لیے میں نے ہمزاد سے کسی حسین سہارے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس نے میری آرزو پوری کر دی۔ اچانک پولیس نے سرائے پر چھاپا مارا اور دروازہ توڑ کر میرے کمرے میں گھس آئی۔ یہ شرارت بھی مہ پارہ کی تھی۔ میں اس وقت پاک نہیں تھا اس لیے ہمزاد کو اپنی مدد کے

لیے نہیں بلا سکا۔ پولیس مجھے گرفتار کر کے لے گئی۔ میرے ماضی کے جرائم رنگ لا کر رہے پولیس جو میری تاک میں رہا کرتی تھی، مجھے رنگے ہاتھوں پکڑ کر کھل کھیلی۔ ان لوگوں نے مجھے مارا پیٹا، پھر ایک دن حوالات میں رکھ کر دوسرے دن جیل بھیج دیا۔ کیوں کہ میرا مقدمہ عدالت میں پیش کرنے سے پہلے وہ اچھی طرح اپنی تیاریاں مکمل کر لینا چاہتے تھے۔ جیلر کو بتا دیا گیا تھا کہ میں بہت خطرناک مجرم ہوں اس لیے مجھے جیل میں سخت اذیتیں پہنچائی گئیں۔ میں اس وقت بے بس تھا، کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اگر مجھے غسل کرنے کا موقع مل جاتا تو پاک ہو جانے کے بعد ہمزاد کو طلب کر سکتا تھا۔ یہ موقع مجھے کئی دن بعد ملا۔ نہاتے ہی میں نے ہمزاد کو طلب کیا۔ میں جیل کے کارندوں سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ ہمزاد نے میرے اشارے پر ایک ڈنڈے سے ان کی پٹائی شروع کر دی۔ قیدی حیرت سے یہ منظر دیکھ رہے تھے کہ ایک ڈنڈا فضا میں خود بہ خود حرکت کر رہا ہے اور کارندوں کی پٹائی ہو رہی تھی۔ شور و غل کی آوازیں سن کر جیلر بھی وہاں پہنچ گیا اور پھر میرے ایما پر اس کی پٹائی شروع ہو گئی۔ جب مدد کے لیے چلاتے چلاتے اس کا حلق خشک ہو گیا تو میں نے اس پر تشدّد رکوا دیا، پھر اس کا مزاج پوچھا۔ یہ واقعہ اتنا پُراسرار تھا کہ جیلر میرے قدموں پر گر پڑا۔ اس نے مجھے کوئی پہنچا ہوا ولی سمجھ لیا تھا۔ تمام قیدی بھی یہی سمجھ رہے تھے چنانچہ اس روز کے بعد سے میں جیل میں نوابوں کی سی زندگی گزارنے لگا۔

اگر میں چاہتا تو ہمزاد کی مدد سے فرار ہو سکتا تھا۔ لیکن فی الحال میرٹھ کا رخ کرنا میرے لیے خطرناک ثابت ہوتا۔ میں چاہتا تھا کہ عبدالجبّار کو بھی وہیں جیل میں بلواؤں اور اس "گوشہ عافیت" میں اس سے ہمزاد کو قابو کرنے کا عمل کرواؤں۔ میرے ہمزاد نے ایسا چکر چلایا کہ عبدالجبّار کے ہاتھوں ایک انگریز کا قتل کروا دیا۔ اس سنگین جرم میں عبدالجبّار کو کول کی جیل آنا پڑا۔ وہ مجھے جیل میں دیکھ کر حیران رہ گیا، لیکن میں نے اسے مطمئن کر دیا۔

جیلر اب میرا بندہ بے دام تھا۔ میرے اشارے پر اس نے جیل کا ایک کمرا عبدالجبّار کے لیے صاف کرا دیا۔ میں چاہتا تھا کہ جبّار اس کمرے میں بیٹھ کر ہمزاد کو قابو میں کرنے کا عمل کرے۔ میں نے جبّار کو اچھی طرح بتا دیا کہ اس عمل کے دوران میں اسے خوف ناک واقعات سے دو چار ہونا پڑے گا، لیکن وہ خوفزدہ ہوئے بغیر اپنا عمل جاری رکھے۔ اس کے بعد میں نے اسے بتانا شروع کیا کہ وہ اپنے ہمزاد کو کس طرح قابو کر سکتا ہے!

پھر جبّار نے اپنے ہمزاد کو قابو کرنے کا عمل شروع کر دیا۔ عمل کے دوران میں اگر میرا ہمزاد اس کی مدد نہ کر رہا ہوتا تو وہ کبھی کا عمل ترک کر چکا ہوتا۔ عمل مکمل ہونے سے ایک رات قبل میں یہ جان کر گھبرا گیا کہ مہ پارہ نے جبّار پر اپنی پراسرار قوّتوں کے ذریعے نہایت شدید حملہ

کیا، لیکن میرے ہمزاد نے اسے کسی طرح بچا لیا۔ مہ پارہ میری طرف سے غافل نہ تھی اور میری ایک ایک حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ ہمزاد سے مجھے معلوم ہوا کہ مہ پارہ میرے پورے منصوبے سے واقف ہو چکی ہے کہ میں یہ سب تیاری اس سے انتقام لینے کے لیے کر رہا ہوں۔ اسی دن مہ پارہ نے ایک اور حملہ کیا۔ یہ حملہ پہلے سے بھی شدید تھا۔

واقعہ یہ تھا کہ انگریزوں کے خلاف جو قوم پرست خفیہ تنظیمیں کام کر رہی تھیں اس کے ایک رکن نے گرفتار ہونے کے بعد سربراہ کے طور پر میرا نام لیا تھا۔ مہ پارہ نے تنظیم کے اس رکن کو اپنے سحر میں لے کر نہ صرف میرا بلکہ جبّار کا نام بھی اس کی زبان سے ادا کرا دیا۔ مہ پارہ کا مقصد یہ تھا کہ اس طرح اعلیٰ حکام فوراً ہماری طرف متوجہ ہوں اور ہمیں جیل سے نکال کر ملٹری کی نگرانی میں وہاں سے لے جایا جائے جب کہ جبّار کا عمل پورا ہونے کے لیے ہمیں ایک دن رات جیل میں رہنا ضروری تھا۔

کچھ بڑے انگریز افسران، ملٹری کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ "کول" کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ فکر کی بات یہ تھی کہ عمل کے دوران میں ہمزاد کا جبار کے پاس رہنا ضروری تھا۔ میں نے کافی سوچ بچار کے بعد ایک تجویز پر عمل کیا۔ جیلر جو میرا مرید تھا، میں نے اسے آمادہ کیا کہ وہ صبح سے پہلے کسی بھی صورت میں ہمیں، ملٹری کے حوالے نہ کرے اور وہی ہوا بھی! جیلر میری خاطر ملٹری سے ٹکرا گیا۔ صبح تک جیل کی پولیس اور ملٹری میں سخت تصادم ہوا۔ اس معرکے میں خود جیلر بھی مارا گیا، مگر اس نے ملٹری کی سخت فائرنگ کے باوجود آخر دم تک وفاداری کا ثبوت دیا۔ میں اپنے منصوبے میں کامیاب ہوا۔ جبّار نے ہمزاد کا عمل پورا کر لیا۔ میں اور جبّار اپنے اپنے ہمزادوں کے ہمراہ جیل سے فرار ہو گئے، لیکن ہمیں نہایت سخت حالات کا مقابلہ کرنا پڑا۔ پھر بھی ہم کسی طرح "کول" سے نکل کر اکبر آباد پہنچنے میں کامیاب ہو گئے جو اب آگرہ کہلاتا ہے۔

جبّار جسمانی اور ذہنی طور پر پوری طرح صحت یاب تھا اب وہ پوری طرح مہ پارہ کے ساتھ معرکے میں میرا حکم بجا لانے کو تیار تھا۔

پھر جس دن میں، جبّار کے ساتھ میرٹھ روانہ ہونے والا تھا، اپنے تصوّر کی قوّت کو کام میں لا کر مہ پارہ کو دیکھا اور پھر اسے مخاطب کیا۔ "ہم آ رہے ہیں اور آنے سے پہلے تمہیں آگاہ کر رہے ہیں۔ اگر تم ہمیں روک سکتی ہو تو روکو!"

اسی رات میں نے ہمزاد کو طلب کر کے میرٹھ چلنے کا اظہار کیا۔ ہمزاد نے مشورہ دیا کہ جبّار کے اور میرے میرٹھ پہنچنے سے قبل وہ خود ایک مرتبہ جبّار کے ہمزاد کو اپنے ساتھ لے کر

وہاں کا جائزہ لینا چاہتا ہے کہ مہ پارہ نے وہاں کیا حفاظتی اقدامات کیے ہیں اور انھیں کس طرح ناکارہ بنایا جا سکتا ہے! پھر جبار نے میرے ایما پر اپنے ہمزاد کو حکم دیا کہ میرے ہمزاد کے ساتھ پوری معاونت کرے۔ اس کے بعد دونوں ہمزاد میرٹھ روانہ ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد جب میں ایک مرتبہ ٹہلتے ٹہلتے پلٹا تو میں نے جبّار کے ہاتھ میں خنجر دیکھا۔ اس کے ارادے خطرناک نظر آ رہے تھے۔ میرے لیے یہ امر تعجب خیز تھا، لیکن میں بغیر وقت ضائع کیے جبار پر جھپٹ پڑا۔ اس نے بھی اپنی حفاظت کی۔ خنجر اب اس کے ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا۔ ہم دونوں آپس میں گتھ گئے۔ یہ جھگڑا اتنا بڑھا کہ میں نے جبّار کو مار مار کر تقریباً نیم بے ہوش کر دیا۔ اسی حالت میں جب میں اس کا گلا گھونٹنے والا تھا کہ میرا ہمزاد آ گیا۔ اس نے مجھے فوراً ایسا کرنے سے روک دیا۔ ہمزاد نے مجھے بتایا کہ یہ بھی مہ پارہ کی ایک چال تھی۔ اس نے مجھے اور جبار کو اپنی پراسرار قوتوں کے سحر میں لے کر فریب نظر میں مبتلا کر دیا تھا تاکہ اس طرح دونوں میں سے کوئی ایک ختم ہو جائے۔ پھر کوئی ایک شخص اس کا کچھ نہ بگاڑ پاتا کیوں کہ صرف ایک ہمزاد کے ذریعے اس کا مقابلہ کرنا، ممکن نہیں۔ ہمزاد کی بات کا ثبوت یہ تھا کہ اس وقت تلاش بسیار کے باوجود کمرے میں وہ خنجر نہیں ملا جو میں نے جبّار کے ہاتھ میں دیکھا تھا۔

اس کے بعد مسلسل ایک گھنٹے کی نگہداشت سے جبّار اس قابل ہو سکا کہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے۔ تقریباً آدھی رات گزر چکی تھی۔ جب ہم میرٹھ کے لیے روانہ ہوئے۔ پھر ہم بہت جلد میرٹھ پہنچ گئے۔ اب ہمیں وقتی طور پر کسی ٹھکانے کی تلاش تھی۔ ہم نے خیر نگر دروازے تک پہنچ کر جبار کے ایک دوست کے گھر پناہ لے لی، لیکن کچھ دیر بعد ہی ہمیں وہاں سے بھاگنا پڑا۔ مہ پارہ نے ہمیں وہاں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا تھا۔ اگر ہمیں اس کمرے سے نکلنے میں تھوڑی سی دیر بھی ہو جاتی جس میں آرام کرنے لیٹے تھے تو کمرے کی چھت اور دیواریں ہم پر آ رہتیں۔ وہاں سے فرار ہو کر ہم خیر نگر دروازے ہی میں خود جبّار کے اپنے مکان میں پناہ گزیں ہو گئے۔ مہ پارہ برابر ہمارے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ اس کا مقصد تھا کہ ہم میرٹھ پہنچ کر سکوں کا ایک سانس بھی نہ لے سکیں۔ اس مرتبہ معلوم ہوا کہ ملٹری نے خیر نگر دروازے کو چاروں طرف سے گھیر کر ہماری گرفتاری کا سامان کر لیا ہے۔ مہ پارہ اب اپنی پُراسرار قوتوں سے دوسرے کام لے رہی تھی اس لیے کہ وہ بہ راہ راست ہم پر حملہ کرنے کی اہل نہیں رہی تھی۔

جب مجھے ہوش آیا تو ہمزاد سے معلوم ہوا کہ آج دن بھر ہم دونوں بے ہوش رہے اور دونوں ہمزاد ہمیں جگہ جگہ لیے پھرے کیوں کہ پولیس اور ملٹری تلاش میں تھی۔ اب ہم

دونوں اپنی بیگم پل والی حویلی میں تھے۔

پھر اسی رات میں جبّار کو حویلی میں چھوڑ کر دونوں ہمزادوں کو ہمراہ مہ پارہ سے دو بہ دو مقابلہ کرنے لیے اس کی حویلی میں پہنچ گیا۔ مہ پارہ کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ ہمزاد اندر کمرے کے کواڑوں میں تحلیل ہو گیا۔ کمرے کا دروازہ ایک شور کے ساتھ کھلا اور میں تیزی سے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کمرے میں داخل ہو گیا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی مہ پارہ ایک دم مسہری سے اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے کندن ایسے سرخ و سفید چہرے پر میری نظر نہیں ٹھہر رہی تھی۔ اچانک میری اور اس کی نظریں ملیں اور میں نے کہا۔ "میں آ گیا ہوں مہ پارہ، میں آ گیا ہوں!"

"تو پھر یقین کر لوں کہ تمہاری موت ہی تمہیں یہاں گھسیٹ لائی ہے۔" مہ پارہ کا فقرہ پورا ہوا تھا کہ اچانک کمرا نہایت تیز قسم کی روشنی سے بھر گیا جیسے رات کے وقت سورج نکل آیا ہو۔ میں نے گھبرا کر اپنی دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

میرے اور مہ پارہ کے ٹکراؤ کا یہ ایک خوف ناک آغاز تھا۔ پُراسرار قوتیں ایک دوسرے سے نبرد آزما ہو چکی تھیں۔ اس مقابلے میں مجھے پھر ایک بار مہ پارہ سے شکست کھانا پڑی۔ اس معرکے میں خاصی بلندی سے گر کر میں اپنی ایک ٹانگ بھی توڑ بیٹھا اور بے ہوش ہو گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک آرام دہ بستر پر دراز تھا اور ہمزاد میرے پاس موجود تھا۔ یہ قیصر گنج والی حویلی تھی۔ ہمزاد نے مجھے بتایا کہ مہ پارہ نے اپنی پراسرار قوتوں سے کام لے کر جبار کو گرفتار کرا دیا ہے اور خود میرٹھ سے فرار ہو گئی ہے۔ وہ معرکہ اتنا ہی خطرناک تھا کہ جیت جانے کے باوجود بھی مہ پارہ بری طرح دہشت زدہ ہو گئی تھی۔ اس نے اب کہاں کا رخ کیا تھا، یہ بات ہمزاد کو معلوم نہیں ہو سکی تھی۔ اب سب سے پہلے میرے لیے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ کسی نہ کسی طرح جبّار کو ملٹری کی حراست سے آزاد کراؤں۔ یہ کام ہمزاد کے لیے کچھ ایسا مشکل نہ تھا۔ جبّار کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ بھی میری طرح پاک نہیں تھا اور اسی حالت میں مہ پارہ کی شہ پر ملٹری نے اس پر ہاتھ ڈال دیا تھا۔ میں خود بھی ایک مرتبہ ایسے حالات سے گزر چکا تھا اس لیے جبّار کی مجبوری سمجھ گیا۔ وہ اس حالت میں ہمزاد کو اپنی مدد کے لیے نہیں بلا سکتا تھا۔

پھر میرے ہی ہمزاد نے جبّار کو ملٹری سے نجات دلائی۔ اس دوران میں میرا ہمزاد یہ معلوم کر چکا تھا کہ مہ پارہ، میرٹھ سے فرار ہو کر کہاں گئی تھی۔ میرے ہمزاد کی اطلاع کے مطابق مہ پارہ، کلکتہ میں تھی۔ نتیجتہً میں نے بھی کلکتہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔

میرٹھ سے کلکتہ روانگی کے لیے ہم نے رات کا وقت مقرر کیا۔ میں دنیا کے کسی بھی کونے میں مہ پارہ کو چین سے رہنے دینا نہیں چاہتا تھا۔ جزوی طور پر میں اس پر غالب آچکا تھا۔ اس نے مجھے اپنا شہر چھوڑنے کی دھمکی دی تھی مگر خود فرار ہونے پر مجبور ہو گئی تھی۔ میں اسے اپنی کامیابی ہی سمجھ سکتا تھا۔ روانگی سے قبل شام کے وقت ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ میں اپنی زخمی ٹانگ کے باعث جبّار کا سہارا لیے ہوئے غسل خانے سے نکل رہا تھا کہ کھڑکی سے ایک سنسناتا ہوا خنجر اندر آیا اور سامنے والے دروازے میں پیوست ہو گیا۔ اس خنجر کے ساتھ ایک کاغذ بھی تھا جس پر تحریر عبارت میرے ہی لیے تھی۔ مجھے پیغام بھیجنے والی ایک ملک گیر خفیہ تنظیم تھی جو انگریزوں کے ناپاک وجود کو ہندوستان کی سرزمین سے مٹا دینا چاہتی تھی۔ خط میں اس بات کا اظہار کیا گیا تھا کہ تنظیم کو میری مافوق الفطرت قوتوں کا علم ہے اس لیے وہ لوگ ملک و قوم کے نام پر مجھے تنظیم میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ پیغام میں یہ بھی درج تھا کہ اگر میں اس پر آمادہ ہو جاؤں تو اس خنجر کو دوبارہ اس چوکھٹ پر پیوست کر دوں۔ بعد میں کسی وقت وہ خود ہی مجھ سے رابطہ قائم کر لیتے۔

میں انگریزوں سے نفرت کرتا تھا اسی لیے ان لوگوں کا ساتھ دینے پر راضی ہو گیا۔ میں نے وہ خنجر دوبارہ اسی چوکھٹ میں پیوست کر دیا۔

اسی رات ہم کلکتہ روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر مہ پارہ سے میرا ایک اور معرکہ ہوا۔ فیصلہ کن اور سخت معرکے میں بالآخر ہمیں فتح حاصل ہوئی۔ ہم نے مہ پارہ کو قید کر لیا۔ وہ مغرور اور سرکش عورت اب اتنی پژمردہ نظر آ رہی تھی جیسے اس کی پوری شخصیت ٹوٹ پھوٹ کر منتشر ہو گئی ہے اس کے باوجود اس کے حسن کی حشر سامانیاں وہی تھیں۔ اسے دیکھ کر میرے جسم میں شعلے سے بھڑک اٹھے۔ ہجر کے طویل اور تھکا دینے والے لمحات اب ختم ہونے والے تھے اور میرا فراق، وصل آشنا ہونے کو تھا، لیکن عین وقت پر بڑی عجیب اور نازک صورت حال سامنے آ گئی۔ جبّار نے مہ پارہ پر اپنا حق جتایا اور خم ٹھونک کر میرے مقابلے پر آ گیا۔ اس نے واضح الفاظ میں مجھ سے کہا کہ مہ پارہ اس کی کوششوں کے نتیجے میں زیرِ دام آئی ہے اور وہ کسی بھی قیمت پر مجھے اس کے قریب نہیں جانے دے گا۔

جبّار کی بات سن کر میں آگ بگولہ ہو گیا۔ میں تیزی سے اپنے ہمزاد کی طرف متوجہ ہوا تاکہ اسے جبّار کی دھجیاں اڑانے کا حکم دوں۔

پھر اس سے پہلے کہ میں ہمزاد کو کوئی حکم دے سکتا، مجھے اس کی سرد آواز سنائی دی جس نے میری تن بدن میں آگ لگا دی۔ ہمزاد کہہ رہا تھا۔ "جبّار صحیح کہتا ہے۔ اسے واقعی مہ پارہ سے عشق ہے۔ آپ کو اس کے حق میں دست بردار ہو جانا چاہیے۔"

"میں نے اس سلسلے میں تم سے کوئی مشورہ نہیں کیا!" میں نے انتہائی ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ اس احسان فراموش کی دھجیاں بکھیر دو!"

"آپ غلطی پر ہیں۔" مجھے ہمزاد کی آواز میں حکم عدولی کا عنصر نظر آیا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ ہمزاد بھی سرکشی پر آمادہ نظر آ رہا تھا۔ اس سے پہلے اس نے کبھی میرے کسی حکم کو ماننے سے اجتناب نہیں کیا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ جبّار میری بے بسی پر مسکرا رہا تھا۔

میری قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ میں ہمزاد پر برس پڑا۔ "میں تم سے جو کچھ کہہ رہا ہوں کرو! تمھیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ صحیح اور غلط کا فیصلہ کرو!"

"مگر میں اس پر مجبور ہوں۔" ہمزاد نے جواب دیا۔

"تمھیں کس نے مجبور کیا ہے؟" میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے سوال کیا۔

"میری صداقت نے!" ہمزاد بولا۔

"بکو مت!" مجھے اب ہمزاد پر بھی شدت سے غصہ آ گیا تھا۔ اسی وقت جبّار کی آواز سنائی دی۔ وہ مجھ سے مخاطب تھی۔ "میں اب تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ میرے اور تمہارے راستے اب مختلف ہو چکے ہیں۔ میں اسی وقت یہ جگہ چھوڑ رہا ہوں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم مہ پارہ کو حاصل نہیں کر سکو گے اور تمہارے ناآسودہ خواہشوں کی کبھی تکمیل نہ ہو سکے گی۔ وہ میری ہے اور میری رہے گی کیوں کہ تمہارے اور میرے جذبات میں بنیادی طور پر بڑا فرق ہے۔ تم ہوس کے غلام ہو اور میں بندہ عشق! عشق کی قوت افضل ہوتی ہے۔ تمہارے مقابلے میں میرا جذبہ صادق؟"

میں گویا پتھر سا بنا ہو اس احسان فراموش کی باتیں سنتا رہا۔ میں نے سوٹ کیس اٹھا کر اسے فلیٹ سے جاتے ہوئے بھی دیکھا۔ یوں جیسے یہ سب کچھ حقیقت نہ ہو، کوئی تکلیف دہ خواب ہو۔ میں نے خود کو اتنا بے بس اور لاچار کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔

جبّار چلا گیا تو میں ایک دم چیخ اٹھا۔ "ہمزاد! اب تم بھی دفع ہو جاؤ!"

ہمزاد جواب تک میرے سامنے مودب کھڑا ہوا تھا، میرا یہ فقرہ سنتے ہی غائب ہو گیا۔

میری دنیا اندھیر ہو چکی تھی۔ ہمزاد ہی میرے لیے سب کچھ اور آج اسی نے پہلی مرتبہ میرا حکم ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ میرے لیے اس سے زیادہ تکلیف دہ بات اور کیا ہو سکتی تھی! اچانک منزل میرے بہت قریب آ کر دور ہو گئی تھی، اتنی دور جس کا میں نے کبھی تصور بھی

نہیں کیا تھا۔ سب کچھ بس اچانک اور دیکھتے دیکھتے ہو گیا تھا۔ بار بار مہ پارہ کا چہرہ میری آنکھوں میں گھومتا اور تلملا کر رہ جاتا۔

میں جانے کب تک اندر ہی اندر سلگتا رہا اور پھر میرا ہمزاد بغیر بلائے خود حاضر ہو گیا۔ میں اس پر بہت برہم ہوا تو اس نے صورت حال کی وضاحت کی پہلے اس نے جو کچھ کہا تھا اور جس طرح جبّار کی حمایت کی تھی، وہ محض جبّار کو سنانے کے لیے تھا۔ معاملہ دراصل یہ تھا کہ دو ہمزاد آپس میں نہیں ٹکرا سکتے تھے۔ اس کا نتیجہ بڑا بھیانک نکلتا۔ اس طرح وہ دونوں پُراسرار قوّتیں جو برابر کی تھیں، آپس میں ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتیں۔ دونوں ہمزاد ختم ہو جاتے۔ یہی نہیں بلکہ اس معرکہ آرائی میں جبّار کو اور مجھے، دونوں کو اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑتے۔ میرے ہمزاد نے اسی لیے معاملے کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے فی الحال پسپائی اختیار کر لی تھی۔

ان حالات میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ میں اپنی آخری فتح کا جشن نہیں منا سکا۔ میری اور جبّار کی چپقلش سے فائدہ اٹھا کر مہ پارہ خودکشی کرنے میں کامیاب ہو گئی اور میں ہاتھ ملتا رہ گیا۔ مہ پارہ نے اپنی جان کی قربانی پیش کر کے اپنی انا کو بچا لیا۔ وہ میرے سامنے نہیں جھکی۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ مہ پارہ واقعی عظیم عورت تھی۔ یہ اس کی عظمت ہی تھی کہ میرے سامنے جھکنے پر اس نے موت کو ترجیح دی۔

اس دوران میں میری پُراسرار قوّتوں کا شہرہ ہو چکا تھا۔ پولیس اور حکومت کے دوسرے ادارے میرے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ چند باتوں کی وجہ سے انگریز حکومت کو مجھ پہ شبہہ ہو چکا تھا کہ میں کسی حرّیت پسند تنظیم سے تعلق رکھتا ہوں حالانکہ حقیقت یہ نہیں تھی۔ اس زمانے آزادی کی تحریک زوروں پر تھی۔ میری شہرت سن کر ہی تحریک آزادی کے سرکردہ لوگوں کو مجھ سے دلچسپی ہو گئی تھی اور کسی طرح انہوں نے میرا سراغ لگا کر مجھ سے رابطہ بھی قائم کر لیا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ میں اپنی پُراسرار قوّتوں کو بروئے کار لا کر انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے میں ان کی مدد کروں۔ میں اس کے لیے تیار تھا کیوں کہ اب مہ پارہ کا معاملہ بھی ختم ہو چکا تھا۔

پھر مجھے معلوم ہوا کہ جبّار، انگریزوں سے جا ملا ہے۔ یہ اطلاع مجھے اپنے ہمزاد سے ملی تھی۔ مجھے اب اپنی زندگی ویران سی محسوس ہونے لگی تھی شاید میں سچ مچ مہ پارہ کو چاہنے لگا تھا اور اس کے بغیر مجھے اپنی زندگی بے کیف محسوس ہو رہی تھی

انگریزوں نے جبّار کے ہمزاد کی قوّت سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیا۔ وہ آزادی کے متوالوں کو پکڑ کر جیلوں میں ٹھونس رہے تھے اور تشدّد کا بازار گرم تھا۔ اس صورت حال نے

میرے جذبات و احساسات کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ میں سوچنے لگا کہ زندگی کا مقصد صرف عیش کوشی ہی تو نہیں۔ میں نے ہمزاد کو حکم دیا کہ وہ تحریک آزادی کے متوالوں کو انگریزوں کی قید سے نجات دلائے۔

ہمزاد نے میرے حکم کی تعمیل کی اور اس کام کی تکمیل پر مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میری روح کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے۔

اسی رات کو ایک نامعلوم ہستی مجھ سے ملنے میری قیام گاہ پر آئی۔ اس نے اپنا آدھا چہرہ کپڑے سے چھپا رکھا تھا جس کی وجہ سے اس کی صرف آنکھیں ہی نظر آ رہی تھیں، روشن اور چمکیلی آنکھیں!

میں سمجھ چکا تھا آنے والے کا تعلق اسی خفیہ تنظیم سے ہے جس کا خط مجھے کچھ دن پہلے ملا تھا۔ نووارد کے سر پر سبز عمامہ تھا جس کی نشان دہی اس خط میں کر دی گئی تھی جو اس تنظیم کی طرف سے مجھے لکھا گیا تھا۔ اس کے اندر آتے ہی ہمزاد نے دروازے کی کنڈی لگا دی۔ کنڈی لگانے سے جو آواز پیدا ہوئی اس نے اجنبی کو چونکا دیا۔ اس نے ایک دم پلٹ کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں لحہ بھر کے لیے حیرت کے سائے نظر آئے اور پھر دوسرے ہی لمحے تیزی سے اس کا ہاتھ اپنے ڈھیلے ڈھالے لباس میں گیا۔ اب اس کی ہاتھ میں تیز چمکیلا خنجر تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اسے یقیناً کچھ غلط فہمی ہو گئی ہے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ہمزاد کا وجود اس کی نظروں سے پوشیدہ تھا۔ وہ بڑے چوکنّا انداز میں اپنی بڑی بڑی روشن آنکھوں سے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔

میں نے یہ سوچ کر کہ کہیں بات مزید بگڑ نہ جائے، اسے مخاطب کیا۔ "اجنبی! یہاں تمہیں کسی قسم کا خطرہ نہیں۔ تم اس وقت شیخ کرامت کے روبہ رو ہو۔ یہاں اس وقت میرے سوا اور کوئی نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہاں آنے سے پہلے میرے بارے میں تمہیں سب کچھ بتا دیا گیا ہو گا۔ دروازے کے خود بہ خود بند ہو جانے پر حیران ہونے یا کسی قسم کی غلط فہمی کو دل میں جگہ دینے کی ضرورت نہیں۔ یہ میری پُراسرار قوّتوں کا ایک ادنیٰ سا کرشمہ ہے۔ تمہارے مزید اطمینان کے لیے یہ بتا دوں کہ ہر حال میں تم لوگوں کا ساتھ دینے پر راضی ہوں۔ میں تمہارے حق میں فیصلہ کر چکا ہوں۔"

شاید چند لمحے اجنبی نے کچھ سوچا اور پھر اپنا خنجر لباس میں کہیں چھپا لیا۔ غالباً" اس نے میرے لہجے کی صداقت کو محسوس کر لیا تھا۔

میں نے اپنی مسہری کے قریب رکھی ہوئی ایک آرام کرسی کی طرف اشارہ کر کے

اجنبی سے وہاں بیٹھنے کو کہا۔

وہ نپے تلے قدم رکھتا ہوا آگے بڑھا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ ابھی تک نہ تو اس نے مجھے مخاطب کیا تھا اور نہ ہی میری کسی بات کا جواب دیا تھا مجھے اس کے اس رویے سے کچھ الجھن سی محسوس ہو رہی تھی، مگر میں نے اظہار نہیں کیا اور منتظر رہا کہ وہ خود ہی کچھ بولے۔

کچھ بولنے سے پہلے اچانک اس نے اپنے چہرے سے نقاب ہٹا دی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب مجھے محسوس ہوا کہ ایک بجلی سی کوند گئی وہ میرے لیے ایک ذہنی جھٹکا ہی تھا۔ میں نے کئی بار پلکیں جھپکائیں کہ شاید میری بصارت مجھے دھوکا دے رہی ہو۔ میرے لیے یہ ایک قطعی غیر متوقع بات تھی کہ اپنے سامنے ایک حسین ترین لڑکی کو دیکھوں گا۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔ وہ چہرہ اتنا ہی حسین اور دل کش تھا کہ کچھ دیر کے لیے میں اس کے خدوخال میں کھو گیا۔ اجلی رنگت کالی چمکیلی نشیلی سی آنکھیں، ہونٹ گلاب کی سی پنکھڑیاں، رخساروں کی سفیدی میں ہلکی ہلکی سرخی گھلی ہوئی! چوڑی پیشانی پر سبز عمامہ اس طرح بندھا ہوا تھا جیسے کسی دلھن کے سر پر سہرا سجا ہو۔ بڑی بڑی آنکھوں پر لانبی سیاہ پلکیں، ستواں ناک، بال عمامے میں چھپے ہوئے جن کا میں پر خفیف سا گڑھا جیسے نرم سبک رو پانی میں بھنور پڑ جائے۔ گلابی ہونٹوں سے جھانکتی ہوئی سفید دانتوں کی کے قطار جیسے سچے موتی ہوں اور ابرو جی سے دو کمانیں کھنچی ہوں۔ میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ میرے ذہن میں عورت کے حسن پر لکھے جانے والے فارسی اور اردو کے نہ جانے کتنے شعر گونج گئے۔ آج بھی وہ چہرہ، آنکھوں میں گھوم جاتا ہے تو یادوں میں چراغ سے جلنے لگتے ہیں۔

میں جانے کب تک اس کیفیت میں گم رہتا کہ میری سماعت میں گھنٹیاں سی بج اٹھیں۔ اس آواز کی جھنکار، لوچ اور ٹھنڈک میں نے اپنی رُوح میں اترتی محسوس کی۔ "شیخ! تمہیں مبارک ہو کہ تم نے سچائی کے حق میں فیصلہ دیا۔ ہم تمہیں خوش آمدید کہتے ہیں۔ اب تم اکیلے نہیں رہے تمہارے ساتھ اب سرفروشوں کی جان بازوں کا وہ قافلہ ہے جو وفا کرتا اور وفا نبھانا جانتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہمیں کبھی مایوس نہیں کرو گے۔"

"وفا کرنا اور وفا نبھانا!" میں جیسے خواب کے سے عالم میں بولا۔ "کیا تم سچ کہہ رہی ہو؟"

"ہاں!" اس نے پر اعتماد آواز میں کہا۔ "یہ ابھی صرف اَلفاظ ہیں، مگر جب یہ اَلفاظ تمہارا تجربہ بنیں گے تو تمہیں خود بہ خود ــ ان کی صداقت پر یقین آ جائے گا۔"

میری نظریں اس چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ اس چہرے پر ایک عجیب سی

معصومیت اور تقدس تھا۔ ایسا تقدّس میں نے اس سے پہلے کسی عورت کے چہرے پر نہیں دیکھا تھا، حسن اور تقدّس! ایسا تقدّس جس میں پاکیزگی اور طہارت تھی جس کے روبہ رو عام سطحی اور سفلی جذبات نہ جانے کہاں کھو جاتے ہیں! حُسن اور تقدّس کے اس امتزاج کے سامنے کوئی منہ زور جذبہ سر نہیں ابھارتا۔ میں نے اس لمحے اپنے اندر گھٹیا اور جذبات کو گہری نیند سوتے ہوئے محسوس کیا۔ یہ تجربہ میرے لیے قطعی نیا تھا۔ رعب حُسن اور خود فراموشی کے احساس سے میری پلکیں جھک گویں۔ اس کا نام کیا تھا؟ مجاہدوں کی خفیہ تنظیم سے اس کا کیا تعلق تھا؟ وہ ان میں کس طرح اور کیوں شامل ہوئی؟ مجھے کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ مجھے تو اس وقت یہ محسوس ہو رہا تھا جیسے میں اسے برسوں سے جانتا ہوں۔ وہ میرے لیے اجنبی نہیں ہے۔ نہ جانے کیوں میرے دل میں اس کے لیے اپنائیت کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا جیسے وہ میری اپنی ہو، جیسے اس کے سارے دکھ سکھ مجھے معلوم ہوں، جیسے میں اسکے دکھوں میں برابر کا شریک ہوں اور جیسے میں اس کے عشق میں مبتلا ہوں۔ بالکل روائتی عاشقوں کی طرح جو اپنے محبوب کی ایک ادا پر جان نثار کر دیتے ہیں۔ عشق کی پاکیزگی جن کے دلوں سے ہوس کو مٹا دیتی ہے، جن کی زندگی کا مقصد صرف عشق اور عشق ہوتا ہے، جو سراپا تسلیم و رضا ہوتے ہیں، جو صرف عشق کرنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں، مٹنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں اور فنا ہو جانے کے لیے زندہ رہتے ہیں۔

میری محویت پھر ٹوٹ گئی۔ وہ مجھ سے ہم کلام تھی۔ "میں آج تمہیں صرف یہ اطلاع دینے آئیں ہوں کہ کل اسی وقت پھر آؤں گی تمہیں کل میرے ساتھ چلنا ہو گا۔"

کہاں چلنا ہو گا؟ یہ اس نے نہیں بتایا۔ پھر وہ بہار کا جھونکا اس طرح گذر گیا کہ میں دیر تک اس کی خوشبو کی آہٹیں اپنے در دل پر محسوس کرتا رہا۔

پھر دوسری شب آئی اور مجھے اس غارت گر ہوش کا نام معلوم ہوا۔ اس کا نام ناہید تھا۔ وہ تحریک آزادی کی ایک اہم رکن تھی۔ اسی کے ساتھ میں، مجاہدین کی خفیہ تنظیم کے اڈے پر پہنچا۔ وہاں میری ملاقات مجاہدین کے امیر سے ہوئی۔ اس کا اصل نام جو کچھ بھی رہا ہو لیکن تنظیم کے لوگ اسے امیر عبدالرحمٰن کے نام سے پکارتے تھے۔ دراصل تنظیم کے ہر فرد کا ایک فرضی نام بھی تھا۔ آپس میں وہ لوگ ایک دوسرے کو انہیں فرضی ناموں سے پکارتے تھے۔ ناہید کا فرضی نام ملکہ تھا۔ میرا نام ظل الرحمٰن رکھا گیا۔ میں نے اس خفیہ اڈے میں اپنے خون سے ایک عہد نامے پر دستخط کیے۔ اس طرح میں نے خدا کو حاضر و ناظر جان کر یہ عہدہ کیا کہ ہمیشہ تنظیم کا وفادار رہوں گا۔

مجاہدین کی تنظیم پورے ملک میں پھیلی ہوئی تھی۔ بعض اہم شہروں میں اس کی سرگرمیاں بڑے جوش و خروش سے جاری تھیں۔ صوبہ و سرحد میں تنظیم کا امیر بابو جان تھا۔ مجھے تنظیم ہی کے ایک کام کے سلسلے میں سرحد پار جاکر اس سے ملاقات کرنا پڑی۔ صوبہ سرحد میں "ملکا" ایک چھوٹی سے جگہ تھی۔ ملکا کی بیشتر آبادی' تنظیم میں شامل تھی۔ میرے بعد ناہید بھی ایک کام سے وہاں پہنچ گئی۔ اس کی آمد سے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری روح کا کوئی خلا پر ہو گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ لڑکی ناہید میرے دل و دماغ پر چھا گئی تھی۔ ناہید کا معاملہ ان تمام لڑکیوں سے مختلف تھا جن سے اب تک میرے تعلقات رہ چکے تھے۔ میں غالباً" ناہید سے سچی محبت کرنے لگا تھا' لیکن اس کے رعب حُسن کے باعث مجھے یہ ہمت نہ ہو سکی کہ اپنا دل چیر کر اس کے حضور میں پیش کر دوں۔

دوسری طرف جبّار' انگریزوں سے ملا ہوا تھا۔ وہ ضمیر فروش اپنے ہمزاد کی طاقت کام میں لال کر مجاہدین کو نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہا تھا۔

ایک روز جب میں اور ناہید ایک چٹان پر بیٹھے ہوئے تنظیم کی سرگرمیوں کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے تو میرا ہمزاد ظاہر ہوا۔ اس نے بتایا کہ جبّار کے ہمزاد نے انگریزوں کو تمام تر صورت حال سے آگاہ کر دیا ہے۔ ہندوستان کے گورنر جنرل اور وائسرائے لارڈ ایلیجن جو اطلاع دے دی گئی ہے کہ ملکا میں انگریزوں کے خلاف جنگی تیاریاں پورے زور شور سے جاری ہیں۔ وائسرائے نے یہ اطلاع پا کر انگیرز فوجوں کو ملکا پر زبردست حملے کا حکم دے دیا تھا۔ عنقریب انگریز فوجیں' ملکا پر حملہ کرنے والی ہیں۔ ہمزاد سے یہ خبر پا کر میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے ملکا کی پوری آبادی خون میں ڈوب چکی ہو۔

مجھے بدحواس دیکھ کر ناہید بھی گھبرا گئی۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ کوئی اہم خبر آئی ہے جس سے میں سراسیمہ ہو گیا ہوں۔ بہ مشکل میں نے ناہید کو حالات سے آگاہ کیا۔ وہ سانس روکے میری ایک ایک بات کو توجہ سے سنتی رہی۔ میں بات ختم کر چکا تھا مگر ابھی تک وہ گم صم بیٹھی تھی جیسے وہ بھی اس پاس بکھری ہوئی چٹانوں کا ایک حصّہ ہو۔ پھر ایک دم وہ تیزی سے اٹھی جیسے اس نے زندگی لوٹ آئی ہو۔ میں نے دیکھا کہ لحہ بہ لحہ اس کا چہرہ سرخ ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی مٹھیاں بھینچی ہوئی تھیں۔ معاً" میں نے اس کی آواز سنی' بالکل بدلی ہوئی سی آواز! اس آواز میں طوفان ایسا جوش خروش تھا۔ "ہم اپنے خون کے آخری قطرے تک انگریزوں کا مقابلہ کریں گے شیخ!" اس کی آواز بلند اور تیز تھی۔ "تم دیکھو گے شیخ کہ ہمارا لہو ہماری ایڑیوں پر نہیں' ہمارے پنجوں پر گرے گا!" اس نے مضبوطی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ "ہمیں وقت ضائع

نہیں کرنا چاہئے۔ ہمیں اسی وقت یہ اطلاع امیر تک پہنچا دینا چاہئے۔"

پھر ہم دونوں' مجاہدین کے امیر بابو جان کو یہ اطلاع دینے پہنچے۔ بابو جان اپنی قیام گاہ پر نہیں تھے۔ ناہید انہیں ڈھونڈنے چلی گئی۔ میں وہیں رک گیا۔ اسی وقت مجھے ہمزاد کی آواز سنائی دی۔ وہ مجھ سے رخصت ہونے کی اجازت طلب کر رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ وائسرائے لارڈ ایلیجن نے یہ احکام صادر کیے ہیں کہ انگریز افسران' جبّار کو لے کر فوراً" اس کے پاس پہنچیں۔ دراصل لارڈ ایلیجن چاہتا تھا کہ وہ اپنے مخصوص انداز فکر کے مطابق جبّار کی پُراسرار قوتوں کو مجاہدین کے خلاف استعمال کرے۔ اس موقع پر ضروری تھا کہ میر [illegible] کہ اس اہم معاملے میں اُلجھا ہوا تھا اس لیے چاہتا تھا کہ میں چھوٹے موٹے مسائل کے سلسلے میں اسے طلب نہ کروں۔ اگر کبھی اسے خود یہ محسوس ہوا کہ میں کسی بہت بڑے خطرے سے دوچار ہو گیا ہوں تو وہ خود ہی میری مدد کو پہنچ جائے گا۔

میں نے بہ رضا و رغبت ہمزاد کو جانے کی اجازت دے دی کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ ہمزاد کے جاتے ہی تنظیم کا ایک فرد قائم خان' ملکہ کو ڈھونڈتا ہوا وہاں آ پہنچا۔ قائم خان' تنظیم کا ایک اہم رکن تھا' مگر مجھے اس سے کچھ چڑ سی ہو گئی تھی کیوں کہ وہ ناہید میں بے حد دلچسپی لیتا تھا۔ ناہید بھی مجھ سے کئی بار اس کی بہادری کی تعریف کر چکی تھی۔ اپنی محبوبہ سے کسی اور کا ذکر کوئی بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ پھر بھلا میں کیسے یہ بات قبول کر لیتا! اس نے مجھ سے ناہید کے بارے میں پوچھا تو میں نے خشک لہجے میں جواب دیا کہ ناہید' امیر بابو جان کی تلاش میں گئی ہے۔

اس پر قائم خان نے مجھے بتایا کہ میری بابو جان اور تنظیم کے تمام سالار' اس وقت مولوی شریف اللہ کے مکان پر جمع ہیں اور کسی اہم معاملے پر صلاح مشورہ کیا جا رہا ہے۔ قائم خان نے خیال ظاہر کیا کہ اب تک ناہید امیر بابو جان کی تلاش میں وہاں پہنچ چکی ہو گی۔ قائم خان نے مجھ سے بھی وہیں چلنے کو کہا۔

میں' قائم خان کے ساتھ مولوی شریف اللہ کے مکان پر پہنچ گیا ناہید وہاں موجود تھی۔ مجھے وہاں جا کر یہ معلوم ہوا کہ دراصل امیر بابو جان کو تنظیم کے جاسوسوں کے ذریعے اس بات کی اطلاع مل چکی تھی کہ انگریز فوجوں کی پُراسرار نقل و حرکت شروع ہو گئی ہے۔ وہ یہ اندازہ لگانا چاہتے تھے کہ آخر اس کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟

اس موقع پر میں اٹھ کھڑا ہوا کیوں کہ ان کے سوال کا جواب میرے پاس موجود تھا۔ سب نے میری طرف حیرت سے دیکھا۔ پھر مجھے ہمزاد کے ذریعے جو کچھ معلوم ہوا تھا' میں نے

تفصیل کے ساتھ انھیں بتا دیا۔ وہ سب سناٹے میں آ گئے۔ فیصلہ ہوا کہ فوری طور شہزادہ مبارک شاہ کو اس صورت حال سے آگاہ کر دیا جائے۔ پیغامبری کا یہ فرض ناہید اور قائم شاہ کے سپرد کیا گیا تو میرے دل میں جلن سی ہونے لگی۔ دراصل میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ ان دونوں کو تنہائی کا موقع ملے۔ میں نے امیر بابو جان سے ان دونوں کے ساتھ جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ انہوں نے مجھے اجازت دے دی۔ تین گھوڑے کچھ ہی دیر بعد ستھانہ کی طرف روانہ ہو گئے جہاں شہزادہ مبارک شاہ تھا۔

مجھے گھڑ سواری سیکھے ہوئے ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے تھے، لیکن اپنے گھوڑے کو ان کے ساتھ برق رفتاری سے دوڑاتا رہا۔ میں کسی طرح بھی ان دونوں سے پیچھے رہنا مناسب نہیں سمجھ رہا تھا۔ میری یہی کوشش مصیبت کا پیش خیمہ بن گئی۔ میری کسی بے تکی حرکت سے گھوڑا بدک گیا اور میں اسے قابو نہ کر سکا۔ وہ اس بلا رفتاری سے دوڑا کہ ناہید اور قائم خان کے گھوڑے بہت پیچھے رہ گئے۔ میرا گھوڑا دوڑتا ہوا کسی دیوانے کی طرح انگریزوں کی حدود میں داخل ہو گیا۔ پھر وہاں مجھے گھیر کر حراست میں لے لیا گیا۔

انگریز کو یقین تھا کہ میرا تعلق باغیوں ہی سے ہو گا۔ اس نے مجھ سے معلومات حاصل کرنے کے لیے تشدد کا روح فرسا کھیل شروع کر دیا۔ مجھ پر کوڑے برسائے گئے اور سوالات کی بوچھاڑ کر دی گئی، لیکن میں نے تو جیسے اپنے ہونٹ سی لیے تھے۔

اس موقع پر میں نے دانستہ اپنے ہمزاد کو نہیں بلایا، یہ سوچ کر کہ اس وقت وہ نہ جانے کتنے اہم معاملے سے نمٹ رہا ہو۔ میں نے چوبیس گھنٹے بڑی اذیت میں گزارے۔

اگلی رات کو جب میں خیمے کی ننگی زمین پر نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑا ہوا تھا تو اچانک ساری فضا بندوقوں کے دھماکوں سے گونج اٹھی۔ مجاہدین نے انگریزی کیمپ پر شب خون مارا تھا۔ مجاہدین کے اس حملے اور دستے میں ناہید اور قائم خان بھی تھے۔ وہ دونوں مجھے وہاں سے نکال لے گئے۔ امیر بابو جان کے مکان پر لے جا کر میری مرہم پٹی کی گئی۔ ناہید نے مجھے بتایا کہ غنودگی کے عالم میں اس نے میری آواز سنی تھی۔ میں نے ہی اسے بتایا تھا کہ قریبی انگریزی کیمپ پر شب خون مارنا ضروری ہے۔

میں سمجھ گیا کہ وہ ہمزاد کی آواز ہو گی۔ اس نے مجھے انگریزوں کی قید سے نکالنے کے لیے ایسا کیا تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ صورت حال ایسی تھی کہ ہمزاد براہ راست میری مدد کے لیے نہیں آ سکتا تھا۔

کچھ ہی دن میں ناہید کی نگہداشت میں میرے زخم تیزی سے مندمل ہو گئے۔ اس

دوران میں انگریزی فوج کی سرگرمیوں کے بارے میں خوف ناک اطلاعات ملتی رہیں۔ مجاہدین بھی تیاری میں مشغول تھے۔ چھوٹی موٹی جھڑپیں بھی جاری تھیں اور ایک آدھ بڑی جھڑپ بھی ہو چکی تھی۔ انگریزی فوجوں کی قیادت جنرل چیمبرلین کر رہا تھا۔ وہ سفاک اور مسلم دشمن شخص تھا۔ ایک جنگ میں چند مجاہدین اس کے ہاتھ لگ گئے تو اس نے خود انہیں بڑی خوف ناک اذیتیں دے کر ہلاک کیا۔

ناہید اس اطلاع پر چراغ پا ہو گئی۔ اس نے قسم کھائی کہ وہ اپنے ساتھیوں کا انتقام ضرور لے گی۔ میں اب پوری طرح صحت یاب ہو چکا تھا اس لیے موجودہ مہم میں اس کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گیا۔ ناہید نے امیر بابو جان کو کچھ نہیں بتایا اور مجھے لے کر اس پہاڑی مورچے کی طرف روانہ ہو گئی جہاں ہمارے جاسوسوں کی اطلاعات کے مطابق جنرل چیمبرلین کا خیمہ لگا ہوا تھا۔ انگریز جنرل کا خیمہ ایک ایسی چٹان پر تھا جو چاروں طرف سے ڈھلوان اور کھردری تھی۔ رات کی تاریکی میں اس چٹان پر چڑھتے ہوئے خاصی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا کیوں کہ میری ایک ٹانگ بھی بیکار تھی۔ مہ پارہ سے مقابلے کے دوران میں مجھے جسمانی طور پر یہ نقصان برداشت کرنا پڑا تھا۔ اس کے باوجود بھی میں جوش کے عالم میں ناہید کے ساتھ چٹان پر چڑھتا رہا، لیکن برا ہو بد قسمتی کا کہ ایک پتھر اپنی جگہ سے سرک گیا جسے پکڑ کر میں اوپر چڑھ رہا تھا۔ پتھر کے سرکتے ہی میں اپنا جسمانی توازن کھو بیٹھا۔ میرے منہ سے غیر ارادی طور پر چیخ نکل گئی۔ پھر میں پتھروں سے ٹکراتا ہوا تیزی سے کھردری چٹان پر لڑھکنے لگا۔

مجھے ہوش آیا تو صبح کا اجالا پھیل چکا تھا اور میں ایک غار کی پتھریلی زمین پر پڑا ہوا تھا۔ پہلے تو مجھے حیرت ہوئی کہ اس غار میں کیسے آ گیا، لیکن پھر یہ بات ذہن میں آ گئی کہ ہمزاد کے سوا کسی اور کا کام نہیں ہو سکتا۔ وہی مجھے یہاں لایا ہو گا اور انگریزوں کی قید میں نہ جانے دیا ہو گا۔ ظاہر ہے کہ میری چیخ سن کر انگریز فوجی دوڑ پڑے ہوں گے۔ خدا جانے ناہید پر کیا گزری ہو؟ اس خیال نے مجھے بے چین کر دیا اور میں ناہید کے بارے میں جاننے کے لیے مضطرب ہو گیا۔ پھر بھی میں نے ہمزاد کو طلب نہیں کیا اور اپنے تصوّر کی قوت آزمائی۔ آنکھیں بند کرتے ہی میں نے ناہید کا تصوّر کیا اور ناہید کا چہرہ میرے سامنے آ گیا۔ وہ کچھ ایسے حالات میں گرفتار تھی کہ میرا خون کھول اٹھا۔ اس کے جسم پر چیتھڑے جھول رہے تھے جو ستر پوشی کے لیے کافی نہیں تھے اور جبّار اسے ہوس ناک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ان دونوں کے قریب ہی ایک انگریز فوجی افسر بھی موجود تھا۔ فوجی افسر، جبّار سے کہہ رہا تھا کہ اس لڑکی کی زبان کھلوانے کے لیے اس پر تشدّد کیا جائے۔ انگریز جنرل چیمبرلین کے خیمے تک پہنچنے کی کوشش کا مطلب بھی نے

سمجھ لیا تھا۔

"یہ ابھی سب کچھ بتا دے گی، مگر اس کے لیے تنہائی ضروری ہے۔" جبّار نے انگریز افسر سے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے۔" انگریز فوجی افسر نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر خیمے سے باہر نکل گیا۔

اس کے جاتے ہی جبار لپک کر ناہید کے پاس پہنچا اور دست درازی شروع کر دی۔ ناہید کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور اس نے جبار کے منہ پر تھوک دیا۔ وہ رسیوں کی گرفت میں تھی اس لیے کچھ اور اس کے بس میں نہ تھا۔ میرے لیے بھی یہ سب کچھ ناقابل برداشت تھا۔ میں نے آنکھیں کھول کر فوراً اپنے ہمزاد کو پکارا۔

ہمزاد حاضر ہو گیا تو میں نے اسے حکم دیا۔ "بلا تاخیر ناہید کو جبار کے چنگل سے نکال لاؤ!"

میرا ہمزاد فوراً انگریزوں کے کیمپ میں جا پہنچا اور پھر وہ جبّار کو بے ہوش کر کے ناہید کو وہاں سے اٹھا لایا۔ ناہید کو بھی اس نے بے ہوش کر دینا مناسب سمجھا تھا۔

"ناہید کے ہوش میں آنے سے پہلے ہی تم ہم دونوں کو ملکا پہنچا دو۔" میں نے اپنے ہمزاد کو دوسرا حکم دیا۔ ہمزاد نے اس حکم کی تعمیل میں دیر نہ کی۔

پھر ناہید ہوش میں آئی تو ہم ملکا پہنچ چکے تھے۔ میں نے ناہید کو بتایا کہ تمہیں جبّار کے چنگل سے نکالنے کے لیے مجھے اپنی پُراسرار قوتیں استعمال کرنا پڑی تھیں۔

امیر بابو جان نے تمام حالات و واقعات جاننے کے بعد ناہید کو سخت سست کہا اس لیے کہ وہ ان کی اجازت کے بغیر اتنی خطرناک مہم پر روانہ ہو گئی تھی۔

ناہید نے امیر سے معافی مانگ لی کہ یہ قدم جذباتی تھا اور جذبات میں عقل گم ہو جاتی ہے۔ جب امیر بابو جان کمرے سے چلے گئے تو ہم دونوں آپس میں باتیں کرنے لگے۔ رہ رہ کر میری آنکھوں میں وہ منظر گھوم رہا تھا جب میں نے ناہید کو جبّار کے سامنے بے بس دیکھا تھا۔ اس وقت ناہید کے جسم پر چیتھڑے جھول رہے تھے، وہی منظر مجھے یاد آ رہا تھا، مجھے جھنجھوڑ رہا تھا۔ میرے اندر کا شیطان جاگنے لگا تھا۔ ناہید کے حسن کا تقدّس اس منظر نے پامال کر دیا تھا۔ پرانے شیخ کرامت کی شیطانی روح جیسے ایک طویل نیند سے بیدار ہو رہی تھی۔

میں نے اسی عالم کیف میں دو ایک ایسی حرکتیں کیں کہ ناہید کو مجھ پر غصّہ آ گیا۔ وہ کمرے سے چلی گئی۔ غنیمت یہ ہوا کہ اس نے میری ان باتوں کا تذکرہ امیر بابو جان سے نہیں کیا۔ میں اب ناہید کو حاصل کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ وہ دن میں نے بڑی بے چینی سے گزارا۔

تنظیم کے ارکان مجھ سے ملنے کے لیے آتے جاتے رہے، لیکن ناہید پھر نہ آئی۔

رات کو ناہید، امیر بابو جان کے ساتھ میرے کمرے میں آئی اور پھر مجھ سے مخاطب ہوئے بغیر اپنے بستر پر دراز ہو گئی۔ امیر بابو جان بھی عشاء کی نماز پڑھ کر اپنے بستر پر لیٹ گئے۔ ہم تینوں ایک ہی کمرے میں سوتے تھے۔

جب مجھے یقین ہو گیا کہ امیر بابو جان گہری نیند سو گئے ہیں تو میں نے اپنے ہمزاد کو طلب کیا میں نے اسے حکم دیا کہ وہ ناہید کو بے ہوش کر دے۔ میں جانتا تھا کہ وہ مغرور سرکش لڑکی بہ قید ہوش و حواس کبھی مجھے قریب نہیں آنے دے گی۔ جب ہمزاد نے اسے بے ہوش کر دیا تو میں چپکے سے اس کے بستر کی طرف بڑھ گیا۔

پھر میں اپنے بستر پر لیٹا تھا کہ اچانک فضا دھمکوں سے گونج اٹھی۔ امیر بابو جان نے آنکھ کھلتے ہی لالٹین کی لو تیز کر دی۔ جب ان کی نظر مجھ پر پڑی اور بے ہوش ناہید پر پڑی تو وہ جیسے سکتے میں رہ گئے۔ ان کے تصوّر میں نہیں آ سکتا تھا کہ وہ کوئی ایسا منظر دیکھیں گے۔

دفعتہً ایک شخص یہ چیختا ہوا کمرے میں داخل ہوا کہ انگریزوں نے حملہ کر دیا۔

وہ شخص قائم خان تھا۔ میں نہایت تیزی سے اٹھا اور اپنی بیساکھیاں اٹھا کر کھڑکی کے راستے اس مکان کے پچھواڑے کود گیا۔

اسی وقت امیر بابو جان کی کڑکتی ہوئی آواز سنائی۔ "اسے پکڑو!"

میں اپنی بیساکھیاں ٹیکتا ہوا تیزی سے ایک طرف بھاگ نکلا۔ قائم خان میرے تعاقب میں آ رہا تھا۔ میری مشکل یہ تھی کہ میں اپنی موجودہ حالت میں ہمزاد کو اپنی مدد کے لیے نہیں بلا سکتا تھا۔ میری منزل اسی لیے ایک قریبی چشمہ تھی۔ میں کسے نہ کسی طرح اپنی جان پر کھیل کر قائم خان کے ہاتھ لگے بغیر اس چشمے تک پہنچ گیا اور فوراً پانی میں چھلانگ لگا دی۔ اب میں اس قابل ہو گیا تھا کہ ہمزاد کو طلب کر سکوں۔

پھر اس سے پہلے کہ قائم خان مجھ پر گولی چلاتا، ہمزاد نے میرے حکم پر اس کے ہاتھ سے بندوق چھین لی، پھر اسے بے ہوش کر دیا۔ پھر وہ فوراً ہی مجھے وہاں سے لے اڑا۔

دھماکے اب زیادہ زور و شور سے سنائی دینے لگے تھے۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ انگریزوں میں اور مجاہدین میں باقاعدہ ٹھن گئی تھی۔

ہمزاد نے مجھے ایک غار میں پہنچا دیا اور بتایا کہ یہ علاقہ انگریزی حدود میں ہے۔ میں نڈھال ہو چکا تھا اس لیے فوراً ہی لیٹ گیا۔ میں جانتا تھا کہ ناہید کے واقعے کے بعد اب امیر مجاہدین کے درمیان واپس جانا، ممکن نہیں رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ اچانک ہی اب ان لوگوں سے

میری دلچسپی ختم ہو گئی تھی۔ اب میں صرف جبّار سے انتقام لینا چاہتا تھا جس کی وجہ سے میں مہ پارہ کو حاصل نہیں کر سکا تھا۔ اسی کی وجہ سے مجھے اتنی پریشانیاں اٹھانا پڑی تھیں۔

میں نے جب اپنے اس خیال کا اظہار اپنے ہمزاد سے کیا تو اس نے بھی میری تائید کی اور کہا۔ "آپ قطعی صحیح سوچ رہے ہیں۔ میں نے تو آپ سے پہلے بھی کہا تھا۔ کئی موقع بھی ایسے آئے تھے کہ اسے آسانی سے ختم کیا جا سکتا تھا، مگر آپ نے خود ہی وہ مواقع کھو دیے۔"

اب کوئی ایسا موقع نظرانداز نہیں کیا جائے گا۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

اس رات میں ایک عرصے کے بعد بہت سکون کی نیند سویا۔ ہمزاد کو میں نے اپنی حفاظت کے خیال سے رخصت نہیں کیا تھا۔ وہ بھی میرے ساتھ اسی غار میں تھا۔ گذشتہ تجربوں نے مجھے اتنا سبق تو دے ہی دیا تھا کہ دشمن کو بھی کمزور نہیں سمجھنا چاہیے۔ جس طرح میں، جبّار کے بارے میں منتقمانہ منصوبے بنا رہا تھا، ممکن تھا کہ وہ بھی مجھے زک دینے کا موقع ڈھونڈ رہا ہو۔ بہر حال میں، ہمزاد کی موجودگی میں ہر قسم کے خطرے سے بے نیاز تھا۔

بہت دن بعد بے فکری کی نیند آئی تھی۔ اگر ہمزاد مجھے بیدار نہ کرتا تو میں نہ جانے کب تک اور کتنی دیر سوتا رہتا۔ وقتی طور پر جاگ اٹھنے سے کچھ جھنجلاہٹ ہوئی، مگر یہ سوچ کر میں چپ رہا کہ ہمزاد نے مجھے بے سبب نہ جگایا ہو گا۔ میں سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"ایک اور خطرہ آپ کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے۔" ہمزاد نے میری سوالیہ نظروں کے جواب میں کہا۔ "اس خطرے سے قبل از وقت آپ کو آگاہ کرنا میرا فرض ہے۔ میں نے اسی لیے آپ کو بیدار کیا ہے۔"

پھر میرے استفسار پر ہمزاد نے مجھے اس خطرے کی نوعیت سے آگاہ کیا تو کچھ دیر کو میں متفکر ہو گیا۔ اس خطرے کا سدباب ضروری تھا۔

ہمزاد سے مجھے معلوم ہوا کہ میرے فرار ہونے کے بعد ناہید کو ہوش میں لانے کی بہت کوشش کی گئی، لیکن رات کو وہ ہوش میں نہ آ سکی۔ وہ ہوش میں آتی بھی کیسے جب کہ ہمزاد نے اسے صبح تک کے لیے بے ہوش کیا تھا۔ صبح ہوش میں آ کر جب اسے اپنی حالت کا اندازہ ہوا اور یہ معلوم ہوا کہ گذشتہ رات میں نے اس کے ساتھ کیا ستم ڈھائے ہیں تو وہ شدت جذبات اور غصے کی انتہا میں تقریباً نیم پاگل سی ہو گئی۔ تنظیم کے تمام ہی افراد کو میرے فرار اور ناہید کے ساتھ زیادتی کا علم ہو چکا تھا۔ ناہید کی حالت دیکھ کر ان کا خون کھول اٹھا۔ انگریزوں سے برسرپیکار ہونے کے باوجود انہوں نے اپنے چند خاص اور خطرناک آدمی مجھے تلاش کرنے

کے لیے آس پاس کے علاقوں میں بھیج دیے۔ وہ لوگ اب تک مجھے تلاش کر رہے تھے۔ انہیں امیر بابو جان نے حکم دیا تھا کہ مجھے دیکھتے ہی گولی مار دیں۔

تنظیم کے ان افراد کا مجھ تک پہنچنا اول تو ناممکن تھا، اگر وہ کسی طرح مجھ تک پہنچ بھی جاتے تو ہمزاد کی موجودگی میں میرا کچھ نہ بگاڑ پاتے۔ اصل خطرہ اس سے مختلف تھا۔ وہ خطرہ یہ تھا کہ امیر بابو جان نے میری تلاش اور میری پُراسرار قوتوں سے نمٹنے کے لیے ایک تارک الدنیا بزرگ کی خدمات حاصل کر لی تھیں۔ وہ تارک الدنیا شخص، ملاکا ہی کی قریبی پہاڑیوں میں سکونت پذیر تھا۔ ہمزاد نے مجھے بتایا کہ اس شخص کے پاس کچھ ایسی قوتیں ہیں جن کے ذریعے نہ صرف وہ میرا سراغ لگا سکتا ہے بلکہ چاہے تو تنظیم کے افراد کی معاونت کر کے میرے لیے مشکلات بھی کھڑی کر سکتا ہے۔

میرا ہمزاد اس شخص سے ٹکراتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ میں نے ہمزاد سے کچھ ایسا بندوبست کرنے کو کہا کہ جب تک جبّار کو سزا نہ دے دی جائے، ہمیں بزرگ سے نہ الجھنا پڑے۔

میرے لیے کھانے کا بندوبست کرنے کے بعد ہمزاد، ملاکا روانہ ہو گیا تاکہ تارک الدنیا بزرگ کی قوتوں کا اندازہ لگا سکے۔ شام کو وہ لوٹ آیا اور اس نے بتایا کہ بزرگ نے چالیس گھنٹے کا ایک چلہ کھینچ رکھا ہے۔ چلہ پورا ہونے کے بعد وہ امیر بابو جان کو نہ صرف آپ کے بارے میں تفصیل سے سب کچھ بتا دے گا بلکہ بہ ذات خود مقابلے پر آ جائے گا۔

اس چلہ کشی کی وجہ سے بہر حال دو راتوں کی مہلت مل گئی تھی اور میں اس عرصے میں ہمزاد کے ذریعے جبّار سے نمٹ سکتا تھا۔ پھر مجھے یہ موقع اسی رات مل گیا۔ جبّار جاگ جاگ کر تھک چکا تھا کیوں کہ اسے میری طرف سے اسے خطرہ لاحق تھا۔ اسے یہ گمان تھا کہ میں سوتے میں اس پر حملہ کر دوں گا۔ اس نے اپنے ہمزاد سے نجات پانے کے لیے ایک خوب صورت سہارا ڈھونڈ لیا۔ اس عالم میں وہ اپنے ہمزاد کو طلب نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اس موقع سے پورا فائدہ اٹھایا۔ میں نے اپنے ہمزاد سے جبّار کو اٹھوا لیا۔

جبّار اس ویرانے میں پہنچ کر گھبرا گیا۔ اب وہ بے سپر تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں پہنچ گیا ہے! لیکن جب اس نے میری آواز سنی تو سمجھ گیا کہ انجام قریب ہے۔ وہ بہت رویا، بہت گڑگڑایا، لیکن مجھے اس پر رحم نہ آیا۔ میرے اشارے پر ہمزاد نے اسے ایک اونچی چٹان سے نیچے گرا دیا۔ اس پر پتھر برسائے گئے۔ سخت کھردرے پتھریلے راستوں پر اس کے لہولہان جسم کو گھسیٹا گیا۔ پہاڑیاں اس کی دل دوز چیخوں سے گونجتی رہیں۔ رات پھر اسے

سخت عذابوں سے گزرنا پڑا۔ دن گزرنے کے بعد رات کو پھر ہی خوف ناک کھیل دہرایا گیا۔ پھر میں نے جان بہ لب جبّار کو ایک دور دراز مقام پر پھنکوا دیا۔ میرے انتقام کی آگ سرد ہو چکی تھی، لیکن اب میں خود کو بہت تھکا ہوا اور نڈھال محسوس کر رہا تھا۔ آخر میں سو گیا، لیکن مجھے زیادہ دیر سونا نصیب نہ ہوا۔

اچانک میری آنکھ کھلی تو میں خوف سے کانپ کر رہ گیا۔ بے شمار سانپ میرے جسم کو بری طرح جکڑے ہوئے تھے اور ایک چمکیلا ہیولا میری نظروں کے سامنے تھا۔ میں اسے دیکھ کر سکتے میں رہ گیا کیوں کہ مہ پارہ تھی، مہ پارہ کی روح! اس نے مجھ سے باتیں کیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ بدنصیب ناہید کی مدد کرے گی، لیکن مجھے مرنے نہیں دے گی اور زندگی بھر اس طرح تڑپاتی رہے گی جس طرح میں دو راتوں تک جبار کو تڑپاتا رہا تھا۔ میں نے چیخ کر ہمزاد کو بلانا چاہا لیکن وہ نہیں آیا۔ مہ پارہ نے بتایا کہ اس کی روح کی حیرت انگیز قوتوں کے مقابل آنا ہمزاد کے بس کی بات نہیں۔ مہ پارہ مجھے دھمکیاں دے کر چلی گئی اور وہ سانپ بھی میرے جسم سے الگ ہو کر نہ جانے کہاں غائب ہو گئے!

مہ پارہ کی روح کے جاتے ہی ہمزاد میرے پاس آ گیا۔ اس نے مجھے تسلّی تشفّی دی اور کہا کہ کسی نہ کسی طرح مہ پارہ کی روح سے نمٹ لیا جائے گا۔

اگلے روز میں، ہمزاد کی مدد سے ایک اور غار میں منتقل ہو گیا، لیکن اس سے مجھے کوئی فائدہ نہ پہنچ سکا۔ مہ پارہ اور اور تارک الدنیا بزرگ کی قوتیں ناہید کی مدد کر رہی تھیں۔ وہ برہنہ تلوار لیے اس غار میں داخل ہوئی جہاں میرا قیام تھا۔ پھر وہ وحشیوں کی طرح مجھ پر جھپٹ پڑی۔ اس وقت مہ پارہ کی روح کا چمکیلا، روشن ہیولا بھی غار میں موجود تھا۔

ناہید کی تلوار کا پہلا وار میں نے بیساکھی پر روک تو لیا مگر ضرب اتنی شدید تھی کہ بیساکھی میرے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری۔ تلوار پھر چلی۔ میں اس خون خوار لڑکی کے سامنے خود کو قطعی بے بس محسوس کر رہا تھا جو مجھ سے انتقام لے رہی تھی۔ مہ پارہ کی روح وہاں موجود تھی اس لیے میرا ہمزاد بھی میری مدد کو نہیں آ سکتا تھا۔

موت سامنے نظر آ رہی ہو تو آدمی کی قوت مدافعت بڑھ جاتی ہے میں نے وہ خطرناک وار بھی ایک طرف لڑھک کر رائگاں کر دیا، مگر ناہید کے جسم میں بجلیاں سی کوند رہی تھیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں اس وقت خود کو بہت ہراساں اور خوف زدہ محسوس کیا، لیکن ایک ٹانگ سے معذور ہونے کے باوجود میں نے جس پھرتی اور مستعدی کا ثبوت دے رہا تھا، وہ یقیناً میری ہمت تھی ورنہ اس صورت حال سے کوئی دوسرا شخص دوچار ہوتا تو کبھی کا ہاتھ پیر چھوڑ

چکا ہوتا۔ موت کے خوف نے میرے سارے حواس بیدار کر دیے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ میں، ناہید کے ایک زبردست وار سے بچنے کے لیے تیزی سے ایک طرف سرکا تھا، لیکن میرا دایاں بازو زخمی ہوئے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ میں نے زخمی ہو کر ایک بار پھر سنبھلنا چاہا اور میں اسی کشمکش میں ایک بار اٹھ کر منہ کے بل گرا۔ میں اس غار کی دیوار میں ابھرے ہوئے ایک پتھر سے ٹکرایا۔ ممکن ہے کہ میں کہنیوں کے بل اٹھنے کی کوشش میں کامیاب ہو جاتا مگر اس وقت مہ پارہ کے زہریلے قہقہے نے میری ساری توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔ غفلت کے یہ صرف چند لمحے تھے اور انہیں لمحوں میں مجھ پر قیامت گذر گئی۔ تلوار کے ایک بھرپور وار نے میری گردن اڑا دی تھی۔

اس لمحے جب میں نے تلوار کی ضرب اپنی گردن پر محسوس کی تھی تو سوچا تھا کہ مہ پارہ اپنے عہد سے پھر گئی ہے اور میں قتل کر دیا گیا ہوں۔ میرے لیے موت کا یہ دوسرا تجربہ تھا۔ میں ایک بار بدایوں میں بھی موت کے اس تجربے سے گذر چکا تھا جب میرٹھ کے نواب صاحب کے غنڈوں نے مجھے قتل کر دیا تھا۔ تکلیف و اذیت کی انتہا نے مجھے زیادہ نہ سوچنے دیا اور میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ میرا آخری احساس یہ تھا کہ میں موت سے ہم کنار ہو رہا ہوں۔

تیز ہواؤں کی سنسناہٹ گھرا اندھیرا اور میرا متحرک وجود مجھے بہت دیر تک یاد ہی نہ آ سکا کہ میں کون ہوں! اور کہاں جا رہا ہوں! پھر رفتہ رفتہ میری یادوں کے دریچے کھلنے لگے۔ مجھے قتل کر دیا گیا تھا۔ میں نے سوچا اور اس احساس کے ساتھ ہی اپنے اندر خوف کی ایک لہر محسوس کی۔ کیا فرشتے مجھے لے کر آسمانوں کی طرف جا رہے ہیں؟

ہاں ایسا ہی ہے! میرے نیم غنودہ ذہن نے جواب دیا۔ مجھے اپنی تمام زندگی کے گناہ و ثواب یاد آنے لگے۔ مجھے عالم برزخ میں رکھا جائے گا اور پھر میری روح پر عذاب مسلط کر دیے جائیں گے۔ میں نے دنیا میں رہ کر بڑی گنہگار زندگی گزاری تھی۔ عذابوں کے خوف سے میں کانپ اٹھا، مجھ پر دہشت سی طاری ہو گئی اور میرا ذہن پھر اندھیروں میں بھٹک گیا۔

ہوش آیا تو میں نے عالم برزخ کی بجائے خود کو ایک، جانے پہچانے ماحول میں پایا۔ ہمزاد مجھے بدایوں لے آیا تھا۔ میں ایک بار پھر اسی ویران خانقاہ میں تھا جہاں کبھی ایک عرصے رہا تھا۔ تاریخ اپنے آپ کو ایک بار پھر دہرا رہی تھی۔ اس مرتبہ بھی مجھے اپنے لیے ایک جسم کی ضرورت تھی۔

اس مرتبہ بھی میں نے جسم حاصل کرنے کے لیے رضیہ کو آلہ کار بنایا۔ ہمزاد نے جو

معلومات حاصل کی تھیں' ان کے مطابق رضیہ کی شادی ہونے والی تھی۔ رضیہ سے شادی کرنے والا نوجوان دراصل ایک بردہ فروش گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ گروہ رضیہ کو کہیں اور لے جا کر بیچنا چاہتا تھا۔ ان لوگوں نے کسی نہ کسی طرح رضیہ کے باپ کو بے وقوف بنا کر اسے رضیہ کی شادی پر آمادہ کر لیا تھا۔ بالآخر یہ شادی ہو بھی گئی۔ لیکن رضیہ کو پہلے ہی سے میرا ہمزاد اپنی مٹھی میں لے چکا تھا۔ شب عروسی کی مہکتی ہوئی فضا میں رضیہ نے اس نوجوان کے سر کو اس کے تن سے جدا کر دیا۔ پھر ہمزاد نے میرا سر' اس کے جسم سے جوڑ دیا۔ کسی دوسرے جسم سے میرے سر کا جڑنا اتنا اذیت ناک عمل تھا کہ میں بے ہوش ہو گیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو ہمزاد نے بتایا کہ بردہ فروش رضیہ کو اڑا لے جانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ انہوں نے رضیہ کو کلکتہ لے جا کر ایک طوائف ممتاز بائی کے ہاتھوں فروخت کر دیا ہے۔

میں نے فوری طور پر کلکتہ جانے کا فیصلہ کر لیا' مگر چالیس دن پورے ہونے سے پہلے یہ ممکن نہ ہوا۔ میرے سر کو نئے جسم سے رابطہ پیدا کرنے میں اتنا وقت بہر حال لگنا تھا۔ چالیس دن بڑے عذاب میں گزرے اور پھر میں نے غسل صحت کیا۔ اسی روز' ہمزاد کے ساتھ کلکتہ پہنچ گیا تاکہ رضیہ کو اس عذاب ناک ماحول سے نجات دلا سکوں۔ حقیقت یہ ہے کہ میرے دل میں رضیہ کی محبت پیدا ہو گئی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ اسے اور اپنے بچے کو جو ناجائز تھا' ایک شان دار زندگی سے آشنا کراؤں۔

ہمزاد نے مجھے بتایا کہ ممتاز بائی کی لاکھ کوششوں کے باوجود رضیہ اس مکروہ زندگی کو اپنانے پر تیار نہیں ہوئی تھی۔ رضیہ کو اپنی دانست میں راہ راست پر لانے کے لیے ممتاز بائی نے ایک شخص دلال بزجی کی خدمات حاصل کی تھیں۔ بزجی کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ اپنی پراسرار اور حیرت انگیز قوتوں سے کام لے کر لڑکی کو رام کر سکتا ہے میں ممتاز بائی کے کوٹھے جانے کے لیے بہو بازار ٹھیک اس وقت پہنچا جب دلال بزجی کی فٹن وہاں آ کر رکی۔

نیا جسم حاصل کرنے کے بعد خود پر میرا اعتماد بڑھ گیا تھا۔ میں نے اس لیے بہو بازار میں پہنچ کر اپنے ہمزاد کو رخصت کر دیا تھا۔ اس سے پہلے میں نے ہمزاد سے ممتاز بائی کے کوٹھے کا معلوم کر لیا تھا۔ ہمزاد نے مجھے جس عمارت کا پتا بتایا تھا' میں اسی طرف بڑھ رہا تھا۔ اسی دوران میں میر نظر دلال بزجی پر پڑی تھی۔ وہ اپنی فٹن سے اتر کر عجیب و غریب ملبوس والے نوجوانوں کے حلقے میں آگے بڑھ رہا تھا۔ یہ سوچ کر میرے تمام حواس بیدار ہو گئے کہ مجھے آئندہ جس شخص کی پُراسرار قوتوں کا سامنا کرنا ہے' وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر موجود ہے۔

دلال بزجی اپنی فٹن سے اتر کر رکا نہیں تھا۔ چاروں نوجوان اس کے گرد حلقہ بنائے اسے لیے ایک طرف بڑھ رہے تھے۔ پیادہ رو پر بھیڑ تو پہلے ہی کافی تھی' لیکن اب اس میں کچھ اضافہ ہو گیا تھا۔ اسی بھیڑ کے درمیان سے دلال بزجی اور اس کے ساتھی گزر رہے تھے۔ وہ عمارت ابھی دور تھی جس کی ہمزاد نے نشان دہی کی تھی۔ یہ تو میرے علم میں آ ہی چکا تھا کہ دلال بزجی کی منزل' ممتاز بائی کا کوٹھا ہے تو پھر وہ پہلے ہی فٹن سے کیوں اتر گیا اور اس نے وہاں سے پیدل جانا کیوں پسند کیا؟ میں نے اس سلسلے میں صرف اتنا قیاس کیا کہ دلال بزجی نمائش پسند شخص ہے۔

میں نے چاہا تو یہ تھا کہ دلال بزجی سے پہلے ممتاز بائی کے کوٹھے تک پہنچ جاؤں تاکہ اس کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی رضیہ کو لے اڑوں' مگر میں قبل از وقت نہیں پہنچ سکا تھا۔ دلال بزجی اور اس کے ساتھیوں کی چال میں ایک عجیب سا بہاؤ تھا۔ میں انہی کے پیچھے چل رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ زمین پر نہ چل رہے ہوں بلکہ فضا میں بہے جا رہے ہوں۔ وہ سبھی' کھڑاؤں پہنے ہوئے تھے' لیکن کھڑاؤں کی آواز نہیں آ رہی تھی۔

دلال بزجی اور میں' دونوں آگے پیچھے ممتاز بائی کے کوٹھے پر پہنچے۔ حالانکہ اس روز دلال بزجی وہاں مہمان خصوصی کی حیثیت سے مدعو تھا اور اس کی موجودگی میں ہر خاص و عام کو قدم رکھنے کی اجازت نہیں تھی تاہم مجھے داخل ہونے کی اجازت مل گئی۔ اندر پہنچ کر تھوڑی دیر بعد میں نے رضیہ کو محو رقص دیکھا۔ اس کے پاؤں سرتال سے پوری طرح ہم آہنگ تھے اور جسم قیامت خیز انداز میں لچک رہا تھا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے بجلیاں کوند رہی ہوں۔ ذرا سی دیر میں مجھے اس بات کا احساس ہو گیا کہ رضیہ کی یہ تمام حرکات لاشعوری ہیں اور وہ دلال بزجی کے اشاروں پر رقص کر رہی ہے۔ بنگال کا وہ ساحر یقیناً ایک صاحب کمال شخص تھا۔

پھر جب میں نے اپنے ہمزاد کو طلب کیا تو بزجی کو بھی احساس ہو گیا کہ میرے قبضے میں بھی کچھ پُراسرار قوتیں ہیں۔ اس نے ہوشیاری سے کام لے کر مجھے اپنی باتوں میں الجھا لیا اور اس کے گرگرے اس دوران میں عقبی دروازے سے رضیہ کو لے اڑے۔ ہمزاد وہاں بھی آڑے آیا۔ رضیہ کو ان لوگوں کے چنگل سے چھڑانے کے بعد اس نے مجھے وہیں چھوڑا اور خود رضیہ کو لے کر زکریہ اسٹریٹ فلیٹ کی جانب چل دیا جہاں میرا قیام تھا۔

ممتاز بائی کے کوٹھے سے نیچے اترتے ہی میں نے وہاں سے فرار ہونا چاہا' مگر اجنبی گلی کوچوں میں راستہ بھول گیا۔ اسی دوران میں ایک شخص میرے قریب آ کر ٹھٹک گیا اور مجھے جمیل الرحمٰن کہہ کر مخاطب کیا۔ شناسائی ظاہر کرنے کی غرض سے اس نے مجھے اپنا نام بھی بتایا۔

میں ایک پل میں سمجھ گیا کہ اس شخص کا تعلق تحریک آزادی کی خفیہ تنظیم سے ہے جس کا رکن میں بھی رہ چکا تھا۔ اس سے پیچھا چھڑانے کی واحد ترکیب یہی تھی کہ میں لاتعلقی ظاہر کروں۔ میرے انجان بننے پر وہ تذبذب کا شکار ہو گیا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں آگے بڑھتا' اس گلی میں تیز سیٹیوں کی آواز گونجنے لگی۔ تنظیم کا رکن امین اللہ ایک جانب بھاگ اٹھا' حالانکہ مجھے اب اپنی راہ لینا چاہیے تھی' مگر میں بوکھلا گیا اور خود بھی امین اللہ کے پیچھے بھاگتا چلا گیا۔ امین اللہ تو آگے جا کر غائب ہو گیا مگر مجھے فرار ہونے کی کوئی راہ نہ ملی۔ سپاہیوں نے مجھے گھیرے میں لے لیا۔ میں نے ایک مکان کے کھلے دروازے میں چھلانگ لگا دی اور بہ مشکل ان سپاہیوں کی گرفت میں آنے سے بچا جو یقیناً مجھے بھی امین اللہ کا ساتھی سمجھ رہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ میں اس مکان کی چھت پر پہنچ کر اور وہاں سے بہ آسانی دوسری چھتوں سے گزر کر فرار ہو جاؤں گا مگر ابھی میں چھت کے کنارے پہنچا ہی تھا کہ میرے پیچھے آنے والے سپاہی' مکان کا دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو گئے جسے میں بند کر آیا تھا۔ سپاہیوں نے مجھ پر فائرنگ شروع کر دی۔ اس جاں گسل مرحلے میں ہمزاد کو بھی طلب کر سکتا تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر میں نے اسے وقت طلب کر لیا تو وہ رضیہ کو منزل مقصود تک پہنچانے سے قاصر رہے گا۔ میرے طلب کرنے پر وہ رضیہ کو اس کے حال پر چھوڑ کر چلا آتا اور اس دوران بزجی کے گرگے ایک بار پھر رضیہ کو لے اڑتے۔ میں زیادہ دیر سپاہیوں سے مقابلہ نہ کر سکا اور بے ہوش ہو گیا۔

آنکھ کھلنے پر میں نے اپنے سامنے ہمزاد کو پایا۔ وہ میری طرف سے غافل نہیں رہا تھا اس لیے مجھے مصیبت میں گرفتار دیکھ کر فوراً" دوڑ پڑا مگر اس کا نتیجہ وہی نکلا جس سے میں بچنا چاہتا تھا۔ رضیہ اس کے ہاتھ سے نکل کر دلال بزجی کے ہاتھوں میں پہنچ گئی۔

میرے استفسار پر ہمزاد نے بتایا کہ دلال بزجی' رضیہ کو اپنی عبادت گاہ لے گیا ہے جہاں کوئی بھی غیر مادی وجود داخل نہیں ہو سکتا۔ میں نے وہاں جانے کی ضد کی تو ہمزاد نے مجھے کچھ غیر معمولی قوتیں عطا کیں۔ دلال بزجی کی عبادت گاہ' دریائے ہگلی کے کنارے تھی۔ ہمزاد نے مجھے وہاں پہنچا دیا۔ اس کھنڈر ایسی عمارت میں داخل ہوتے ہی مجھے رضیہ کی اعصاب شکن چیخ سنائی دی۔ میں آواز کی سمت لپکا' مگر میری راہ میں دلال بزجی کا فسوں حائل ہو گیا۔ شراب و شباب نے میرے قدم اس طرح تھام لیے کہ میں وہیں کا ہو رہا۔

پورے ایک ہفتے کی سرشاری کے بعد جب میری آنکھیں کھلیں تو میں نے رضیہ کو اپنے قدموں میں پایا۔ رضیہ کی حالت سے صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ اس پر کیا کچھ گزر چکی ہے! میں اپنی عقل اور ہوش و خرد سے بیگانہ ہو جانے پر ماتم کرتا ہوا رضیہ کو کسی لاشے کی طرح اپنے

ہاتھوں پر اٹھائے وہاں سے باہر آ گیا۔ ذکریا اسٹریٹ والے فلیٹ میں آنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ رضیہ اس وقت دلال بزجی کی پُراسرار قوتوں کے زیر اثر تھی۔ وہ اپنے اوپر کیے جانے والے ستم سے لاعلم تھی۔ اس کی سرگذشت سننے کے بعد میرا خون کھول اٹھا اور میں نے دلال بزجی سے انتقام لینے کی ٹھانی میرا ارادہ تھا کہ جس طرح اس نے میری عزّت پر حملہ کیا تھا اس طرح میں بھی اسے بے عزّت کروں۔ ہمزاد سے میرے علم میں یہ بات آئی کہ بزجی ایک دن بعد کلکتہ کے ایک بڑے ہوٹل پرنس گرانڈ میں اپنے کمالات دکھانے والا ہے۔ دلال بزجی کا ارادہ ہے کہ وہ وہاں سے رائے بہادر جسونت لال کی حسین لڑکی سروجنی کو غائب کر دے گا۔ میں نے دلال بزجی سے اس تقریب میں نمٹنے کا فیصلہ کیا۔

تقریب میں شریک ہونے کے لیے میں نے ایک نواب دلاور جنگ کی جگہ لے لی۔

جب میں گرانڈ ہوٹل پہنچا تو وہاں تحریک آزادی کے مجاہد امین اللہ کو سے دوبارہ مڈبھیڑ ہو گئی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ مجھے اچھی طرح پہچان چکا ہے اور اس بات کی تصدیق کر چکا ہے کہ میں ہی ظل الرحمن ہوں۔ امین اللہ کا اصرار تھا کہ میں یہ تقریب چھوڑ کر سیدھا اپنے فلیٹ پر پہنچوں جہاں تنظیم کے امیر عبدالرّحمٰن میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اس کی باتوں سے میں نے سمجھ لیا کہ سرحدی علاقے سے یہ اطلاع بنگال نہیں پہنچی کہ میں ایک گل کھلا کر تنظیم سے الگ ہو چکا ہوں۔ یوں بھی اب مجھے تنظیم سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی اس لیے میں نے امین اللہ ٹال دیا۔ امین اللہ نے پھر اس پر اصرار کیا کہ اگر میں امیر عبدالرّحمٰن سے نہ ملنا چاہوں تو نہ ملوں گا مگر اس ہوٹل سے چلا جاؤں۔ میں نے اس کی بات درخورہ اعتنانہ سمجھا۔ اور میں ہال میں آ بیٹھا

پروگرام شروع ہوا اور دلال بزجی بڑا پراسرار ثابت ہوا۔ اس نے پے در پے لوگوں کو حیرت انگیز کرتب دکھائے۔ اس نے جو کچھ کیا میرے لیے بھی غیر متوقع تھا۔ اسی دوران میں' میں نے فیصلہ کیا کہ اب اسے مزید کرتب بازی نہیں کرنے دوں گا اور ہمزاد کی مدد سے اس کا سارا منصوبہ چوپٹ کر دوں گا۔

تیسرا کرتب ابھی شروع نہیں ہوا تھا کہ ایک زبردست دھماکا ہوا اور اگلی نشستوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں کے جسموں کے چیتھڑے اڑ گئے۔ ان میں شہر کے معززین بھی شامل تھے اور بنگال کا انگریز گورنر بھی!

میں صرف اتنا سمجھ سکا کہ اس دھماکے کا تعلق امین اللہ سے ہے شاید اسی لیے وہ مجھے وہاں سے ہٹا دینا چاہتا تھا۔ آناً فاناً" میں وہاں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ انتظامیہ نے ہال کے سارے

دروازے بند کرا دیے۔ دھماکا ہونے کے بعد کوئی شخص بھی باہر جانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ میں نے گھبرا کر اسٹیج کی طرف دیکھا۔ دلال بزجی نہ جانے کہاں غائب ہو چکا تھا۔

میں عجیب تذبذب کا شکار تھا۔ ہال کے دروازے فوراً بند کر دیے گئے تھے اس لیے مجھے یقین تھا کہ امین اللہ بنگال کے گورنر اور اس کے حواریوں پر بم پھینکنے کے بعد فرار ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ ہر چند کہ وہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا، مگر مجھے اس کی طرف سے فکر لاحق تھی۔ حالات بالکل غیر متوقع طور پر بدل گئے تھے اور خود میرے لیے بھی فرار ہونا ایک مسئلہ تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اب ایک ایک مہمان کی تلاشی لی جائے گی اور میرے لیے اپنی شخصیت چھپانا ایک مسئلہ ہو جائے گا۔ میری جیب میں ہز ہائی نس نواب دلاور جنگ بہادر کا دعوت نامہ تھا۔ نواب دلاور جنگ جو بھی رہا ہو، اس سے اعلیٰ انگریز حکام کا واقف ہونا لازمی تھا اور تمام ہی اعلیٰ حکام وہاں موجود تھے۔

"افسران کے سوا تمام معزز برطانوی شہریوں کو یہاں سے بغیر روک ٹوک جانے کی جازت ہے۔" میں نے ایک انگریز افسر کو اسٹیج پر دیکھا جس نے یہ اعلان کیا تھا کیوں کہ اس تقریب میں انگریزوں کی بھی خاصی تعداد تھی۔ اس نے یہ الفاظ انگریزی زبان ہی میں ادا کیے تھے۔

اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ انگریزوں کو ہر قسم کے شبہے سے بالاتر سمجھا گیا تھا اور یہاں صرف ہندوستانیوں کو روکا جانے والا تھا کیوں کہ وہ ایک غلام قوم کے افراد تھے۔ میں انگریزوں کے تعصب پر کھول اٹھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے تقریباً ایک چوتھائی ہال خالی ہو گیا۔ اب ہال میں صرف انگریز افسران اور ہندوستانی باشندے رہ گئے تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ ان میں سے کسی نے انگریزوں کے اس متعصبانہ رویے پر صدائے احتجاج بلند نہیں کی تھی حالانکہ اس ہال میں جو لوگ موجود تھے، وہ معمولی حیثیت کے مالک نہیں تھے۔

اگلی صف کے ارد گرد ایک دائرے کی شکل میں انگریز افسران مستعد کھڑے تھے اور اس صف کے پیچھے والی دو صفوں کو بھی انہوں نے خالی کرا لیا تھا۔ ہال کے تمام دروازے ابھی تک بہ دستور بند تھے۔ صدر دروازے پر مسلح پہریداروں کا ہجوم تھا جن میں اکثریت انگریزوں کی تھی۔ ان کی بندوقوں کی نالیں، ہال میں موجود لوگوں کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

نہ جانے کیوں مجھے خود سے زیادہ امین اللہ کا فکر تھی۔ مجھے تو بہرحال ہمزاد کی پُراسرار قوتوں کی مدد حاصل تھی، لیکن امین اللہ قطعی بے سہارا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ امین اللہ بھی میری طرح کسی کا دعوت نامہ لے اڑا ہو گا اور جب دعوت ناموں کی جانچ پڑتال ہو گئی تو وہ بہت

آسانی کے ساتھ دھر لیا جائے گا۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ میری طرح دوسرے لوگوں نے بھی اسے اگلی صف کی طرف کوئی چیز پھینکتے ہوئے دیکھ لیا ہو۔ یہ صورت حال اور بھی خطرناک تھی۔

میں انہی خیالوں میں کھویا تھا کہ ایک دم اچھل پڑا۔ میری آنکھوں نے ایسا ہی منظر دیکھا تھا۔ اسٹیج پر اس وقت دلال بزجی اور اس کے چیلے نظر آ رہے تھے، مگر میرے چونک اٹھنے کا سبب وہ لوگ نہیں تھے امین اللہ تھا جسے وہ سب جکڑے ہوئے تھے۔

"یہ اسٹیج کے پچھلے دروازے سے بھاگنے کی کوشش میں تھا، مگر میں نے اسے عین موقع پر پکڑ لیا۔" دلال بزجی کی آواز ہال میں گونجی۔

دلال بزجی کی آواز سنتے ہی کئی انگریز افسران، اسٹیج کی طرف لپکے۔

"میری پُراسرار قوتیں کہتی ہیں کہ گورنر اور ان کے مہمانوں کا قاتل یہی ہے۔" دلال بزجی کی آواز پھر سنائی دی۔

"یہی ہے!..... یہی ہے!" ہال میں موجود افراد میں سے کئی چیخے۔

میرے خیال میں یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے امین اللہ کو بم پھینکتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ امین اللہ نے فرار ہونے کے لیے یقیناً ذہانت کا ثبوت دیا تھا۔ اگر دلال بزجی آڑے نہ آگیا ہوتا تو وہ فرار ہو جاتا۔ اب انگریز افسران اسٹیج پر پہنچ چکے تھے۔

"قاتل نے تنہا یہ کارنامہ انجام نہیں دیا۔ یہاں اسی ہال میں اس کا ایک اور ساتھی موجود ہے۔"

"دلال بزجی کی آواز سن کر میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ اس کی آواز کے ساتھ ہی تمام ہال میں سناٹا چھا گیا۔ اب خاموش رہنے کا وقت گذر چکا تھا۔ مجھے اپنے بچاؤ کے لیے فوری طور پر کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ دلال بزجی مجھے پھنسوانے کے چکر میں ہے۔ میں نے وقت ضائع کیے بغیر ہمزاد کو طلب کر لیا۔

اسی وقت دلال بزجی چیخ اٹھا۔ "اس کا ساتھی وہ رہا!" اس کی انگلی میری طرف اٹھی ہوئی تھی۔

اتنے لوگوں کے ہجوم میں مجھے ایک دم پہچان لیا جانا، ممکن نہیں تھا۔ اس بات کو شاید دلال بزجی نے بھی فوراً ہی محسوس کر لیا کہ اس قدر فاصلے سے اشارہ کرنا بے سود ہے۔ شاید یہی سوچ کر وہ میری نشان دہی کے لیے انگریز افسران کے ساتھ اسٹیج سے اترنے لگا۔ وہ بھی سیڑھیاں اتر کر ایک قدم ہی بڑھا ہو گا کہ تمام ہال اچانک تاریکی میں ڈوب گیا اور اس کے ساتھ

ہی ایسا معلوم ہوا جیسے ہال کے تمام دروازے خود بہ خود کھل گئے ہوں۔

"دوڑو! پکڑو!.... بھاگو! خبردار کوئی ہال سے باہر نہیں نکلے گا!" شور بلند ہوتا رہا۔ میں نے اپنے دائیں ہاتھ پر ایک نادیدہ گرفت محسوس کی۔

"نکل چلیے!" ہمزاد کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

اندھیرے میں لوگ ایک دوسرے سے الجھے ہوئے چیخ رہے تھے۔ چیخ پکار' بھاگ دوڑ' شور' ہنگامہ! میں بہت جلد ہال سے نکل کر مختلف راہداریوں سے گزرتا ہوا ہوٹل کے عقبی دروازے سے باہر نکل گیا۔ میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ میری کار اس چھوٹی سی گلی میں پہلے ہی سے موجود تھی اور میرا ڈرائیور رحمت خان اسٹیئرنگ پر مستعد بیٹھا تھا۔ میں نے بغیر کچھ کہے سنے جلد سے کار کا دروازہ کھولا اور اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ میرے ہمزاد نے فرار کے لیے ساری راہیں ہموار کی تھیں۔

میں اس ہنگامے کے دوران میں دلال بزجی سے انتقام لینے کا بھول ہی چکا تھا' مگر ہمزاد نہیں بھولا تھا۔ کار کی پچھلی نشست پر دلال بزجی کی محبوبہ سروجنی نیم بے ہوشی کی حالت میں موجود تھی۔ ہمزاد نے اتنے کم وقت میں جو کارنامہ انجام دیا تھا' وہ یقیناً قابل ستائش تھا۔ ہال کی روشنیاں گل کرنا' ہال کے تمام دروازے کھول دینا' سروجنی تک پہنچ کر اسے اغوا کرنا اور پھر اسے میری کار میں منتقل کر کے مجھ تک پہنچنے میں اس نے چند لمحے صرف کیے تھے۔ ہمزاد کی یہ تیز رفتاری میرے لیے پہلا تجربہ تھی۔ ہر چند کے میرے علم میں پہلے سے تھا کہ ہمزاد کی پُراسرار قوتوں میں سے ایک قوت یہ بھی ہے کہ وہ نہایت مختصر وقت میں بڑے سے بڑا کام کر سکتا ہے' لیکن اس واقعے سے قبل مجھے اس نوعیت کا کوئی عملی تجربہ نہیں تھا۔ ہمزاد کی اطلاع کے مطابق بزجی اس بات سے واقف ہو چکا تھا کہ میں سرجنی کو لے اڑا ہوں۔

"تو گویا میں جیت گیا! میں نے اس سے انتقام لے لیا!" میری آواز خوشی سے کانپنے لگی۔

پھر میں نے ہمزاد کو اپنے فلیٹ پر پہنچ کر رخصت کیا۔ رخصت ہونے سے پہلے ہمزاد نے کچھ کہنا چاہا' مگر یہ لمحے کچھ اور ہی تقاضا کر رہے تھے۔ میں نے ہمزاد کی ایک نہ سنی۔ ہمزاد میرے حکم سے کس طرح سرتابی کر سکتا تھا' وہ چلا گیا۔ سروجنی سولہ سترہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔

میں نے اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کیا اور پھر جب وہ ہوش میں آ گئی تو اسے دھمکی دی اور وہ اس دھمکی میں آ گئی۔

کچھ دیر بعد معاً میری سماعت سے ایک گونج دار آواز ٹکرائی "دروازہ کھولو!...... کھولو دروازہ!"

پہلے دو مرتبہ مجھے تقریباً ایسی ہی صورت حال سے سابقہ پڑ چکا تھا اس لیے میں نے غسل کرنے میں دیر نہ کی اور اس دوران میں فلیٹ کا دروازہ کھول دیا گیا۔ دروازہ کھولنے والی سروجنی تھی۔ میں ابھی تک غسل خانے میں تھا اور باہر قدموں کی آواز گونج رہی تھی۔ میں نے ہمزاد کو طلب کر لیا اور اس نے فوراً صورت حال کو سنبھال لیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ہمزاد نے میرا جیتا جاگتا روپ اختیار کر کے ان لوگوں کو اپنے تعاقب میں لگا لیا تھا اور انہیں اس جگہ سے بہت دور چھوڑ آیا تھا۔ سروجنی ان لوگوں کے جاتے ہی سراسیمہ ہو کر وہاں سے فرار ہو گئی تھی

وہاں داخل ہونے والے پولیس فورس سے تعلق رکھتے تھے اور مجھ تک دلال بزجی کے اشارے پر پہنچے تھے۔ اس خیال کے پیش نظر کہ پولیس دوبارہ وہاں نہ آ جائے' میں نے رضیہ کو ساتھ لیا اور ہمزاد کے ہمراہ اس جگہ کو چھوڑ دیا۔ اب میرا ٹھکانا ایک ہوٹل میں تھا۔

یہ معلوم ہونے کے بعد کہ انک واقعات کے پیچھے دلال بزجی کا ہاتھ تھا' مجھے تشویش ہوئی کہ وہ پھر کوئی ہنگامہ کھڑا نہ کرے۔ میری موجودہ پناہ گاہ سے واقف ہوتے اسے کیا دیر لگتی! میں نے اپنے وسوسوں سے ہمزاد کو آگاہ کیا تو اس نے بتایا کہ دلال بزجی مجھ سے اس قدر ہراساں ہے کہ اس نے اپنی پراسرار عبادت گاہ میں پناہ لے لی ہے۔ میں نے اپنے غم و غصے کا اظہار کیا تو ہمزاد نے ایک دن کی مہلت چاہی۔ اب میں' دلال بزجی کے وجود کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

اس اطمینان کے بعد کہ دلال بزجی اب فوری طور پر کوئی وار نہیں کرے گا' میں سو گیا۔ رضیہ بھی میرے ساتھ تھی۔ اسی دوران میں میری غفلت سے فائدہ اٹھا کر دلال بزجی نے مجھ پر اپنا جادو آزمایا نیند میں مجھ پر سیاہ بلیوں نے حملہ کر دیا۔ میں اس وقت پاک نہیں تھا اس لیے ہمزاد کو بلانے سے قاصر رہا۔ بلیوں نے پے در پے حملوں کی بنا پر مجھے محسوس ہوا جیسے اب میری زندگی کا چراغ بجھنے والا تھا۔ شاید موت مجھے آ لیتی — مگر رضیہ کی چیخوں سے ہوٹل کے افرام کی توجہ اس جانب مبذول کی اور یوں مجھے ان بلاؤں سے چھٹکارا نصیب ہوا۔

غسل کر کے میں نے ہمزاد کو طلب کیا اور اسے حکم دیا کہ فوراً دلال بزجی کی پُراسرار قوتوں کو اور خود اسے نیست و نابود کر دے۔ روانگی سے قبل ہمزاد نے میرے گرد ایک تیز چمکیلا حصار قائم کر دیا تاکہ میں دلال بزجی کے حملوں سے محفوظ رہ سکوں۔ ہمزاد نے مجھے یہ بھی تاکید

کی کہ میں کسی سے اس قدر قریب نہ ہوں کہ کوئی دوسرا اس حصار کی زد میں آجائے۔ اس حصار میں داخل ہونے والے اجسام زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔

ہمزاد کے جاتے ہیں میں نے اپنی چشم تصوّر وا کی اور دلال بزجی کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر فکر و تردد کے آثار تھے اور آس پاس نازنینوں کا ہجوم تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کایا پلٹی اور اس کی سحرکاریاں پرزہ پرزہ ہوتی نظر آئیں۔ دلال بزجی نے کسی نادیدہ قوّت کو آواز دے کر اپنے وجود کو سمیٹنا چاہا، مگر کچھ بھی ممکن نہ ہوا۔ اس کی پُراسرار عبادت گاہ "آنا" "فانا" ملبے کا ڈھیر بن گئی۔ دلال بزجی وہاں سے چیختا ہوا بھاگا۔ اس دوران میں ہمزاد کو سخت ترین کرب اور اذیت سے دوچار ہونا پڑا۔ میں نے اسے طلب کرنا چاہا تو وہ میرے آنے سے بھی قاصر رہا۔ میرے حکم پر وہ بنگال کے اس ساحر سے ٹکرا گیا تھا۔ جس سے ٹکرانا اپنے وجود کو خطرے میں ڈالنا تھا۔ اس نے شاید اسی لیے مہلت مانگی تھی، مگر حالات کچھ اس طرح پیش آئے کہ میں نے اسے مہلت نہیں دی۔ شاید دلال بزجی سے مقابلہ کرتے ہوئے اس کی قوتیں مفلوج ہو گئی تھیں۔

چونکہ میرے گرد ایک حفاظتی چمکیلا غبار قائم تھا اس لیے میں اس رات رضیہ سے الگ رہا اور دور سویا، لیکن یہ احتیاط کام نہ آئی۔ نہ جانے کب رضیہ لاعلمی کے سبب میرے قریب آئی اور ایک ہولناک چیخ مار کر کوئلے میں تبدیل ہو گئی۔

رضیہ کی چیخ سن کر متعدد افراد میرے کمرے کے باہر جمع ہو گئے۔ پھر ذرا دیر بعد دلال بزجی چند پولیس افسران کو اپنے ساتھ لے کر وہاں پہنچ گیا۔ وہ خبیث ابھی تک زندہ تھا حالانکہ ہمزاد نے اس کے محفوظ قلعے کو مسمار کر دیا تھا۔ پولیس نے مجھے گرفتار کرنا چاہا، مگر کوئی بھی اس حصار میں قدم نہ رکھ سکا۔ کئی پولیس والے میرے قریب آئے، مگر ان کے جسم کوئلہ بن گئے۔ پھر مجھ پر فائرنگ کی گئی، مگر لاحاصل! کوئی بھی گولی میرے جسم کو نہ چھو سکی۔

پھر میں رضیہ کی لاش کو اپنے ہاتھوں سے اٹھائے قبرستان پہنچا۔ اس کی لاش خود میں نے اپنے ہاتھوں سے دفن کی اور پھر وہیں بیٹھ کر اس کی یاد میں آنسو بہاتا رہا۔ اس کی جدائی کا احساس میرے لیے جان لیوا تھا۔ وہ میری محبّت تھی اور مجھی پر قربان ہو گئی تھی۔

مجھے اسی حالت میں پڑے پڑے دیر ہو گئی، پھر ہمزاد کا خیال آیا۔ اپنے تصور کی قوّت کام میں لا کر میں نے اسے دیکھا اور باتیں کیں اس نے مجھے بتایا کہ میں آج رات تک ٹھیک ہو جاؤں گا۔ یہ جان کر میرے دل کو سکون ہوا۔

وہ رات میں نے قبرستان ہی میں گزاری۔ صبح میں وہاں سے لوٹ رہا تھا تو ہمزاد آ گیا۔ وہ اب قطعی ٹھیک تھا۔ میں نے فوری طور پر ہمزاد کو دلال بزجی کی خبر لینے بھیجا۔ ہمزاد نے بتایا

کہ وہ اپنی ٹالی گنج والی کوٹھی میں ہے اور رات کے وقت اس پر حملہ ممکن ہے۔

اندھیرا پھیلتے ہی میں، ہمزاد کے ساتھ ٹالی گنج پہنچ گیا۔ مجھے دیکھ کر دلال بزجی نے اپنی شکست تسلیم کر لی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میرے کسی دشمن نے اس طرح میرے سامنے ہتھیار ڈالے تھے۔ میری انا کو بڑی تقویت ہوئی اور میں نے اس کی جان بخشی کر دی۔ پھر دلال بزجی کی ضد اور خوشامد پر میں نے اس کی حویلی میں رہنا قبول کر لیا۔ دلال بزجی میری حسن پسند فطرت سے واقف تھا۔ اس نے خدمت مدارات میں کمی نہ کی۔ اب مجھے اس کے لیے اپنے ہمزاد سے مدد لینے کی ضرورت نہیں رہی۔ شاہد و شراب کی ہم جلیسی نے سب کچھ بھلا دیا۔ دلال بزجی نے کلکتہ کی اعلیٰ سوسائٹی میں مجھے اپنا گُرو کہہ کر متعارف کرایا تھا۔ ایک بار پھر میرا وہی سنہری دور لوٹ آیا جو بدایوں میں تھا۔ میں، ہمزاد کے ذریعے لوگوں کی عجیب خواہشات پوری کر کے ان کی عقلیں دنگ کر دیتا تھا۔ اسی دوران میں ایک عجیب واقعہ ہوا کہ ہمزاد میرے طلب کرنے کے باوجود کافی دیر تک نہیں آیا۔ یہ پہلا موقع تھا۔ میں اس تاخیر کی وجہ سے ہمزاد پر برس پڑا۔ میں نے اس کی ایک نہ سنی۔ پھر چند دن بعد ایسا ہی ایک اور حادثہ ہوا۔ ہمزاد سے یہ معلوم کر کے میں سخت فکر مند ہو گیا کہ کوئی پُراسرار ہستی میرے اور ہمزاد کے درمیان رابطے کو منقطع کر دینا چاہتی ہے۔ میرے حکم پر ہمزاد نے اس پُراسرار ہستی کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور بتایا کہ اس ہستی کا نام دلال بزجی ہے۔ یہ جان کر میں خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ اسی وقت میں، ہمزاد کی تنبیہہ کے باوجود دلال بزجی کے کمرے کی طرف دوڑا۔

دلال بزجی مجھے وہاں اپنا منتظر ملا۔ مجھے دیکھ کر اس نے خود کو اپنی پُراسرار قوّتوں کے ذریعے ختم کر لیا اور اب یقینی موت کے سوا مفر کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

اس کے بعد میں کلکتے کو خیرباد کہہ دیا اور ہمزاد کے ذریعے دہلی جا پہنچا۔ میں نے دہلی میں ایک نئے نام سے نئی زندگی کا آغاز کیا۔ جلد ہی میرے ارد گرد عقیدت مندوں کا ہجوم ہو گیا۔ اب میں اپنی زندگی سے مطمئن تھا۔ ہمزاد کے ذریعے میں نے اپنے بیٹے کے بارے میں معلومات حاصل کیں جو رضیہ سے تھا۔ اس کا نام سخاوت تھا اور وہ بدایوں میں برے حالات کا شکار تھا۔ میرے ہوتے میری اولاد کسمپرسی کی زندگی بسر کرے اور مشکل میں گرفتار ہو یہ میرے لیے باعث شرم تھا۔ اسی کے ساتھ مجھے ایک اور اطلاع نے مضطرب کر دیا۔ وہ اطلاع یہ تھی کہ میرٹھ کے نواب صاحب کی لڑکی نرگس بھی میرے بچے کی ماں بن چکی تھی اور ایسا ہونے سے نواب صاحب نے میرٹھ سے دور بدایوں میں ایک غریب شخص کو دولت سے مالا مال کر کے نرگس کو قبول کرنے پر آمادہ کر لیا تھا۔ نرگس میری بیٹی دردانہ کی ماں بن چکی تھی، مگر بہ ظاہر

باپ وہی شخص تھا جس سے نواب صاحب نے نرگس کی شادی کی تھی۔ ان واقعات کو برسوں گزر چکے تھے اور اب میرے دونوں بچے سخاوت اور دردانہ جوان ہو چکے تھے۔ لاعلمی کے سبب سخاوت، دردانہ کے قریب ہوتا گیا۔ یہ صورت حال میرے لیے ظاہر ہے کہ ناقابل برداشت تھی، میں فوراً" بدایوں پہنچا اور خود کو سخاوت کے باپ کا ایک مخلص دوست بتا کر سخاوت کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ دردانہ کا خیال اپنے دل سے نکال دے۔ میں نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ دردانہ اس کی سوتیلی بہن ہے۔ میں نے سخاوت کو دولت سے نواز دیا تھا کہ وہ اپنی زندگی خوش حالی کے ساتھ گزار سکے۔ اس معاملے سے نمٹ کر میں پھر دہلی لوٹ آیا اور دہلی کے شب روز نے مجھے اپنا لیا۔

وقت تیز رفتاری سے گزرتا رہا۔ سال پر سال بیتے، یہاں تک کہ مجھے معلوم ہوا، میرا بیٹا سخاوت ساٹھ سال کی عمر پا کر طبعی موت مر گیا۔ اس سے پہلے میں نے میرٹھ کے نواب صاحب، نرگس اور رضیہ کے والدین کے انتقال کی خبریں بھی سن لیں تھیں، مگر سخاوت کی موت سے مجھے سخت صدمہ ہوا۔ اب میری عمر ستانوے سال ہو چکی تھی اور جسم بھی بوڑھا ہو چلا تھا۔ اب میرا خیال تھا کہ میں یہ جسم تبدیل کر دوں۔ پھر انہیں دنوں ایک رات میری روح کانپ اٹھی۔ میرے سامنے مہ پارہ کی روح تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ اب ہمیشہ کے لیے اس دنیا کو چھوڑ کر جانے والی ہے، مگر اس سے پہلے وہ مجھ سے آخری انتقام لینا چاہتی ہے۔ اس اچانک اور نئی افتاد نے مجھے سخت پریشان کر دیا۔ میں 'مہ پارہ کی روح کو تو بھول ہی گیا تھا۔

آخر وہ مجھ پر کیا نیا وار کرے گی؟ میں دیر تک سوچتا رہا اور اس رات ایک لمحے کو بھی نہ سو سکا۔ میں نے ہمزاد کے ذریعے یہ چاہا کہ مہ پارہ کے متوقع انتقام کے بارے میں کچھ جان لوں، مگر ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی مہ پارہ کے معاملے میں ہمزاد کو ناکامی ہوئی۔ ہمزاد کی ناکامی کے بعد میں نے خود کو حالات کے سپرد کر دیا اور سوچا کہ اب جو بھی ہو سو تقدیر! اس ذہنی کشمکش سے نجات پانے کے بعد مجھے اپنے بوڑھے جسم کا خیال آیا۔ اب میں اپنی خواہشات کی تکمیل میں کوتاہی کا شکار ہوتا جا رہا تھا۔ نتیجتہ" میں ایک بار تبدیلی جسم کے لیے بے چین ہو گیا۔ اس کے لیے میں نے اپنے ایک نوجوان مرید کو منتخب کیا۔ ہر شام میری نشست گاہ میں ضرورت مندوں اور میرے مریدوں کا ہجوم ہوتا تھا۔ تبدیلی جسم کے لیے پورے چالیس دن کی تنہائی ضروری تھی۔ سو میں نے اپنے معتقدوں اور مریدوں سے ایک چلہ کھینچنے کا بہانہ کیا اور قطب مینار کے قریبی کھنڈرات میں جا پہنچا۔ رات کا وقت تھا۔ ہمزاد میرے نوجوان مرید عناعیت کو وہاں اٹھا لایا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں خود اپنے قتل پر راضی ہوا تھا۔ اس کے بغیر نیا جسم اپنانا

ناممکن تھا۔ مجھے قتل کرنے کی ذمہ داری ہمزاد نے سنبھال لی۔ اس نے پہلے عناعیت کی گردن اس کے تن سے جدا کی، پھر میری طرف پلٹا۔ اس کے ہاتھ میں ایک تیز دھار اور خون آلود خنجر تھا۔ میں اس کے کہنے پر تن کر بیٹھا ہوا تھا۔

"سنبھلیے!" ہمزاد نے کہا۔

میں نے چاہا کہ ہمزاد کو کچھ دیر رکنے کے لیے کہوں، مگر میرے الفاظ ہونٹوں سے ادا نہ ہوں کے کیوں کہ اس سے پہلے ہی ہمزاد کا ہاتھ اپنا کام کر چکا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے دہکتی ہوئی انگیٹھی میری گردن پر الٹ دی گئی ہو۔ اس کے بعد دوسرے ہی لمحے میرا سر جسم سے جدا ہو گیا۔ اور عناعیت کے تڑپتے ہوئے جسم سے جا لگا۔ گردن کی پچھلی ہڈی پر مجھے بھرپور ضرب کا احساس ہوا اور پھر میں اپنے حواس پر قابو نہ رکھ سکا۔ انتہائی تکلیف اور اذیت نے مجھے بے ہوش کر دیا تھا۔

وہ چالیس دن گزر گئے تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ میں نے پھر اپنی محفل سجالی۔ اب میری جھکی ہوئی کمر سیدھی ہو چکی تھی اور میرا جسم جوان تھا۔ میرے مرید اسے بھی میری کرامت سمجھے۔ نیا جسم حاصل کرنے کے بعد جیسے مہ پارہ کا انتقام میرے ذہن سے نکل گیا۔ اب ہر شب میرے لیے نئی تھی۔ میرا عہد جوانی جیسے ایک بار پھر لوٹ آیا تھا۔

انہیں دنوں کا ذکر ہے کہ میں نے اپنے مریدوں سے ایک شخص گھنشیام داس کا نام سنا۔ اس کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ ایک عرصہ افریقہ میں رہ کر آیا ہے۔ وہ شخص نہ صرف افریقہ کے پراسرار علوم کا عالم ہے بلکہ اس کے پاس کچھ پراسرار قوتیں بھی ہیں۔ پورے دہلی میں ان دنوں اس کا شہرہ تھا۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ اپنے سامنے کسی دوسرے کا چراغ جلتے نہیں دیکھ سکتا۔ دہلی میں ایک طویل عرصے سے صرف میرا توتی بول رہا تھا۔ میری شہرت و عزت میں حصے دار بننے والا یقیناً میرا دوست نہیں ہو سکتا۔ میں نے اس کے اتنے تذکرے سنے کہ اسے دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی اور ساتھ ہی یہ خواہش بھی کہ اس کے پاس کیا پُراسرار قوتیں ہیں اور وہ کتنے پانی میں ہے! میں چاہتا تھا کہ لوگوں کے ذہن سے اس کا بھوت اتار دیا جائے کسی مظاہرے کے دوران میں اس کی پُراسرار قوتوں کو ہمزاد کے ذریعے ناکارہ بنا کر اسے لوگوں کے سامنے ذلیل کیا جا سکتا تھا۔ یہ وہ دن تھے جب مطالبہ پاکستان زور پکڑتا جا رہا تھا۔ ہندوستان کو انگریز کی غلامی سے نجات ملنے والی تھی۔ صدیوں پرانے رشتے کم زور پڑتے جا رہے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کا شیرازہ مسلم لیگ کے منطقی استدلال کے سامنے نہ ٹھہر سکا تھا۔ اسی کے نتیجے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مسابقت اور مقابلے کی سی فضا پیدا ہو گئی

تھی۔

دہلی کے ہندوؤں نے گھنشیام داس کو سر آنکھوں پر بٹھالیا تھا۔ ہندو مسلمانوں کے خلاف اپنی نفرت کا اظہار کرنے کے لیے مجھے بھی دبی دبی زبان میں برا بھلا کہنے لگے تھے اور یہ بھی کہ میں، گھنشیام داس کے سامنے نہ ٹھہر سکوں گا۔ دوسری طرف مسلمانوں کو مجھ پر اندھا اعتماد تھا۔ وہ ردِ عمل میں میری تعریف کرتے تھے اور زمین آسمان کے قلابے ملاتے تھے۔

ایک دن میں نے سنا کہ گھنشیام داس ایک بڑے مجمع کے سامنے اپنی پُراسرار قوتوں کا مظاہرہ کرنے والا ہے۔ اس کی شہرت و عزت کو خاک میں ملانے کا یہ سنہری موقع تھا۔ مقررہ دن میں اپنے مریدوں کے ساتھ رام لیلا گراؤنڈ پہنچ گیا۔ جہاں گھنشیام داس اپنی پُراسرار قوتوں کا مظاہرہ کرنے آیا تھا۔

گھنشیام داس نے کئی نظری کرتب دکھا کر لوگوں سے زبردست خراج تحسین وصول کیا۔ آخر میں اس نے مختصر سی تقریر میں اپنے آخری کرتب کا ذکر کیا۔ اس نے مجمع سے خطاب کیا۔ "آپ لوگوں میں سے صرف نو نوجوان، اسٹیج پر آجائیں۔ میں انہیں تلواریں دوں گا۔ وہ سب نوجوان بلا روک ٹوک جب میں اشارہ کروں تو مجھ پر تلواروں سے حملہ کردیں۔ میں خالی ہاتھ رہوں گا۔ آپ دیکھیں گے کہ تلواریں میرے جسم سے گزرتی رہیں گی، مگر میرا جسم اپنی جگہ سلامت رہے گا۔" پھر وہ خاموش ہو گیا اور نوجوانوں کی اسٹیج پر آمد کا انتظار کرنے لگا۔

"دیکھیے، اس نے اپنی موت کو خود آواز دے لی۔" ہمزاد نے سرگوشی کی، پھر بتایا۔ "اس کے پاس پُراسرار قوتیں یقیناً ہیں مگر میں ان پر قابو پاسکتا ہوں۔"

کچھ دیر بعد مطلوبہ نوجوان اسٹیج پر پہنچ گئے گھنشیام نے ایک سیاہ بکس کھول کر تلواریں نکالیں اور ان نوجوانوں میں تقسیم کردیں۔ پھر اسی کے ایماء پر نوجوانوں نے وہ تلواریں مجمع میں پہنچ کر لوگوں کو دکھائیں کہ وہ تیز دھار اور اصلی ہیں۔ نوجوان پھر اسٹیج پر آگئے تو گھنشیام ان کے درمیان میں کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا کہ جیسے ہی میں ہاتھ کا اشارہ کروں، مجھ پر بہ یک وقت حملہ کردیا جائے۔

میں نے دیکھا گھنشیام داس ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ بدبدایا اور پھر اس نے ہاتھ سے حملے کا اشارہ کیا۔ بہ یک وقت نو تلواریں بلند ہوئیں اور پھر گھنشیام داس کی دل دوز چیخ سنائی دی۔ اس کا جسم، اسٹیج پر بڑا بری طرح تڑپ رہا تھا۔ تلواروں کی دھار واقعی بہت تیز تھی۔ اس کا جسم سخت مجروح ہو چکا تھا۔ آدھی گردن کٹ گئی تھی، ایک شانے میں تلوار اتر کر اسے جسم سے جدا کرچکی تھی۔ سر کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ جسم پر جگہ جگہ گہرے زخم

تھے۔ پھر اس کی روح جسم کا ساتھ چھوڑ گئی۔ کچھ لوگوں نے اسٹیج پر پہنچ کر گھنشیام داس کی موت کا اعلان کیا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ گھنشیام داس جو منتر پڑھ رہا تھا، شاید کسی سبب ادھورا رہ گیا ہو گا۔ میں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اسٹیج پر آگیا۔ کسی نے بھی مجھے نہیں روکا۔ میں ان کے لیے نیا نہیں تھا۔ ہندو مجھے "بزرگ صاحب" کہتے تھے۔

میں نے وہ سارے کرتب دہرائے جو گھنشیام داس دکھا چکا تھا اور پھر وہ کرتب بھی کہ نوجوانوں نے مجھ پر تلواروں سے حملہ کیا۔ اس سے پہلے ہمزاد میرے جسم کے گرد ایک نادیدہ حصار کھینچ چکا تھا۔ تلواریں برستی رہیں، مگر میں اپنی جگہ خاموش کھڑا رہا۔ لوگ حیرت اور خوشی سے تالیاں بجانے لگے۔ اس کے بعد میں نے لوگوں سے آخری کمال دکھانے کا دعویٰ کیا۔ میں نے مجمع کے قریب کھڑے ہوئے پولیس کے ٹرکوں میں سوار سپاہیوں کو مخاطب کیا کہ وہ ایک ٹرک کو اسٹیج کے قریب لے آئیں۔ میں نے کہا۔ "میں اس پورے وزنی ٹرک کو اپنے ہاتھ کی ایک انگلی پر اٹھالوں گا۔"

سپاہی، ٹرک قریب لا کر اس سے اترنے لگے تو میں نے انہیں اترنے سے روک دیا۔ میں نے پھر ٹرک کی طرف ہاتھ بڑھایا اور ساتھ ہی ہمزاد کو اشارہ کیا۔ میں نے ٹرک کا ایک حصّہ گرفت میں لیا اور لوگوں نے دیکھا کہ ٹرک، زمین سے اٹھ کر اسٹیج پر آگیا۔ پھر ہمزاد نے اپنے نادیدہ ہاتھ آگے کیے اور ٹرک بظاہر میرے ہاتھ کے اشارے پر فضا میں بلند ہونے لگا۔ ٹرک پر بیٹھے ہوئے سپاہی حیرت اور خوشی سے چیخنے لگے۔ ٹرک میرے سر سے بلند ہو کر فضا میں معلق ہو گیا۔ اب پورا ٹرک میرے شہادت کی انگلی پر تھا۔

مجھے پھر ایک اور دور کی سوجھی۔ میں اس حالت میں مجمع سے مخاطب ہوا۔ "اب میں اس ٹرک کو انگلی پر نچاؤں گا۔"

لوگ جوش میں تالیاں بجانے لگے۔ پھر ہو ٹرک، میری انگلی پر گھومنے لگا۔ صرف میں ہی یہ محسوس کر سکتا تھا کہ میری انگلی پر قطعی دباؤ یا وزن نہیں۔ ٹرک کا سارا وزن ہمزاد سنبھالے ہوئے تھا۔ پھر جب میں نے ہمزاد کو اشارہ کیا کہ اب ٹرک کو آہستہ آہستہ نیچے اتار لے تو اسی دوران میں وہ ہول ناک واقعہ رونما ہو گیا۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ میرے دونوں ہاتھوں پر ہزاروں من بوجھ آپڑا ہو، جیسے میری دونوں کلائیاں اور بازو ٹوٹ گئے ہوں۔ میری قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ میں تیزی سے ایک طرف ہٹا اور گرتے ہی ہوش کھو بیٹھا۔

مختصر یہ کہ اس حادثے میں میرے دونوں ہاتھ جگہ جگہ سے ٹوٹ گئے اور اس کی ذمہ

وار مہ پارہ تھی۔ اس نے عین وقت پر ہمزاد کی قوتیں سلب کرلی تھیں۔ حادثے کے فوراً بعد جب مجھے ہوش آیا تو میں نے مہ پارہ کی روح کو اپنے قریب دیکھا۔ وہ مجھ سے مخاطب تھی۔

"میں آج تمہاری دنیا سے ہمیشہ کے لیے جا رہی ہوں۔ میں نے تم سے اپنا آخری انتقام لے لیا اور یہ انتقام عجیب نوعیت کا ہے۔ یہ انتقام میری غیر موجودگی میں بھی اس وقت تک جاری رہے گا جب تک تم مر نہیں جاتے۔ آج میں نے انتقام کی ابتدا کردی ہے۔ جب تک تم زندہ رہو گے' اپاہجوں اور محتاجوں کی زندگی بسر کرو گے۔ تمہاری روح کو سکون نہ مل سکے گا۔ تم مسلسل جسمانی اذیت میں مبتلا رکھے جاؤ گے۔ اس کے لیے مجھے اب تمہاری دنیا میں آنے کی ضرورت نہیں رہی۔ میں اپنا کام کرچکی ہوں۔ تم نے ایک ہفتے قبل جو نیا جسم اپنایا تھا' میں نے اسے مفلوج کردیا۔ اب تم جو نیا جسم بھی اپناؤ گے کسی نہ کسی طور پر مفلوج ہوتا رہے گا۔ اب اجازت دو! تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ مجھ ایسا ذہین اور بہادر دشمن نصیب ہوا۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی مہ پارہ کا ہیولا غائب ہوگیا۔"

پھر مجھے میرے مرید بہت جلد گھر لے آئے۔ اس رات لاعلمی کے سبب' میں گھنشیام داس کی نوجوان بیٹی وملا کے سحر کا شکار ہوگیا۔ اس نے مجھ سے اپنے باپ کی موت کا بڑا بھیانک انتقام لیا۔ ناپاک ہونے کے سبب ہمزاد میری کوئی مدد نہ کرسکا۔ وہ مجھے تڑپا تڑپا کر مارنا چاہتی تھی' مگر چند ہی دن بعد تقدیر نے میرا ساتھ دیا۔ میں جس تہ خانے میں قید تھا جو وملا کے ظلم و ستم کا نشانہ بنا ہوا تھا' اس کے ایک دریچے سے بارش کا پانی اندر آگیا۔ تہ خانے میں پانی بھر گیا اور میں اس پانی میں لوٹنے لگا۔ میرا تمام جسم پانی میں شرابور ہوگیا۔ پھر میں نے پاک ہوتے ہی ہمزاد کو طلب کرلیا۔ ہمزاد مجھے اس جہنم سے نکال لایا۔

تیسرے دن ہمزاد نے وملا کی پُراسرار قوتوں کے بارے میں ساری معلومات حاصل کرلیں۔ وہ دہلی سے فرار ہوکر متھرا پہنچ گئی۔

دن تیزی سے گزرتے رہے اور میرے ذہن سے وملا کا خیال محو ہوتا گا۔ اب میں اپنے ہاتھوں کی محرومی کے احساس سے بے چین رہنے لگا۔ بالآخر میں نے ہمزاد سے خواہش کی کہ اس مفلوج جسم سے نجات حاصل کرلی جائے۔ ہمزاد کو میری رائے سے اتفاق نہیں تھا' مگر وہ میرے حکم سے مجبور ہوگیا۔

پھر ایک بار میں قطب مینار کے کھنڈرات میں پہنچ گیا' مگر ابھی نیا جسم حاصل کیے مجھے صرف گیارہ دن ہوئے تھے کہ وملا وار کرگئی۔ وہ میری طرف سے غافل نہ تھی۔ پولیس نے دو قتل کرنے کے الزام میں مجھے گرفتار کرلیا۔ دونوں لاشیں' پولیس کو ان کھنڈرات سے مل

گئیں' مگر ایک لاش کا صرف سر ہی مل سکا۔ چالیس دن پورے ہونے سے پہلے میں قطعی بے بس تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھے سزائے موت سنا دی گئی۔ چالیس دن پورے ہونے سے نو دن پہلے میری تقدیر کا فیصلہ سنا دیا گیا تھا۔ چالیس دن پورے ہونے سے صرف ایک دن پہلے مجھے پھانسی دی جانے والی تھی۔ ایک دولت مند مرید میرا مقدمہ لڑ رہا تھا۔ میرے اشارے پر اس نے اپیل دائر کردی اور یوں مجھے مہلت مل گئی ورنہ اپیل میں کوئی جان نہیں تھی۔

چالیس دن پورے ہوگئے اور میں نے جیل ہی میں غسل صحت کیا۔ پھر اسی رات ہمزاد مجھے جیل سے نکال کر متھرا لے گیا جہاں وِملا نے پناہ لی تھی۔ اسے میں نے بے خبری میں چھاپ لیا۔ اس نے اپنی شکست قبول کرلی اور اسی کے ساتھ زندگی بھر کے لیے میرا ساتھ نبھانے کی خواہش کا اظہار کیا۔

کسی حسین لڑکی نے آج تک مجھ سے یہ خواہش نہیں کی تھی۔ میں نے اس شرط پر اس کی درخواست قبول کرلی کہ وہ مسلمان ہوجائے' دوم یہ کہ میں اس کی ساری پُراسرار قوتیں سلب کرلوں گا۔ اس نے یہ شرائط قبول کرلیں۔ دوسرے دن صبح تک ہمزاد نے ایک حصار کھینچ کر اس کی قوتیں سلب کرلیں۔

اب پاکستان بن چکا تھا۔ اس کے قیام کو چند روز ہوئے تھے۔ پورے ہندوستان میں ہندو مسلم فساد پھوٹ پڑے تھے۔ میں نے سوچا' کیوں نہ پاکستان چلا جاؤں! اس طرح میں پولیس کی دسترس سے بھی بچ سکتا تھا۔ یوں بھی اب ہندوستان میں میرا کون تھا!

میں نے ہمزاد اور وِملا کو اپنے ارادے سے باخبر کردیا۔ وملا کی خواہش تھی کہ مشرقی پاکستان چلا جائے۔ بنگال ایک بار پھر مجھے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ میں نے وملا کی بات مان لی۔ ہمزاد نے مجھے اور وملا کو ڈھاکہ پہنچا دیا جہاں صدر گھاٹ کے علاقے میں مجھے ایک مکان مل گیا۔ وہاں پہنچتے ہی وملا مسلمان ہوگئی اور میں نے اس کا نام جمیلہ رکھا۔ پھر میں نے اس سے نکاح پڑھوا لیا۔ شادی کی رات ہی میں ایک ہولناک حادثے کا شکار ہوگیا۔ میں زینے سے لڑھک گیا۔ اس حادثے میں بھی مہ پارہ کا ہاتھ تھا۔ اس نے مجھے میری دونوں ٹانگوں سے محروم کردیا۔ دوسری شب ایک اور حادثہ رونما ہوا۔ وملا نے مجھے سوتے ہوئے قتل کرنے کی کوشش کی' مگر ہمزاد چوکنا تھا۔ اس نے وملا کا کام تمام کردیا اور مجھے بچا لیا۔ پھر اس نے وملا کی لاش کو ٹھکانے لگا دیا۔ عورت کی ذات سے میرا اعتبار اٹھ گیا اور میں نے فیصلہ کیا کہ اب کسی عورت کی مستقل رفاقت کا خواب نہیں دیکھوں گا۔

میں کچھ ہی دن میں اپنے مفلوج جسم سے بیزار ہوگیا اور ایک پڑوسی نوجوان محمد ہاشم کو

قتل کرا کے اس کا جسم حاصل کر لیا۔ چالیس دن سکون سے گزر گئے نئے جسم سے میرا پورا رابطہ قائم ہو گیا۔ اس کے بعد ڈھاکہ سے بھی میرا جی اچاٹ ہو گیا۔ اس بار میری منزل چاٹگام تھی۔ یہاں آ کر میں نے اپنی آمدنی کے ذرائع ظاہر کرنے کے لیے تجارت شروع کر دی۔ طویل عرصے کے بعد یہاں آ کر میں نے اپنا بچھڑا ہوا نام اپنا لیا۔ لوگ مجھے شیخ کرامت ہی کے نام سے پکارنے لگے۔

چاٹگام پہنچ کر بہت دنوں تک مجھے کوئی حادثہ پیش نہ آیا۔ پورا سال گزر گیا۔ شاید مہ پارہ اپنا انتقام پورا کر چکی ہے' میں سوچنے لگا۔ دن گزرتے رہے' یہاں تک کہ اب سے پانچ سال پہلے اچانک میرے سینے میں شدید درد اٹھا۔ صبح ڈاکٹر کو دکھایا تو اس نے بتایا کہ مجھے معدے کا سرطان ہے۔ واپسی میں مجھے مہ پارہ کا زہریلا قہقہہ سنائی دیا اور میں تڑپ کر رہ گیا۔ آخر وہ اپنے انتقام سے باز نہیں آئی تھی۔

ہمزاد کے مشورے پر میں اسپتال میں داخل ہو گیا۔ چند روز بعد ہمزاد نے مجھے ایک روح فرسا خبر سنائی۔ "آپ اب سے دس دن بعد مجھے آزاد کرنے کے پابند ہیں۔ آپ نے مجھے سو سال کے لیے قابو میں کیا تھا جو پورے ہونے والے ہیں۔" ہمزاد نے مجھے کچھ ہی دیر میں سب کچھ یاد دلا دیا۔

"تو پھر کیا میں تمہارے بغیر زندہ رہوں گا؟" میں نے کہا۔ ابھی تک مجھے حالات کی سنگینی کا احساس نہیں ہوا تھا کہ ہمزاد کی آزادی کا مطلب کتنا بھیانک ہے!

"کاش آپ میرے بغیر زندہ رہ سکتے!" ہمزاد کی آواز بھرا گئی۔

"کیوں؟..... کیوں؟..... آخر ایسا کیوں نہیں ہو سکتا؟"

"اس لیے کہ میرے آزاد ہوتے ہی آپ کے سر اور بقیہ جسم کا رابطہ منقطع ہو جائے گا کیوں کہ یہ رابطہ میری ہی وجہ سے اب تک قائم ہے۔" ہمزاد نے جواب دیا۔

ہمزاد کی بات سن کر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور میرا دل ڈوبنے لگا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی اپنی موت کو اتنے قریب محسوس نہیں کیا تھا۔

اب..... اب میری زندگی کے وہ دس دن بھی گزر چکے ہیں۔ ہمزاد میرے سرہانے کھڑا ہے۔ میں اسے دیکھ رہا ہوں۔ وہ سورج ڈوبنے کا منتظر ہے اور مجھ میں سما جانے کے لیے بے تاب ہے کیوں کہ وہ میرے ہی جسم کا حصّہ ہے۔ میں نے پہلے سمجھا تھا کہ وہ آزاد ہو کر مجھ سے رخصت ہو جائے گا مگر یہ میری بھول تھی۔ اب سے چند لمحوں بعد وہ میرے جسم میں پناہ حاصل کر کے ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سو جائے گا۔

اپنی ہنگامہ خیز و حیرت انگیز زندگی میں موت کو میں نے جتنے قریب دیکھا اور محسوس کیا ہے' شاید ہی کسی اور نے دیکھا اور محسوس کیا ہو۔ خود عملی طور پر بھی میں کئی بار قتل ہوا ہوں' نادانستگی میں بھی اور دانستہ بھی! چند لمحے انسانی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہی چند لمحے اکثر اوقات موت اور زندگی کے درمیان فصل ہوتے ہیں۔ میں زندگی کی آخری سرحد تک آ پہنچا تھا اور میرے پاس صرف چند لمحے تھے۔

آج سے ٹھیک ایک سو سال پہلے جب میں نے ہمزاد کو قابو میں کیا تھا تو اس کے اور میرے مابین دیگر شرائط کے علاوہ ایک اہم شرط اور طے ہوئی تھی۔ وہ شرط تھی مدّت کے بارے میں ہمزاد نے مجھ سے دریافت کیا تھا کہ میں اسے کتنی مدّت کے لیے قابو میں کر رہا ہوں؟ اس وقت مجھے اس اچانک اور غیر متوقع سوال کی اہمیت کا اندازہ نہیں تھا۔ میں نے چند لمحے سوچا اور میرے منہ سے نکلا۔ "سو سال۔"

میں نے سوچا تھا کہ زیادہ سے زیادہ بھی زندہ رہا تو یہ مدت مرے لیے کافی رہے گی۔ کاش مجھے خبر ہوتی کہ عرصہ گاہ حیات میں سو سال کوئی معنی نہیں رکھتے! کاش میں جانتا کہ اس سوال کا جواب دے کر اپنی زندگی کی حد مقرر کر رہا ہوں! کاش میرے علم میں یہ ہوتا کہ جتنے عرصے ہمزاد میرے قابو میں رہے گا' میں زندہ رہوں گا۔

زندگی کی خواہش آخری لمحوں تک انسان سے منہ نہیں موڑتی۔ سو میں بھی جینے کی خواہش میں مر رہا تھا۔

پورے ایک سو سال کی رفاقت معمولی نہیں ہوتی۔ ہمزاد قدم قدم میرے ساتھ رہا تھا اور اب اس کی جدائی کا لمحہ قریب آ رہا تھا۔ میں بھی فنا کی گود میں سونے والا تھا اور وہ بھی! میں نے بڑی حسرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ابھی سے موت کی زردی پھیل گئی تھی۔ مجھے اس سے یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ اسے میری اور اپنی موت کا گہرا صدمہ تھا۔

پھر مجھے نہیں معلوم کہ زندگی کے ان آخری لحات میں کیسے میرے ذہن میں وہ بات آئی اور میں نے کس طرح ہمزاد سے اس کا اظہار کر دیا۔

ہمزاد میری بات سن کر چونک اٹھا اور بولا۔ "مگر دوبارہ مجھے تسخیر کرنے کے لیے چالیس دن کا عمل ضروری ہے اور..... اور اب..... اب صرف چند لمحے رہ گئے ہیں۔ آپ مجھے دوبارہ قابو میں کرنے کا عمل کس طرح پورا کر سکتے ہیں! مگر..... مگر....." وہ کچھ کہتے کہتے کسی سوچ میں کھو گیا

"مگر کیا؟ جلدی کہو! سورج ڈوبنے والا ہے۔" میں نے بے تابی سے کہا۔

"آپ کو شدید جسمانی اذیت اور کرب سے گزرنا پڑے گا۔" وہ بڑی تیزی سے بتانے لگا۔ "میرے لیے صرف اتنا ممکن ہے کہ میں ان لمحات سے فائدہ اٹھا کر ایک مخصوص مدّت کے لیے آپ کے سر اور بقیہ جسم کا رابطہ منقطع نہ ہونے دوں۔ ایسی صورت میں خود مجھے کرب سے گزرنا پڑے گا۔ ممکن ہے میرے بعد یہ رابطہ کمزور پڑ جائے اور آپ کی گردن جہاں سے جوڑی گئی ہے۔ وہاں سے خون رسنے لگے، لیکن یہ اذیت آپ کو برداشت کرنا پڑے گی۔ میری اور اپنی زندگی کی خاطر! آپ کو ہر لمحہ یہ محسوس ہو گا جیسے آپ کے گلے پر خنجر پھیرا جا رہا ہو، لیکن اس کے باوجود کسی سبب عمل پورا نہ ہو سکا تو..... تو پھر کچھ نہیں ہو سکتا! میری اور آپ کی موت یقینی ہو جائے گی۔"

"مجھے منظور ہے! سب کچھ منظور ہے!" زندگی کی نوید پا کر میں تقریباً" چیخ اٹھا۔

"پھر ایک بار یہ بتا دوں کہ وہ اذیت اتنی شدید ہو گی کہ آپ خود زندگی پر موت کو ترجیح دینے لگیں گے۔" ہمزاد نے گویا مجھے آخری بار سمجھایا۔

"نہیں! تم دیکھنا کہ میں زندگی کی خاطر ہر اذیت سے گذر جاؤں گا!" میں پر اعتماد لہجے میں بولا۔

"پھر آپ کو آج ہی رات سے عمل شروع کرنا ہو گا۔" ہمزاد نے بتایا

"ٹھیک ہے، میں تیار ہوں۔" جواباً" میں نے کہا۔

ہمزاد نے کھڑکی سے باہر ڈوبتے سورج کو دیکھا اور پھر تیزی سے مجھ پر جھک گیا۔ وہ میری گردن پر ہر طرف آہستہ آہستہ اپنے نادیدہ ہاتھ پھیر رہا تھا۔ مجھے اس لمحے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے وجود میں ٹھنڈک سی اتر رہی ہو۔

چند ہی لمحے بعد میرے جسم پر رعشہ سا طاری ہو گیا اور پھر بے ہوشی سی مسلط ہونے لگی۔ وہ ٹھنڈک میرے لیے قابل برداشت تھی جو میری ہڈیوں تک اتری جا رہی تھی اور میرا سارا جسم سردی سے اکڑ رہا تھا۔ میں نے اس عالم میں ہمزاد کی آواز سنی۔ "خدا حافظ! کاش آپ مجھے دوبارہ قابو میں کر سکیں!"

ان لفاظ کے ساتھ ہی اس کی آواز معدوم ہو گئی۔ وہ جا چکا تھا۔ اچانک میں نے سردی کے بعد اپنے جسم میں شدید گرمی محسوس کی۔ سورج اب ڈوب چکا تھا اور یہ احساس میرے لیے بڑا خوش گوار تھا کہ میں ابھی زندہ ہوں اور مزید زندہ رہنے کے لیے میرے پاس ایک موقع اور ہے۔

میں اپنی عمر کا ایک حصّہ بسر کر چکا تھا اور گویا اب ایک نئی زندگی میں قدم رکھنے والا تھا۔ اس زندگی کے صرف چالیس دن یقینی تھے، اس کے بعد کیا ہو تا، کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ میں چند لمحے ہی خیالوں کی دنیا میں رہ سکا کیوں کہ معاً" میرے جسم کی گرمی ناقابل برداشت ہونے لگی۔ اس کے ساتھ گردن میں شدید تکلیف شروع ہو گئی جیسے کوئی زخم تڑخ اٹھا ہو۔ میں نے اپنی گردن پر نمی محسوس کی تو بے اختیار میرا ہاتھ وہاں پہنچ کر رک گیا۔

میں نے نم حصّے کو چھوا اور پھر اپنی انگلیوں کو دیکھا تو دہشت زدہ سا ہو گیا حالانکہ ہمزاد نے مجھے پہلے ہی اس خطرے سے آگاہ کر چکا تھا۔ میرے انگلیوں پر خون لگا ہوا تھا۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ مدت ختم ہوتے ہی میرے سر اور جسم کے درمیان رابطہ کمزور پڑ چکا ہے اور گردن سے خون رسنے لگا ہے۔ مجھے چالیس دن اسی اذیت میں گزارنا تھے شاید اس سے بھی زیادہ اذیت میں! جس کے متعلق ہمزاد نے مجھے بتایا تھا۔

لمحہ بہ لمحہ اذیت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی کند خنجر سے میری گردن کاٹ رہا ہو۔ تکلیف برداشت کرنے کے لیے میں نے نچلا ہونٹ اپنے دانتوں میں دبا لیا۔

اسی وقت اسپتال کا ڈاکٹر انوار الحق ادھر آتا دکھائی دیا۔ وہ حسب معمول شام کے راؤنڈ پر نکلا تھا۔ میری حالت چونکہ تشویش ناک تھی اس لیے وہ پہلے میرے ہی پاس آتا تھا۔ میں نے اپنی گردن سے رستے ہوئے خون کو چھپانے کے لیے چادر اوپر تک کھینچ لی۔

ڈاکٹر نے میرے بستر کے قریب پہنچ کر چارٹ دیکھا، پھر میری مزاج پرسی کی اور بولا۔ "اس وقت آپ شاید شدید تکلیف میں ہیں جس کا اظہار آپ کے چہرے سے بھی ہو رہا ہے۔ کیا بات ہے؟ کیا پھر سینے میں درد اٹھ رہا ہے؟"

"نن ..... نہیں ڈاکٹر صاحب! .... میں ٹھیک ..... بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے اپنی تکلیف پر قابو پاتے ہوئے بہ مشکل مسکرانا چاہا۔

"میں جانتا ہوں شیخ صاحب، آپ بڑی ہمت اور حوصلے کے آدمی ہیں۔" ڈاکٹر خوش اخلاقی سے بولا۔ "آپ کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو ..... [illegible]۔ صاف گوئی کو کہ اب تک چل بسا ہوتا۔ آپ کی قوّت ارادی حیرت انگیز ہے۔ پچیس سالہ پریکٹیس میں میری نظر سے آپ جیسا مریض نہیں گزرا۔ آپ کی بیماری آخری مرحلے میں ہے اور میں ..... میں اپنی سی کوشش کر رہا ہوں کہ آپ خطرے کی حدود سے نکل آئیں۔ اگر ایسا ہو گیا تو اسے میں اپنی نہیں آپ کی کامیابی تصوّر کروں گا، آپ کی قوت ارادی کا کمال! اور یہ میری زندگی کا

کیس ہو گا۔"

ڈاکٹر کہے جا رہا تھا۔ اسے کیا خبر تھی کہ اب تک میرے زندہ رہنے میں میری قوت ارادی کو کوئی دخل نہیں تھا بلکہ یہ ہمزاد کی وجہ سے تھا۔

معاً" میرے منہ سے کراہ نکل گئی تو ڈاکٹر نے کہا۔ "ذرا چادر ہٹایئے! میں دیکھتا ہوں۔" یہ کہتے ہی اس نے خود چادر ہٹا دی۔ اس نے اچانک ایسا کیا تھا اس لیے میں کچھ نہ کر سکا۔ چادر ہٹتے ہی اس نے نظر میری گردن پر پڑی اور وہ ایک دم چونک کر ٹھٹک گیا۔ "یہ.... یہ آپ کی گردن پر کیا ہوا؟ خون!..... خون رس رہا ہے۔ کیا یہاں کوئی پرانا زخم تھا؟"

"جج..... جی ہاں۔" میں نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔

"شاید وہی زخم دوبارہ کھلنے لگا۔" اس نے کہا اور پھر وہاں کچھ ہی دیر میں نرسوں' کمپاؤنڈروں اور دوسرے ڈاکٹروں کا ہجوم ہو گیا۔ میں بہرحال کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔

ڈاکٹر انوار الحق کے خیال میں وہ زخم بہت ہی خطرناک تھا جو میری گردن کی چاروں طرف تھا۔ اس معمے کو کوئی ڈاکٹر حل نہ کر سکا۔ ہاں انہوں نے اتنا ضرور کیا کہ گردن میں دوا لگانے کے بعد بینڈیج کر دی تاکہ خون رسنا بند ہو جائے۔

بینڈیج کے بعد ڈاکٹر نے مجھ سے کہا۔ "ضروری ہے کہ میں آپ کو بے ہوشی کا انجکشن دے دوں تاکہ آپ اس اذیت سے بچ سکیں۔"

"نہیں ڈاکٹر صاحب!" میں نے انکار کر دیا۔ "اتنا ہی کافی ہے۔ اب میں قدرے سکون محسوس کر رہا ہوں کیوں کہ آپ نے دواؤں سے گردن کے زخمی حصے کو سن کر دیا ہے۔" اور یہی حقیقت بھی تھی۔ وقتی طور پر میں اس اذیت سے نجات پا چکا تھا۔

"مگر چند گھنٹے بعد داؤں کا اثر ختم ہوتے ہی پھر تکلیف بڑھ جائے گی۔ آپ انجکشن کیوں نہیں لگوا لیتے؟" ڈاکٹر نے مجھے سمجھانا چاہا۔

"اس لیے ڈاکٹر صاحب کہ میں آج ہی رات یہاں سے ڈسچارج ہو کر اپنی کوٹھی جانا چاہتا ہوں۔" میں نے آخر وہ بات کہہ ہی دی جو میرے دل میں تھی۔ میرے پاس صرف چالیس دن تھے جن میں سے ایک دن بھی گنوانے کا مطلب میری یقینی موت تھی۔

"جی ہاں!" میں نے ٹھنڈا سانس لیا اور اصل بات کو چھپانے کی خاطر کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! اگر مرنا ہی مقدر ٹھہرا تو پھر آدمی اپنے گھر ہی میں کیوں نہ مرے اسپتال کے بستر پر کیوں مرے! آپ سے صرف میری اتنی درخواست ہے کہ میرے لیے دو نرسوں اور ایک ڈاکٹر کا بندوبست کر دیں۔ ان کے قیام کا بندوبست میں اپنی کوٹھی میں کرا دوں گا۔ غالباً" مجھے یہ کہنے کی

ضرورت نہیں کہ اخراجات کتنے بھی ہوں' مجھے اس کی پروا نہیں۔"

"شیخ صاحب! کیا آپ واقعی سنجیدہ ہیں؟" ڈاکٹر کی حیرت ابھی کم نہیں ہوئی تھی۔ گھر میں وہ طبی سہولتیں ممکن نہیں جو یہاں اسپتال میں ہیں۔ خواہ آپ مستقلاً" کسی ڈاکٹر کو اپنے پاس رکھیں۔ یا نرسیں چوبیس گھنٹے آپ کی دیکھ بھال کریں۔"

"بہرحال میں اسپتال سے جانے کا فیصلہ کر چکا ہوں اور آپ سے تعاون کا خواستگار ہوں۔" میں نے کہا۔

"مگر آپ تو چلنے پھرنے کے قابل بھی نہیں۔ آپ کو ایمبولینس میں گھر پہنچانا پڑے گا۔ میں اس سلسلے میں کوئی ذمے داری قبول کرنے پر آمادہ نہیں۔ میرے نزدیک یہ ایک رسک ہے' ایک زندگی کا رسک۔ آپ اپنی ذمے داری پر یہاں سے جا سکتے ہیں کیوں کہ ہم زبردستی آپ کو یہاں نہیں روک سکتے۔ رہا نرسوں اور ڈاکٹر کا معاملہ تو کل تک میں یہ بندوبست کر سکوں گا۔"

"ٹھیک ہے' میں کل تک انتظار کر لوں گا۔" میں نے مطمئن لہجے میں کہا۔

پھر ایک گھنٹے بعد ہی میں اسپتال کی ایمبولینس میں اسد گنج جا رہا تھا۔ وہیں میری کوٹھی تھی جس میں تقریباً" نصف درجن ملازم تھے اور اتنی ہی ملازمائیں۔

مجھے خلاف توقع اسپتال سے گھر آتے دیکھ کر وہ سب گھبرا گئے اور کشاں کشاں مجھے میری خواب گاہ میں پہنچا دیا۔ ان کے چہروں سے میں نے اندازہ لگایا کہ شاید وہ سمجھ رہے تھے۔ مجھے ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔ میں اسی لیے گھر آگیا ہوں۔

میری ساری ملازمائیں حسن بنگال کا جیتا جاگتا شاہکار تھیں' بڑی بڑی سیاہ آنکھیں' گھنی زلفیں اور چھریرے جسم! انہیں زیر دام لانے کے لیے مجھے پراسرار قوت کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ مکمل آرام و آسائش اور ہر طرح کی کھلی آزادی نے انہیں میری کنیزیں بنا دیا تھا۔ دولت میں بھی اپنی ایک قوت ہوتی ہے اور وہ سب اسی قوت کے زیر اثر تھیں۔

وہ طرح طرح سے میری خدمت گزاری کرنے لگیں اور میرا جی بہلانے کی کوشش کرنے میں مصروف ہو گئیں۔

مجھے آج ہی رات سے ہمزاد کا عمل شروع کرنا تھا اسی لیے میں نے انہیں مخصوص ہدایات دے دیں جسے وہ حیرت اور توجہ سے سنتی رہیں۔ ملازماؤں کو ہدایات دیتے ہوئے مجھے اس قلمی نسخے خیال آیا جسے میں نے اب تک اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھا تھا۔ فارسی زبان میں بہ آسانی بول اور پڑھ سکتا تھا۔ ہمزاد کو قابو میں کرنے کا عمل میں نے اسی سے دیکھا تھا اس قلمی

نسخے میں بہت سے عمل لکھے تھے جن میں رحمانی بھی تھے اور شیطانی بھی۔ میں نے ہمیشہ رحمانی عملیات کو ترجیح دی تھی اس لیے کہ بچپن سے میرے مزاج پر مذہب کا گہرا اثر تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ہمزاد کو قابو کرنے کے بعد میرا شیطان مجھ پر غالب آگیا تھا اور میں نے نماز بھی ترک کر دی تھی۔ لیکن رحمانی عمل کرنے کے دوران میں مجھے نماز شروع کرنا لازمی تھا۔

"اچھا اب تم لوگ جاؤ' کوئی اور بات کہنا ہوئی تو بلا لوں گا۔" میں نے ملازماؤں سے کہا۔ "ہاں ارشاد علی کو بھیج دینا۔"

ارشاد علی کی حیثیت میرے خادم خاص کی سی تھی۔ وہ فوراً ہی آگیا۔

"سنو!" میں نے اسے مخاطب کیا۔ "تمھیں دو کمرے مہمانوں کے لیے صاف کرنا ہیں۔ ایک کمرے میں نرسیں رہیں گی' دوسرے میں ڈاکٹر۔ کل یہ لوگ کسی وقت بھی آسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ یہ کہ میرے کمرے کے باہر دن اور رات کے وقت بھی کوئی نہ کوئی ملازم موجود رہنا چاہیے جسے میں فوراً آواز دے کر بلا سکوں۔ آج کے بعد سے کوئی ملازمہ میرے کمرے میں نہیں آئے گی۔ یہ میں نے انھیں بھی سمجھا دیا ہے۔ میں کسی ملاقاتی سے بھی ملنا پسند نہیں کروں گا۔ خواہ وہ میرا کوئی عزیز دوست یا اس سے کاروباری تعلق ہو۔ بغیر طلب کیے کوئی میرے کمرے میں نہیں آئے گا۔ سمجھ گئے؟"

جی سرکار ایسا ہی ہو گا۔" اس نے سعادت مندی سے جواب دیا۔ مجھے اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نظر آرہے تھے کیوں کہ وہ تمام رازہائے درون خانہ سے واقف تھا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی ملازماؤں پر اس قسم کی پابندی نہیں لگائی تھی۔

"اور سنو! کھانا پرہیزی ہو گا۔ گوشت' انڈا اور مچھلی کھانے میں نہیں ہو گی۔ بس تمھیں یہ خیال رکھنا ہے کہ کھانا زود ہضم ہو' سادہ ہو۔" میں نے قلمی نسخے کی وہ ہدایات دہرائیں جو میرے ذہن میں پوری طرح محفوظ تھیں۔ "باقی جو ہدایت ہوئی' میں تمھیں کچھ دیر بعد بلا کر دے دوں گا۔"

"بہتر ہے سرکار!" اس نے ادب سے جھک کر کہا اور پھر میرے ہاتھ کے اشارے کو سمجھ کر وہاں سے چلا گیا۔

معدے میں سرطان ہونے کی وجہ سے یوں بھی میری خوراک نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ میں بہت دن سے پرہیزی کھانا کھا رہا تھا' وہ بھی دواؤں کے بل بوتے پر!

ارشاد علی چلا گیا تو میں آہستہ آہستہ بستر سے اٹھا اور سامنے ہی ایک دیوار سے لگی ہوئی الماری کی طرف بڑھا۔ اس الماری میں میرے ذوق مطالعہ کی تسکین کے لیے بہت سی

اور نایاب کتب موجود تھیں۔ ان میں زیادہ تعداد فارسی زبان کے شعراء کے مجموعوں کی تھی' نظیری' بے دل' حافظ' عمر خیام' مولانا روم اور دوسرے اہم شعراء کا کلام انھی کتابوں کے درمیان وہ قلمی نسخہ بھی تھا۔ میں نے الماری سے وہ قلمی نسخہ نکال لیا' پھر الماری بند کر کے بستر پر نیم دراز ہو گیا۔ یہی وہ قلمی نسخہ تھا جس کی طفیل میں نے ہمزاد کو قابو کیا تھا اور ایک سو تیس سال کی عمر میں بھی زندہ تھا۔

قلمی نسخے کی ورق گردانی کرتے ہوئے مجھے اب سے سو سال پہلے کے واقعات یاد آرہے تھے جب میں ایک غریب اور مفلوک الحال نوجوان تھا۔ ہمزاد کو قابو میں کرنے کے لیے میں نے کئی بار عمل کیا تھا اور ناکام رہا تھا۔ پھر ایک عمل کامیاب رہا تھا۔ اس وقت تو زندگی نے مجھے مہلت نہ دے تھی کہ ایک مرتبہ ناکام رہوں تو دوبارہ کوئی دوسرا عمل شروع کر دوں' مگر اب یہ صورت حال نہیں تھی مجھے ایک ہی بار میں کامیاب ہونا تھا۔

مجھے یاد آیا کہ "عمل شمعی" نے مجھے کامیابی سے ہم کنار کیا تھا اور وہ تھا بھی ان عملوں میں سے ایک جو رات کے وقت ہی کیے جاتے ہیں۔ اب میرے سامنے قلمی نسخے کا جو صفحہ کھلا ہوا تھا' وہ چند ہدایات پر مشتمل تھا جو عمل کے دوران میں ضروری تھیں۔ انھیں میں سے کچھ ہدایات میں اپنے ملازموں کو دے بھی چکا تھا۔

لکھا تھا۔ "جو عورت ماں بننے والی ہو' وہ عمل نہ کرے۔"

اس ہدایت کا مجھ سے تعلق نہ تھا۔ میں نے دوسی ہدایت پڑھی۔ جس شخص کا کوئی عضو معطّل ہو' مثلاً" ہاتھ یا پاؤں کٹا ہوا یا بدن میں کوئی نمایاں نقص ہو وہ عمل نہ کرے"۔ میں اس ہدایت پر بھی پورا اترتا تھا۔ میرے ہاتھ پیر سلامت تھے اور کوئی جسمانی عضو کٹا ہوا یا معطل نہ تھا۔

میں نے تیسری ہدایت پر نظر ڈالی۔ "جس شخص کو کوئی دماغی مرض ہو' مثلاً" سکتہ یا مرگی وغیرہ وہ عمل نہ کرے جب تک کہ پوری طرح صحت مند نہ ہو جائے۔" میں کسی ایسے دماغی عارضے میں مبتلا نہیں تھا۔

پھر چوتھی ہدایت پر نظر پڑتے ہی میں چونک اٹھا۔ "زخمی حالت میں عمل شروع نہیں کرنا چاہیے' خواہ انتہائی معمول زخم ہو۔"

میں اس شرط پر پورا نہیں اترتا تھا' یہ سوچ کر میرا دل ڈوبنے لگا کیوں کہ میری گردن سے خون رس رہا تھا۔ میری گردن کی اطراف زخم تھا۔ کچھ دیر تک میں اس سناٹے کے عالم میں آنکھیں بند کیے لیٹا رہا۔ پھر معاً" میرے ذہن میں روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا۔ میں نے

سوچا کہ یہ جو تمام ہدایات ہیں' پہلی بار ہمزاز کو قابول میں کرنے کے لیے ہیں جب کہ میرا معاملہ قطعی مختلف ہے۔ میں تو اپنے ہمزاد کو دوبارہ مسخر کر رہا ہوں۔ اس سے قطع نظر یہ کہ اس کا علم ہمزاد کو بھی تھا۔ اگر یہ ضروری ہوتا تو وہ مجھ سے اس کا ذکر کرتا۔ اس نے تو یہ بھی بتا دیا تھا کہ میرے سر اور بقیہ جسم کا رابطہ کمزور ہو جائے گا اور گردن جہاں سے جوڑی گئی ہے' وہاں سے خون رسنے لگے گا۔ اگر اس حالت میں عمل کرنا' ممکن نہ ہوتا تو وہ مجھے ایسا کرنے سے روک دیتا۔ پھر یہ گردن کا زخم' فطری نہیں' غیر فطری تھا۔

قلمی نسخے میں ہمزاد کی دوبارہ تسخیر کے بارے میں کچھ بھی درج نہ تھا۔ میں نے البتہ آخری ہدایت پر بھی نظر ڈالی جس کا پہلے ہی بندوبست کر چکا تھا۔ لکھا تھا کہ فعل حیوانی کے عادی کو عمل نہیں کرنا چاہئے کیوں کہ عمل کے دوران میں اس سے قطعی پرہیز کرنا پڑے گا۔

انہی ہدایات کی ذیل میں کھانے وغیرہ سے متعلق باتیں بھی درج تھیں۔ جو میں ارشاد علی کو بتا چکا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ہر روز نہانا' سر پر مالش کرنا وغیرہ! رات کا عمل ہو تو دن میں خوب سونا ضروری تھا۔ اونگھنے سے عمل باطل ہو جاتا تھا۔ عمل کے وقت دل میں کسی قسم کا شک یا شبہہ نہیں ہونا چاہیے۔ اپنی حفاظت کا پورا بندوبست رکھنا بھی ضروری تھا تاکہ عمل کے وقت کوئی بھی مداخلت نہ کرے۔ میں یہ بندوبست بھی کر چکا تھا۔ اب طلب کیے بغیر کوئی ملازم میری خواب گاہ میں داخل ہونے کی جرأت نہ کرتا۔ ضروریات کی تمام چیزیں عمل کرتے وقت پاس ہونا چاہئیں تاکہ عمل چھوڑ کر اٹھنا نہ پڑے۔ بہتر یہ ہے کہ بدن پر صرف ایک کپڑا ہو۔ ان دنوں میں غصہ اور لڑائی جھگڑا بھی منع تھا۔ زیادہ وقت مطالعے میں گزارنا مفید تھا' وہ بھی ایسی کتابوں کا مطالعہ جو دل میں گداز اور لطافت پیدا کریں' کسی ہیجان میں مبتلا نہ کریں۔ اس کے علاوہ جگہ اور وقت کی پابندی انتہائی ضروری تھی۔

عمل کے لیے ضروری ہدایات پڑھنے اور انہیں ذہن نشین کرنے کے بعد میں نے قلمی نسخے میں وہ صفحہ تلاش کیا جس پر "عمل شمعی" درج تھا۔ اس باب میں بھی ضروری ہدایات درج تھیں جن میں سے بیشتر مجھے زبانی یاد تھیں' پھر بھی توجہ سے پڑھنے لگا کہ کہیں کوئی بات ذہن سے نکل نہ گئی ہو۔ یہ میری زندگی اور موت کا معاملہ تھا۔ ذرا سی کوتاہی مجھے موت کی آغوش میں پہنچا سکتی تھی۔ میں اسی لیے ایک ایک بات پر توجہ دے رہا تھا۔

قلمی نسخے "عمل شمعی" کی ذیل میں لکھا تھا۔ "کانسی کا ایک چراغ جلا کر ایک صاف ستھرے کمرے میں رکھا جائے اور چراغ کی طرف پشت کر کے اول اول بائیس دن' رات بارہ بجے سے دو بجے تک عمل کیا جائے۔ عمل کے دوران میں جب اپنے سائے کی گردن پر نظر

جمائے جمائے تھک جائے تو چھت کی طرف نظر اٹھا کر اپنے سائے کا تصور کرے اور پھر دوبارہ اپنے سائے کی گردن پر نظر جما دے۔ بائیس دن گزر جانے کے بعد رات بارہ بجے سے فجر کی اذان ہونے تک عمل جاری رکھنا تھا۔

ان ابتدائی بائیس دنوں کے متعلق مزید چند ہدایات درج تھیں جن پر مجھے عمل کرنا تھا۔ مجھے سب سے پہلے تو اپنے نام کے اعداد نکالنا تھے جتنے اعداد نکالنا تھے اتنی ہی مرتبہ روز رات کے وقت دو گھنٹے عمل کرنے کے بعد' یعنی رات دو بجے کے بعد مجھے وہ عمل شیشہ سامنے رکھ کر اپنی شکل پر نظر جمائے ہوئے دوبارہ عمل کے الفاظ دہرانا تھے۔ دل میں مجھے یہ رکھنا تھا کہ میرا ہمزاد بہت جلد شیشے سے باہر آ کر میری اطاعت کرے گا۔ عمل کرتے وقت مجھے ایک روٹی پر ذرا سا گھی اور شکر بھی رکھنا تھا۔ بعد میں اس روٹی پر عمل دم کر کے کسی ایسے چوراہے پر اس روٹی رکھنا تھا جو عام گزر گاہ نہ ہو' جہاں سے کم لوگ گزرتے ہوں یا بالکل نہ گزرتے ہوں۔ روٹی' چراہے پر رکھ کر مجھے یہ الفاظ ادا کرنا تھے۔

"اے ہمزاد! یہ تم کھالو!"

اس کے بعد مجھے واپس آ جانا تھا۔ اس دوران میں نہ مجھے پیچھے مڑ کر دیکھنا تھا اور نہ راستے میں آتے جاتے کسی سے گفتگو کرنا تھا۔ روٹی مجھے صبح ہونے سے پہلے کسی چوراہے پر رکھ آنا تھی۔ مجھے پورے بائیس دن یہ کرنا تھا اور تیسویں دن روٹی نہیں پہنچانا تھی۔ اگر خواب میں یا تحریر سے یا زبانی ہمزاد مجھ سے کہے کہ آج روٹی کیوں نہیں بھیجی؟ تو مجھے سمجھ لینا چاہیے کہ عمل کامیابی کی طرف گام زن ہے۔ ایک دن ناغہ کے بعد چوبیسویں دن سے مجھے پھر روٹی پہنچانا شروع کر دینا تھا۔ اگر ہمزاد زبانی شکایت کرے تو مجھے یہ جواب دینا تھا کہ اب روٹی برابر پہنچائی جائے گی۔ اگر ہمزاد' خواب یا تحریر کے ذریعے استفسار کرے تو جواب دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کے بعد مجھے اپنا بقیہ عمل جاری رکھنا تھا' پورے چالیس دن ہونے تک! عمل کے دوران میں مجھے اپنی چاروں طرف ایک حصار بھی کھینچنا تھا اور کسی قیمت پر وقت پورا ہونے سے پہلے حصار کے باہر قدم نہیں رکھنا تھا۔

میں نے آخر میں عمل کے الفاظ بھی دہرا لیے تاکہ ذہن میں تازہ رہیں۔ یہ عمل کیوں کہ رحمانی تھا اس لیے عمل کے دوران میں دونوں آیتیں قران کی سورۂ فرقان کی چوالیسویں اور پینتالیسویں آیتیں تھیں۔ سورۂ فرقان' قرآن کے انیسویں پارے میں ہے۔ میں یہاں ان آیتوں کا ترجمہ لکھ رہا ہوں جو میں نے قلمی نسخے میں درج دیکھی تھیں۔ مجھے ان کا ترجمہ نہیں۔ اصل عبارت عربی میں پڑھنا تھا۔ ان دونوں آیتوں کا ترجمہ مندرجہ ذیل ہے۔

"..... بلکہ تم نے اپنے پروردگار کو نہیں دیکھا کہ وہ سائے کو کس طرح دراز کردیتا ہے! اگر وہ چاہتا تو اسے ٹھہرائے رکھتا۔ پھر سورج کو اس کا رہنما بنا دیتا ہے۔ پھر ہم اسے اپنی طرف سمیٹ لیتے ہیں۔"

دونوں آیتوں کو میں نے ذہن نشین کرلیا جو پہلے سے مجھے تھوڑی بہت یاد تھیں۔ مجھے آج ہی رات سے عمل شروع کرنا تھا اس لیے تمام ضروری اشیاء میں نے اپنی خواب گاہ میں منگوالیں۔ چراغ اور تیل کا بندوبست بھی کرلیا۔ اس کے علاوہ روئی، شکر، گھی اور ایک آئینہ بھی فراہم کرلیا تاکہ عمل کے دوران میں مجھے کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ جو ملازم رات کے وقت خواب گاہ کے باہر رہتا تھا، اسے یہ ہدایت کردی کہ رات دو بجے کے بعد میں اپنی خواب گاہ سے نکل کر کہیں جاؤں گا۔ وہ اس دوران میں مجھ سے کوئی کلام نہ کرے اور اس وقت تک حویلی کے دروازے کھلے رکھے جب تک میں لوٹ نہ آؤں۔ رات کی یہ ڈیوٹی میرے کہے بغیر ارشاد علی نے سنبھال لی جس پر مجھے پورا اعتماد تھا کہ میری ہدایات پر عمل کرے گا۔

وقت دھیمی رفتار سے بہتا رہا اور آخر نصف شب قریب آنے لگی۔ میں نے پاک صاف ہونے کے لیے غسل کیا اور صرف ایک تہ بند ستر پوشی کے لیے باندھ لیا۔ پھر ٹھیک بارہ بجے میں نے چراغ روشن کردیا اور اس کی طرف سے پشت کرکے زمین پر حصار کھینچ کر بیٹھ گیا۔ میرا سایہ سامنے والی دیوار پر پڑ رہا تھا۔ میں نے اس کی گردن پر نگاہ جما کر دونوں آیتوں کا ورد شروع کردیا۔ ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ اپنی گردن میں مجھے سخت تکلیف محسوس ہوئی۔ ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق شاید دوا کا اثر اب ختم ہو رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی آہستہ آہستہ میری گردن پر خنجر پھیر رہا ہے۔ اذیت لحہ بہ لحہ بڑھتی گئی اور میرے منہ سے کراہیں نکلنے لگیں۔ مجھے خوف سا محسوس ہوا کہ کہیں میں بیٹھے بیٹھے گر نہ پڑوں۔ عمل کا ورد اب بھی جاری تھا۔ میں ایک لمحے کو بھی نہیں رکا تھا۔ میں کسی قیمت پر بھی ادھورا چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔

نظر تھک گئی تو میں نے ہدایت کے مطابق چھت کی طرف دیکھا اور اپنے سائے کا تصور کیا۔ سایہ کچھ منتشر منتشر سا تھا۔ اسی وقت ایک زہریلا قہقہہ مہ پارہ کا تھا۔ قہقہے کے بعد مجھے اس کی آواز بھی سنائی دی۔ "اے شیخ! تم میرے چنگل سے نکلنا چاہتے ہو! مگر میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ تم نے اپنا عمل پورا کرلیا تو پھر میری دسترس سے نکل جاؤ گے کیوں کہ یہ تمہارا نیا جنم ہوگا جس پر مجھے اختیار نہ رہے گا۔ پھر میں تمہیں خواہش کے باوجود کسی مصیبت، آزار میں مبتلا نہ کرسکوں گی۔ میں اسی لیے عالم برزخ سے پھر تمہاری دنیا میں لوٹ آئی ہوں کہ

تمہیں یہ عمل پورا نہ کرنے دوں۔ ہاں میرے انتقام سے بچنے کی صرف ایک صورت ہے، وہ یہ کہ تم اپنی موت کو قبول کرلو اور میرے پاس آجاؤ۔"

وہ کہے جا رہی تھی اور اب مجھے اس کا ہیولا بھی اپنے سائے کے ساتھ دیوار پر نظر آرہا تھا، مگر میرا ورد اب بھی جاری تھی۔ میں جواب میں کچھ کہتا تو میرا عمل ختم ہو جاتا۔ اس نے بڑی کوشش کی کہ میں کچھ بولوں، مگر ناکام رہی۔

"اچھا تو یوں نہیں مانو گے!" اس کا لہجہ سخت ہو گیا۔ یقیناً" اب وہ مجھ پر کوئی نیا حربہ آزمانے والی تھی جس کے بارے میں مجھے قطعی علم نہیں تھا ورنہ پہلے ہی سے اس کا بھی کوئی توڑ سوچ لیتا۔

اچانک میری خواب گاہ اس کی بھیانک چیخوں سے گونجنے لگی۔ اب تک میرے تجربے میں یہی آیا تھا کہ اس کی آواز، قہقہے اور چیخیں صرف میں ہی سن سکتا تھا، کوئی اور نہیں، مگر اس رات ایسا نہیں ہوا۔ اس کا اندازہ مجھے چند ہی لمحے بعد ہو گیا۔

میں نے کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ کمرے میں داخل ہونے والا میرا خادم خاص ارشاد علی تھا جسے میں نے اس کی آواز سے پہچانا کیوں کہ میری نگاہ اپنے سائے پر جمی ہوئی تھی۔ مجھے ارشاد علی کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

"کیا ہوا سرکار؟ یہ..... یہ کون عورت..... کس کی چیخ تھی؟"

ظاہر ہے کہ میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور عمل کا ورد کرتا رہا۔ اس لمحے دیوار جہاں میرا سایہ پڑ رہا تھا اس کے بالکل نیچے مہ پارہ زمین پر دراز نظر آئی۔ اس کے سینے میں دستے تک ایک خنجر پیوست تھا اور سینے سے خون اُبل اُبل کر فرش پر بہہ رہا تھا۔ وہ بری طرح تڑپ رہی تھی اور چیخ بھی رہی تھی۔

یہ منظر دیکھ کر شاید ارشاد علی کو پہلے تو سکتہ ہو گیا، پھر وہ بھی چیخ اٹھا، میں مجبور تھا، کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس احمق نے کمرے کا دروازہ کھول کر یقیناً" بہت بڑی حماقت کا ثبوت دیا تھا۔

"خون!..... خون! وہ ہذیانی انداز میں چیخے جا رہا تھا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً" میرے سارے ہی ملازم، خواب گاہ میں جمع ہو گئے، مگر کسی میں اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ مہ پارہ کے تڑپتے ہوئے جسم کے قریب جا سکتا۔ میں اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ مہ پارہ کی روح نے مجھے اور میرے ملازموں کو فریب نظر میں مبتلا کردیا ہے۔

معاً" ایک ملازم نے ایک ایسی بات کہی کہ میرا خون کھول اٹھا۔ وہ ارشاد علی سے کہہ

رہا تھا کہ فوراً" پولیس کو مطلع کر دینا چاہیے ورنہ اس لڑکی کے قتل کے الزام میں ہم سب بھی دھر لیے جائیں گے۔

ارشاعلی تذبذب کا شکار تھا کیوں کہ کئی بار کوشش کے باوجود میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ "جب تک سرکار خود حکم نہ دیں ہم پولیس کو کس طرح بلا سکتے ہیں! کیا خبر سرکار اس بات کو پسند بھی کریں یا نہ کریں!

"سرکار تو شاید کوئی عمل کر رہے ہیں۔" ایک ملازم بولا۔ "اور مجھے معلوم ہے کہ عمل کے دوران میں عامل کچھ بولتا نہیں، مگر خدا نے ہمیں تو عقل دی ہے کہ ایسے موقع پر کیا کرنا چاہئے! میرے خیال میں پولیس کو بلانا ضروری ہے۔"

"یہ تم ٹھیک کہتے ہو، لیکن پولیس آگئی تو سرکار کو اس سے بات کرنا پڑے گی اور تم خود ہی کہہ چکے ہو کہ عامل، عمل کے دوارن میں نہیں بولتا..... پھر خود سرکار نے بھی تو ہدایت دی تھی کہ بغیر طلب کیئے کوئی ان کے کمرے میں نہ آئے۔" ارشاد علی کو عقل آتی جا رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ شاید وہ معاملے کو سنبھال لے گا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔

وہی پہلا ملازم جس نے پولیس کو مطلع کرنے کا مشورہ دیا تھا، ایک دم بولا اٹھا۔ "تم ہو کس دھیان میں ارشاد علی! یہ ایک لڑکی کے قتل کا معاملہ ہے۔ ہم سب باندھ لیے جائیں گے۔ سرکار تو بڑے آدمی ہیں، لے دے کر چھوٹ جائیں گے، مگر ہمارا کیا بنے گا! نہیں..... ہرگز نہیں! اگر تم پولیس کو اطلاع نہیں دو گے تو میں خود پولیس اسٹیشن جا رہا ہوں۔"

دوسرے تین ملازم بھی اس کے ہم نوا بن گئے۔ اس دوران میں مہ پارہ کا جسم تڑپ تڑپ کر ساکت ہو چکا تھا۔

"سنو تو سہی تم لوگ!" ارشاد علی نے انہیں روکنا چاہا۔

"ہاں کہو، کیا بات ہے؟" پہلے ملازم نے ناراضگی کے لہجے میں کہا۔

"اس قتل کی اطلاع صبح بھی تو دی جا سکتی ہے، جب تک سرکار اپنے عمل سے بھی فارغ ہو جائیں گے۔" ارشاد علی نے اسے سمجھایا۔

"بالکل نہیں!" پہلا ملازم سختی سے بولا۔ "پولیس ہم سے پوچھے گی کہ ہم نے رات ہی کو قتل کی اطلاع کیوں نہیں دی؟ پھر وہ ہم پر شک کرے گی کہ ہم بھی قتل میں شریک تھے۔"

ارشاد علی کے سمجھانے بجھانے کا اس ملازم اور اس کے ہم نوا ملازموں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ چاروں کمرے سے چلے گئے اب وہاں ارشاد علی اور ایک ملازم رہ گیا۔ اس عرصے میں چیخ پکار کی آوازیں سن کر میری ملازمائیں بھی دروازے کے باہر آ کھڑی ہوئی تھیں اور اندر کا

منظر دیکھ کر ان کے منہ سے بھی چیخیں نکل گئی تھیں۔ میری ہدایت سے قطع نظر انہوں نے خوف کے سبب خواب گاہ میں قدم نہیں رکھا تھا۔

مجھے پہلے یہ اندازہ نہیں تھا کہ مہ پارہ کی روح اس طرح معاملے کو بگاڑ کر میرے لیے مشکلات پیدا کر دے گی۔ میں اس لیے سخت پریشان تھا، مگر عمل کا ورد اب بھی جاری تھی۔

میرے چار ملازم پولیس اسٹیشن، قتل کی اطلاع دینے جا چکے تھے اور اب کسی بھی وقت پولیس وہاں پہنچ سکتی تھی۔ جس طرح مہ پارہ نے مجھے اور میرے ملازمین کو فریب نظر میں مبتلا کر دیا تھا، اسی طرح وہ پولیس والوں کو بھی فریب نظر کا شکار بنا سکتی تھی۔ ایسی صورت میں پولیس کا سلوک میرے ساتھ کیا ہوتا، یہ ظاہر تھا۔ وہ مجھے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیتے اور پولیس اسٹیشن لے جاتے۔ یوں مجھے اپنا عمل ختم کرنا پڑتا جس کے لیے ضروری تھا کہ میں حصار سے باہر نہ آؤں۔ حصار سے نکلتے ہی میرا عمل باطل ہو جاتا۔

میں نے اس وقت خود کو بہت مجبور اور بے بس محسوس کیا۔ عمل کی پہلی ہی شب مجھ پر بہت گراں گزر رہی تھی۔ میں سمجھ چکا تھا۔ کہ عمل پورا ہونے کے بعد میں، مہ پارہ کے چنگل سے نکل جاؤں گا جیسا کہ اس نے خود کہا تھا، اس نے اسی لیے پہلی ہی رات بھرپور حملہ کیا تھا، ایسا حملہ جس کا کوئی توڑ میرے پاس نہیں تھا۔

عمل شروع کیے ابھی مجھے بہ مشکل پون گھنٹا ہوا تھا۔ ابھی صبح دور تھی۔ صبح کی اذان ہونے سے پہلے میں کسی سے کلام نہیں کر سکتا تھا۔ عمل ترک ہونے کا مطلب میری یقینی موت تھی کیوں کہ ایک دن اس طرح ضائع ہو جاتا اور میں چالیس دن کی مدت میں عمل پورا نہ سکتا۔

ایک طرف تو گردن کی شدید تکلیف، دوسری طرف عمل کا ورد اور تیسری جانب مہ پارہ کا جال! اور میں اس کے پھیلائے ہوئے جال میں پوری طرح پھنس چکا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کروں تو کیا کروں!

مہ پارہ کی لاش اب تک میرے سائے کے قدموں میں پڑی تھی۔ خنجر اسی طرح دستے تک اس کے سینے میں پیوست تھا اور فرش پر خون پھیلا ہوا تھا۔

ارشاد علی کے جی میں جانے کیا آئی کہ وہ میری خواب گاہ سے نکل گیا اور ساتھ ہی ساتھی ملازم کو بھی وہاں سے لے گیا۔ پھر میں نے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کرنے کی آواز سنی۔ نہ جانے اس نے کیا سوچا تھا!

ان دونوں ملازمین کے کمرے سے جاتے ہی مہ پارہ کے قہقہے سے ایک بار پھر کمرا گونج

اٹھا۔ لاش غائب ہو گئی اور اس کا ہیولا پھر میرے سائے کے قریب دیوار پر نظر آنے لگا۔ اس نے مجھے مخاطب کیا۔ "شیخ! میری مرضی اور خواہش کے مطابق تمہارا عمل باطل ہونے والا ہے۔ کچھ دیر جاتی ہے کہ پولیس تمھیں یہاں سے گرفتار کر کے لے جائے گی اور اس طرح تم اپنا عمل پورا نہ کر سکو گے۔ دیکھ لو کہ پہلی ہی رات کو میں نے تمہیں شکست دے دی۔ اب پولیس کی آمد کا انتظار کرو' اس کے سوا تمہارے پاس کوئی چارہ نہیں۔ جیسے ہی پولیس تمہاری خواب گاہ میں داخل ہو گئی' میں پھر لاش بن جاؤں گی۔ ہاں ایک شرط ہے۔ اگر تم میری شرط مان لو تو میں اب بھی بگڑے ہوئے حالات پر قابو پا سکتی ہوں۔ جواب دو شیخ کہ کیا تم شرط سننے اور اسے ماننے پر آمادہ ہو؟ اس طرح تم یقینی موت سے بچ جاؤ گے۔"

یہ بھی اس کا فریب تھا۔ اس کی بات کا جواب دینے کے بعد مجھے عمل کا ورد ترک کرنا پڑتا۔ میں اسی لیے چپ رہا۔

"سنو! میں جانتی ہوں کہ تم اس عالم میں کلام نہیں کر سکتے۔ تو اگر میری شرط سننے اور اس پر عمل کرنے پر تیار ہو تو اپنی گردن اقرار میں ہلا دو' میرے لیے اتنا ہی کافی ہو۔" مہ پارہ نے کہا۔

وہ میری دشمن تھی اور دشمن سے کسی بھلائی کی توقع کرنا حماقت کے سوا کچھ اور نہیں۔ اگر وہ بگڑے ہوئے معاملے کو سنبھالنا ہی چاہتی تو یہ سب ہنگامہ کیوں کھڑا کرتی! یقیناً" وہ اس طرح مجھ پر کوئی نیا حربہ آزمانا چاہتی ہے۔ میں نے عمل کا ورد کرتے ہوئے سوچا اور بہ دستور خاموش رہا۔ میں نے گردن بھی اقرار میں نہیں ہلائی۔

"میں سمجھ گئی تم مرنا ہی چاہتے ہو ورنہ گردن ہلا کر اقرار کر لیتے!" مہ پارہ کسی ناگن کی طرح پھنکاری۔ "ٹھیک ہے۔ نہ سنو میری شرط اور موت کو گلے لگانے پر تیار ہو جاؤ کہ یہی تمہاری قسمت ہے!"

پھر کچھ دیر وہ خاموش رہی اور میرے بولنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔

معاً" میری سماعت سے بھاری قدموں کی آواز ٹکرائی۔ میں سمجھ گیا کہ پولیس میرے گھر میں داخل ہو چکی ہے۔ مہ پارہ ایک بار پھر لاش بن گئی۔ قدموں کی دھمک دروازے کے قریب آ گئی اور پھر دروازہ دھڑا دھڑایا جانے لگا۔

"دروازہ کھولو!.... پولیس!" کسی نے چیخ کر کہا۔

"اس میں تو باہر سے تالا پڑا ہے۔" باہر ہی سے کسی کی آواز آئی۔

"اس کی چابی کس کے پاس ہے؟" کسی نے سوال کیا۔

"ارشاد علی کے پاس۔" میں نے اپنے ملازم کی آواز سنی۔

"وہ کہاں ہے؟" اور دریافت کیا گیا۔

"ہم اُسے اور رحمت کو یہیں چھوڑ کر گئے تھے۔ وہ دونوں جانے کہاں غائب ہو گئے' نظر نہیں آ رہے!" ملازم نے جواب دیا۔

"انہیں تلاش کرو' کوٹھی ہی میں کہیں چھپے ہوں گے۔ اس قتل میں وہ بھی ملوّث معلوم ہوتے ہیں۔ اگر وہ کوٹھی میں نہیں ہیں اور فرار ہو چکے ہیں تو یقیناً" مجرم ہیں۔"

کچھ دیر اور گزر گئی۔ اس دوران میں باہر سے پولیس والوں کے باتیں کرنے کی آوازیں آتی رہیں۔ پھر جو ملازم' ارشاد علی کو تلاش کرنے گئے تھے' انہوں نے واپس آ کر بتایا کہ ارشاد علی اور رحمت' کوٹھی میں کہیں نہیں ہیں۔

"ایسی صورت میں کمرے کا تالا توڑ کر ہی ہم اندر داخل ہو سکتے ہیں۔" کسی پولیس والے نے مشورہ دیا۔

پھر ذرا دیر بعد ہی قفل پر ضربیں پڑنے کی آوازیں آنے لگیں اور میرا دل ڈوبنے لگا۔ ارشاد علی نے اپنی سی کوشش کر لی تھی۔ کہ پولیس مجھ تک نہ پہنچ سکے' مگر وہ یہ بھول گیا تھا کہ پولیس' تالا توڑ کر بھی اندر داخل ہو سکتی ہے۔ قفل توڑنے کے لیے جو ضربیں لگائیں جا رہی تھیں۔ وہ ضربیں جیسے براہ راست میری روح پر پڑ رہی تھیں۔ اب کسی بھی لمحے قفل ٹوٹ جاتا اور پھر پولیس اندر آ جاتی۔ اس کے بعد کیا ہوتا؟ یہ سوچنا بھی میرے لیے سوہانِ روح تھا۔

○○.....○.....○○

مجھے پوری طرح احساس تھا کہ صورت حال بہت سنگین ہو چکی ہے اور میں بے بس ہوں۔ اس خطرناک عورت نے مر کے بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ اس کا انتقام واقعی بہت بھیانک تھا۔ کاش میں نے اس کی آرزو نہ کی ہوتی' اس کے حصول کو اپنی انا کا مسئلہ نہ بنایا ہوتا' مگر اب یہ سب کچھ سوچنا فضول تھا۔ وقت گزر چکا تھا اور گزرا ہوا وقت کبھی واپس نہیں آتا۔ یہ میری زندگی اور موت کا معاملہ تھا۔ اگر کسی طرح مہ پارہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتی اور میں ہمزاد کو دوبارہ قابو میں نہ کرپاتا تو میری موت یقینی تھی۔ عمل کا ورد کرتے ہوئے میرے ذہن میں بس یہی ایک سوال باربار گردش کر رہا تھا کہ اس یقینی موت سے کس طرح بچاجاسکتا ہے؟

میرے نزدیک زندگی کی بساط پر کھیلے جانے والا کھیل کچھ دیر کا تھا۔ دروازے کا قفل توڑنے کے لیے ضربیں لگائی جارہی تھیں۔ قفل ٹوٹتے ہی پولیس والے میرے کمرے میں داخل ہو جاتے اور پھر مجھے ایک لڑکی کو قتل کرنے کے الزام میں گرفتار کرلیا جاتا۔ ایسی صورت میں مجھے یقیناً حصار سے باہر آنا پڑتا اور یوں میرا عمل ناکام ہو جاتا۔ مہ پارہ نے میرے لیے مفر کی کوئی راہ نہیں چھوڑی تھی۔ پہلے اس نے چیخ کر میرے ملازمین کو وہاں آنے پر مجبور کیا اور پھر ایک مقتول لڑکی کا روپ دھار لیا۔ اب اس کا نتیجہ میرے سامنے تھا۔

پھر وہ لمحہ آہی گیا جب پولیس والے' تالا توڑ کر میرے کمرے میں داخل ہوگئے۔ میں نے بھاری قدموں کی آوازیں سنیں جو ابھر کو فوراً ہی معدوم ہوگئیں۔ ہرچند کہ پولیس والے پہلے سے ذہنی طور پر تیار ہوں گے کہ انہیں کمرے میں ایک لاش نظر آئے گی' مگر اس کے باوجود وہ شاید اندر آتے ہی ٹھٹک گئے تھے۔ یوں بھی کمرے کی فضا پُراسرار تھی۔ میرے عقب میں چراغ روشن تھا اور میرا سایہ سامنے والی دیوار پر پڑ رہا تھا۔ میں بغیر پلک جھپکائے سائے کی گردن پر نظر جمائے ہوئے زیر لب عمل پڑھنے میں مصروف تھا۔ میرے سائے کے قریب ہی

فرش پر مہ پارہ کی لاش پڑی تھی جس کے سینے میں خنجر پیوست تھا۔ اس کے سینے سے اب تک خون بہہ بہہ کر فرش پر پھیل رہا تھا۔ کمرے میں ایک بوجھل سی خاموشی میں پھیلی ہوئی تھی' ایسی خاموشی جو روح پر بوجھ محسوس ہونے لگ

"اسے..... اس لڑکی کو قتل ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔" بالآخر کسی کی آواز نے اس بوجھل خاموشی میں آواز کا پہلا پتھر پھینکا اور جیسے سحر ٹوٹ گیا' زندگی لوٹ آئی۔

شاید ان لوگوں کی تمام تر توجہ لاش نے اپنی طرف مبذول کرلی تھی۔ اسی لیے کسی کو میرا خیال نہیں آیا تھا۔ ان میں سے ایک جو غالباً انسپکٹر تھا' لاش کی طرف بڑھا اور اس کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ پھر وہ مڑا اور کسی کو مخاطب کیا۔ "کیا تم لوگوں میں سے کسی نے اس لڑکی کو پہلے یہاں دیکھا ہے؟" وہ یقیناً میرے ملازمین سے مخاطب تھا۔ "ادھر آؤ تم لوگ! اس کے چہرے کو غور سے دیکھو۔"

"نہیں صاحب' پہلے کبھی نہیں دیکھا۔" میرے ایک ملازم کی آواز آئی۔

"تم لوگ قریب تو آؤ نا! یہ لاش تمہیں کھا نہیں جائے گی!" پولیس انسپکٹر کے لہجے میں سختی آگئی۔

پھر وہ سب شاید ڈرے ڈرے سہمے سہمے آگے بڑھے اور میں نے ان کے قدموں کی چاپ سنی جو انسپکٹر کے قریب آکر رک گئی۔

"ہاں اب غور سے دیکھو! شاید تمہیں کچھ یاد آجائے۔" انسپکٹر نے انہیں مخاطب کیا۔

ان سب کا جواب وہی تھا' یعنی یہ کہ لڑکی ان کے لیے قطعی اجنبی ہے۔

"کوئی چادر لاؤ اور اس لاش پر ڈال دو۔" انسپکٹر نے حکم دیا۔

وہ کمرہ میری خواب گاہ تھا۔ انہیں چادر وہیں مل گئی۔ میرے دو ملازم' چادر لیے لاش کے قریب پہنچ گئے۔ انسپکٹر بھی اسی جگہ کھڑا تھا۔ لاش کیوں کہ بالکل' میرے سامنے دیوار کے قریب پڑی ہوئی تھی اس لیے وہ سبھی مجھے واضح طور پر نظر آرہے تھے۔ ملازموں نے لاش پر چادر ڈال دی اور دوسرے ہی لمحے ان کے منہ سے حیرت زدہ سی چیخیں نکل گئیں۔ مہ پارہ کی لاش پراسرار طور پر غائب ہو چکی تھی۔ چادر اور فرش کے درمیان کچھ نہ تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ انہوں نے فرش پر چادر بچھادی ہو۔ لمحہ بھر کو مجھے بھی حیرت ہوئی' مگر فوراً ہی میں اس کی وجہ سمجھ گیا۔ مہ پارہ کی لاش کا کوئی مادی وجود نہیں تھا۔ وہ سب کچھ فریب نظر تھا۔

"یہ..... یہ..... لا..... لاش..... کاں..... کہاں غائب ہو گئی!" انسپکٹر ہکلانے لگا۔ "ابھی..... ابھی تو..... یاں..... یہاں تھی۔"

"صا..... صاحب! یہ..... یہ کوئی پُراسرار چکر لگ رہا ہے۔ وہ..... وہ ادھر..... ادھر دیکھیں۔ یہ شاید کوئی عمل کر رہے ہیں۔" کسی سپاہی نے اپنے انسپکٹر کی توجہ میری طرف مبذول کرانا چاہی غالباً اس نے عملیات کے بارے میں کچھ سنا ہوگا۔

انسپکٹر قدم قدم چلتا ہوا میری طرف بڑھنے لگا۔ یقیناً وہ اس سلسلے میں مجھ سے کچھ استفسار کرنا چاہتا تھا۔ میں بہ دستور عمل پڑھنے میں مصروف تھا۔

"سنیئے جناب!" انسپکٹر نے مجھے مخاطب کیا اور مزید ایک قدم میری طرف بڑھایا۔ اب وہ میرے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔

دوسرے ہی لمحے میں نے اسے چیخ کر گرتے ہوئے دیکھا۔ سپاہی اس کی طرف دوڑے اور پھر اسے اٹھانے لگے۔

"کیا ہوا صاحب؟..... کیا ہوا؟" کسی سپاہی نے اپنے افسر سے پوچھا۔

"مجھے یوں..... یوں لگا جیسے کسی نے..... کسی نادیدہ قوت نے پیچھے دھکیل دیا ہو اور..... میں گر گیا۔" انسپکٹر فرش سے اٹھتے ہوئے خوف زدہ سی آواز میں کہنے لگا۔ "یہ..... یہ واقعی کوئی پراسرار معاملہ معلوم ہوتا ہے۔"

مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ نادانستگی میں انسپکٹر میرے گرد کھینچے ہوئے نادیدہ حصار سے ٹکرا گیا تھا۔

"میرا تو مشورہ ہے صاحب کہ یہاں سے چلے جائیں، کہیں ہم لوگ کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں۔" یہ آواز اس سپاہی کی تھی جس نے انسپکٹر کو میری طرف متوجہ کیا تھا۔

"ہاں تم..... تم ٹھیک کہتے ہو، نگران سے پوچھ گچھ....."

"اس وقت یہ کچھ نہیں بولیں گے۔" سپاہی نے انسپکٹر کی بات کاٹ دی۔ "میں نے ایک مولوی صاحب سے سنا تھا کہ عمل کرتے ہوئے عامل کسی سے بات نہیں کرتا۔ اگر آپ پوچھ گچھ ضروری ہی سمجھتے ہیں تو یہ کام کل صبح بھی ہو سکتا ہے۔"

"ہاں پوچھ گچھ ضروری ہے کیوں کہ بہرحال یہ ایک لڑکی کے قتل کا معاملہ ہے۔" انسپکٹر معنی خیز لہجے میں بولا۔ غالباً اس نے یہ سوچا ہوگا کہ کچھ اور نہیں تو مجھ سے رقم تو اینٹھ ہی لے گا۔ دوبارہ وہاں خود آنے کو اس نے شاید اپنی شان کے خلاف سمجھا اسی لیے میرے ملازمین سے بولا۔ "انہیں کل صبح تھانے بھیج دینا۔" اس کے لہجے میں پولیس والوں کی سی سختی تھی۔

"ٹھیک ہے جناب! ضرور ضرور۔" میرے ایک ملازم نے جواب دیا۔

پھر کچھ ہی دیر بعد کمرا خالی ہوگیا۔ پولیس والوں کے ساتھ ساتھ میرے ملازم بھی وہاں

سے کھسک لیے اور جاتے جاتے کمرے کا دروازہ بھیڑ گئے تھے۔ انہوں نے کمرے میں جو پُراسرار منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اس کے بعد شاید ان میں اتنی قوت نہیں تھی کہ وہاں ٹھہر سکتے۔

ان لوگوں کے جاتے ہی میری رُوح سے جیسے کوئی بڑا بوجھ ہٹ گیا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ معاملہ اتنی جلدی نمٹ جائے گا اور یہ کہ میں ان حالات کے باوجود اپنا عمل جاری رکھ سکوں گا۔ حالات یقیناً خطرناک نوعیت اختیار کر گئے تھے، لیکن اس کے باوجود میں نے انتہائی مضبوط قوت ارادی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید مہ پارہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتی۔

معاً ایک بار پھر کمرے میں مہ پارہ کی منحوس آواز گونج اٹھی۔ "شیخ! تم شاید اپنی فتح پر خوشی محسوس کر رہے ہوگے!" اس کی آواز میں چبھن تھی۔ "میں اس سے زیادہ عالم برزخ سے غائب نہیں رہ سکتی ورنہ تمہارا غرور آج ہی خاک میں ملا دیتی، مگر یہ نہ بھولو کہ ابھی یہ پہلی رات ہے اور ابھی عمل پورا ہونے میں بہت راتیں باقی ہیں۔ تم میرے انتقام سے بچ نہیں سکتے!" جاتے جاتے اس نے مجھے دھمکی دی اور پھر اس کی آواز معدوم ہوگئی۔

میری نظر اس وقت تھک چکی تھی اور میں چھت کی طرف دیکھ رہا تھا اس لیے اس کے پُراسرار وجود کو نہ دیکھ سکا۔ میں نے چند لمحے بعد دوبارہ اپنے سائے کی گردن پر نگاہ ڈالی تو وہ جا چکی تھی۔

اسی ہنگامے کے دوران میں دو گھنٹے کا وقت پورا ہو چکا، اب عمل کا دوسرا مرحلہ درپیش تھا۔ میں نے قریب رکھا ہوا شیشہ اٹھا لیا، پھر شیشے میں اپنا چہرہ دیکھتے ہوئے دوبارہ عمل پڑھنے لگا۔ میں نے اسی عرصے میں عمل کی بقیہ ہدایات پر توجہ دی۔ عمل پڑھتے ہوئے میں نے ایک روٹی پر ذرا سا گھی اور شکر رکھی۔ جب مزید دو گھنٹے پورے ہو گئے تو میں نے روٹی پر عمل دم کیا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ اب مجھے اپنی حویلی سے نکل کر کسی ایسے چوراہے تک پہنچنا تھا جو عام گزرگاہ نہ ہو۔

میں روٹی لیے ہوئے اپنے کمرے سے نکلا تو ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے حویلی میں میرے سوا اور کوئی نہ ہو۔ بہرحال میں آگے بڑھتا رہا اور پھر صدر دروازے تک پہنچ گیا۔ جو خلاف توقع مجھے کھلا ہوا ملا۔ میرے ملازمین یقیناً اتنے خوف زدہ ہو گئے تھے کہ انہیں صدر دروازہ بند کرنے کا ہوش بھی نہیں رہا تھا۔ میں باہر نکلنے کے بعد دروازہ بھیڑ کر آگے بڑھ گیا۔

چاٹگام میرا دیکھا بھالا شہر تھا۔ اپنی حویلی سے نکلتے ہی میں فیصلہ کر چکا تھا کہ کدھر کا رخ کرنا ہے! رات کے وقت عموماً سپاہی بھی گشت پر ہوتے ہیں۔ میں نے اسی لیے مطلوبہ چوراہے تک پہنچنے کی خاطر گلیوں کو ترجیح دی تاکہ کسی سے مڈ بھیڑ نہ ہو۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جاتے ہوئے اور واپسی میں نہ مجھے کسی سے گفتگو کرنا تھی اور نہ ہی پیچھے مڑ کر دیکھنا تھا۔

ان تمام مراحل سے میں پہلے بھی ایک بار گزرا تھا اس لیے میرے دل میں کوئی خوف یا وسوسہ نہیں تھا۔ میں بہ آسانی ایک چوراہے تک پہنچ گیا اور روٹی وہاں رکھ کر بلند آواز میں کہا۔ "اے ہمزاد! یہ تم کھالو۔" پھر میں الٹے قدموں واپس ہوا۔

چوراہے تک پہنچنے اور دوبارہ اپنی حویلی تک واپس آتے ہوئے راستے میں مجھے کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا حالانکہ جب میں نے پہلے ہمزاد کا عمل کیا تھا تو ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اس مرتبہ میرا ہمزاد مجھ سے تعاون کر رہا تھا اور میرے عمل میں کوئی رکاوٹ ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔

میں حویلی میں پہنچا تو صورت حال بہ دستور تھی۔ میں نے وضو کر کے فجر کی نماز پڑھی کیوں کہ نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ پھر میں لباس تبدیل کر کے بستر پر دراز ہو گیا۔ رات بھر جاگنے کی وجہ سے مجھے اب نیند آ رہی تھی۔ گردن کی تکلیف اسی طرح تھی، لیکن وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے۔ "درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا" سو میری حالت بھی ویسی ہی تھی اور نیند تو کانٹوں پر بھی آجاتی ہے۔

پھر میں خود سے بیدار نہیں ہوا بلکہ مجھے آواز دے کر جگانے والا میرا خادم خاص ارشاد علی تھا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے آنکھیں کھولتے ہوئے نیند سے بوجھل آواز میں کہا۔

"جناب! تھانے سے ایک سپاہی آیا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ تھانیدار صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔" ارشاد علی نے بتایا۔

گزشتہ شب کے گزرے ہوئے واقعات مجھے ایک ایک کر کے یاد آتے گئے اور میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "اس سے کہہ دو کہ میں ابھی کچھ دیر میں وہاں پہنچ رہا ہوں۔ اور یہ کہہ کر تم فوراً میرے پاس واپس آجاؤ۔"

"جی بہتر ہے۔" یہ کہہ کر ارشاد علی چلا گیا۔

اسی وقت میری گردن میں ٹیس سی اٹھی اور پھر تکلیف کا احساس بڑھنے لگا۔ میں نے اپنی قوت برداشت سے کام لیتے ہوئے بہ مشکل منہ دھویا اور پلنگ پر آکر بیٹھ گیا۔ ارشاد علی

جلد ہی لوٹ آیا۔

"جناب وہ بڑی مشکل سے گیا ہے، کہہ رہا تھا کہ آپ کو ساتھ لے کر جائے گا۔" ارشاد علی نے بتایا۔

"خیر اس پر لعنت پڑھو اور یہ بتاؤ کہ تم کب لوٹے؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے سوال کیا۔ مجھے اس پر بھی غصہ تھا اور اپنے بقیہ ملازمین پر بھی جو مہ پارہ کی سازش کا شکار ہو گئے تھے اگر ارشاد علی میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے کمرے کا دروازہ نہ کھولتا تو میں خواہ مخواہ کے عذاب میں مبتلا نہ ہوتا۔ غلطی اس کی تھی، مگر اس کے باوجود میرے دل میں کم از کم اس کے لیے نرم گوشہ موجود تھا۔ اس نے بہرحال آخر وقت تک مجھے پولیس سے بچانے کی کوشش کی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ اس میں جتنی عقل تھی اس کے مطابق تو عمل کرتا۔

ارشاد علی نے میرے لہجے سے یقیناً ناراضگی کا اندازہ لگایا تھا اسی لیے کچھ سٹپٹا گیا تھا۔ بہرحال اسے جواب تو دینا ہی پڑا۔ "صبح ہوتے ہی آگیا تھا جناب!" اس نے بتایا۔

"میں معافی چاہتا ہوں جناب! مجھ...... مجھ سے غلطی ہو گئی۔ مجھے دروازہ نہیں کھولنا چاہیے تھا۔ دراصل مجھے اندازہ نہیں تھا کہ......"

"تمہیں تو خیر معاف کر سکتا ہوں، مگر بقیہ ان چاروں بدمعاشوں کو ہرگز معاف نہیں کر سکتا۔ جنہوں نے پولیس کو اطلاع دی تھی۔" میں اس کی بات کاٹ کر غصے میں بولا۔ "ان سب کا اسی وقت حساب کر دو اور یہاں سے چلتا کرو!" میں نے گویا حکم دیا۔

گھر کے اخراجات کی مد میں ارشاد علی کے پاس کافی رقم رہتی تھی اس لیے میں نے اسے مزید رقم دینے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

وہ ادب سے سر جھکا کر جانے والا تھا کہ میں نے اسے پھر مخاطب کیا۔ "اور سنو!" وہ رک گیا تو میں نے مزید کہا۔ "ملازماؤں سے بھی پوچھ لو، اگر ان میں سے بھی کوئی جانا چاہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ تم ان کا حساب بھی صاف کر سکتے ہو۔ مزید رقم کی ضرورت ہو تو مجھ سے لے لینا میں ابھی یہیں ہوں۔ اتنے میں تھانے جانے کے لیے کپڑے بدل رہا ہوں، اتنے میں تم یہ کام نمٹا لو۔" یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔

میں لباس تبدیل کر کے باہر نکلنے والا تھا کہ میری نگاہ فرش پر پڑی ہوئی چادر پر پڑی۔ میں نے جھک کر اسے اٹھا لیا۔ چادر بے داغ تھی اور فرش بھی، حالانکہ رات کو یہاں خون پھیلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ چادر ایک طرف رکھ کر میں باہر نکلا تو چاروں ملازم مجھے اس طرف آتے دکھائی

دیئے جنہیں میں نوکری سے جواب دے چکا تھا۔ ان کے چہروں پر بارہ بجے ہوئے تھے۔

"صاحب! ہمیں معاف کر دیں، غلطی ہو گئی۔" ان میں سے ایک میرے قریب آکر گڑگڑانے لگا۔

"دفع ہو جاؤ یہاں سے!" میں برس پڑا۔ "مجھے تم ایسے نمک حراموں کی ضرورت نہیں ہے!" یہ کہہ کر میں آگے بڑھ گیا۔

بنگال میں بڑی غربت تھی۔ وہاں آدمیوں کی کمی نہ تھی۔ وہ یوں بھی میری کوٹھی میں عیش کر رہے تھے۔ انہیں ایسی نوکری کہیں اور نہیں مل سکتی تھی۔ کام برائے نام تھا۔ آگے بڑھتے ہوئے مجھے جانے کیا سوجھی کہ میں ایک دم پلٹا۔ مجھے شاید ان کی غریبی پر ترس آگیا تھا کہ وہ بے روزگار ہو جائیں گے۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید ان کے قصور کو ہرگز معاف نہ کرتا۔

میں انہیں ہاتھ کے اشارے سے قریب بلایا اور کہا۔ "یہ تمہاری پہلی غلطی ہے اس لیے معاف کرتا ہوں۔ آئندہ تم سے کوئی غلطی سرزد ہوئی تو ہرگز معاف نہیں کروں گا۔"

ان کے بجھے ہوئے چہرے کھل اٹھے اور وہ مجھے دعائیں دینے لگے۔ اسی وقت ارشاد علی بھی وہاں پہنچ چکا تھا۔ میں نے اسے بھی بتادیا کہ انہیں معاف کر چکا ہوں۔ وہ مجھے حیرت سے دیکھنے لگا میں ان سب کو وہیں چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

میری کوٹھی سے تھانہ زیادہ دور نہیں تھا اس لیے میں پیدل وہاں تک پہنچ گیا۔ تھانیدار میرے انتظار ہی میں تھا۔ اس نے مجھے فوراً ہی اپنے کمرے میں بلایا وہ اکڑا ہوا اپنی کرسی پر یوں بیٹھا تھا کہ جیسے مجھے رعب میں لینا چاہتا ہو۔ اس نے مجھے بیٹھنے کو بھی نہیں کہا اور بارعب آواز میں بولا "تم خود کیوں تھانے نہیں آئے جب کہ میں رات کو تمہارے ملازمین سے یہ کہہ کر آیا تھا اور خود تم نے بھی میرا حکم سن لیا ہوگا۔"

"میں سو رہا تھا۔" میں نے نرمی سے جواب دیا۔ "سو ہی رہا تھا کہ مجھے بیدار کر کے بتایا گیا....."

"سو رہا تھا!" منہ بگاڑ کر اس نے میری نقل اتاری، پھر سخت آواز میں کہنے لگا۔ "یہ تم اپنے گھر میں کیا چکر چلا رہے ہو؟"

"کیسا چکر؟"

"اب اتنے بھولے نہ بنو! صاف صاف بتاؤ کہ وہ لاش تم نے کہاں غائب کر دی؟"

"کون سی لاش؟ میں نے تو کوئی لاش نہیں دیکھی۔" میں نے بڑی صفائی سے جھوٹ

بولا۔

"تو کیا تم مجھے اندھا سمجھتے ہو! تم مجھے چکر نہیں دے سکتے۔ سمجھے! میرا نام ملک فیروز دین ہے اور میں اچھے اچھوں کے کس بل نکال دیتا ہوں۔" وہ اور اینٹھنے لگا۔

"اگر وہاں آپ نے کسی لاش کو دیکھا تو پھر وہ کہاں گئی! اور آپ نے اسے اپنے قبضے میں کیوں نہیں لیا؟"

"تم الٹا مجھے پڑھانے کی کوشش کر رہے ہو! ہیں!" اس نے آنکھیں نکالیں۔ "سب کچھ اگل دو ورنہ بہت بری طرح پیش آؤں گا میں!"

میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اس اکڑ فون کا مقصد کیا ہے اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ پولیس کے پاس میرے خلاف کوئی ثبوت بھی نہیں، مگر پولیس کی دوستی اچھی نہ دشمنی! میں نے ایک سو تیس سال کی عمر میں زندگی میں بڑے رنگ دیکھے تھے۔ جانے کتنی مرتبہ مجھے پولیس والوں سے سابقہ پڑا تھا۔ کسی شخص نے چڑکران کے لیے یہ کوئی مشکل بات نہیں ہوتی کہ وہ اسے کسی بھی جھوٹے سچے مقدمے میں "لاد" دیں۔ تجربات کی دھوپ میں تپ کر مجھے یہ آگہی ہو چکی تھی کہ آدمی کو وقت دیکھ کر چلنا چاہیے۔ ورنہ زندگی اسے بہت رلاتی ہے۔ پُراسرار قوتوں کا مالک ہونے کے بعد ایسے مواقع میری زندگی میں کم ہی آئے تھے کہ میں نے مصالحت کی ہو، مگر اب صورت حال بدل چکی تھی۔ مجھے بہرحال چالیس دن کی مہلت درکار تھی۔ میں اس عرصے میں کسی بھی قسم کی غیر ذمے داری کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر تھانیدار مجھے کسی بھی چکر میں پھانس کر دو ایک دن کے لیے بھی حوالات میں بند کر دیتا تو میرے سارے خواب بکھر جاتے۔ میرے خیال میں اس کے لیے یہ کوئی مشکل نہیں تھا۔ چند ہی لمحوں میں یہ ساری باتیں میں نے سوچ لیں اور مجھے اس پر جو غصہ آرہا تھا، اسے دبالیا۔ مجھے حالات سے بہرحال صلح کرنی تھی۔ وقت ٹل جانے کے بعد میں اس کے سارے کس بل نکال دیتا۔

"تم خاموش کیوں کھڑے ہو بولتے کیوں نہیں؟" تھانیدار کے لہجے میں اور سختی آگئی۔

"کیا عرض کروں جناب!" میں بے حد نرمی سے بولا۔ "میری یہ مجال کہاں جو حضور سے بحث کر سکوں۔"

اس نے میری طرف حیرت سے دیکھا۔ میرا بدلا ہوا رویہ یقیناً اس کے لیے عجیب ہوگا۔ اس نے کہا۔ "ابھی تو تم بڑے پھنے خاں بن رہے تھے۔"

"میں تو خادم ہوں سرکار کا!" میں ایک سیڑھی اور نیچے اتر آیا۔

"خادم ہوں۔" وہ عجیب سے انداز میں ہنس پڑا۔ "بس زبانی دعوے کرتے ہیں سب! جب خدمت کا وقت آتا ہے تو بغلیں جھانکنے لگتے ہیں۔ بیٹھو!" اس نے پہلی مرتبہ مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا' پھر بولا۔ "میں نے سنا ہے کہ تم کاروباری آدمی ہو۔ اور بڑا کاروبار ہے تمہارا؟"

"جی حضور! بڑا تو خیر نہیں' بس دال روٹی کا سہارا ہو جاتا ہے۔" میں اس کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "پھر بھی حضور کی خدمت تو کر ہی سکتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے!" اس نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی' پھر مطلب کی بات پر آگیا۔ "دراصل بات یہ ہے کہ چھوٹے اسٹاف کے منہ کو خون لگا ہوا ہے۔ میری تو خیر کوئی بات نہیں' اگر ان لوگوں کے علم میں کوئی بات آجائے تو بس پیچھے پڑ جاتے ہیں اس کے! پھر ان کا بھی کیا قصور' تنخواہیں کم ہیں' کریں تو کیا کریں!" بیوی بچّوں کا پیٹ بھی تو ساتھ لگا ہوا ہے۔ میں بھی اسی وجہ سے کچھ زیادہ سختی نہیں کرتا ان پر! اب تمہارے ہی معاملے میں انہیں میں نے بہت سمجھایا خاک ڈالو' مگر میرے منہ پر تو کچھ نہیں بولے' پیچھے ٹرٹر کرنے لگے۔ معاملہ بھی قتل کا تھا' کیا کہتا میں! بہرحال انہیں تو خوش کرنا ہی پڑے گا۔ سمجھ رہے ہو ناتم!"

"جی ہاں جناب' بہت اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔" میں نے فرماں برداری کا ثبوت دیا۔

پھر اس نے منہ پھاڑا کہ دس ہزار تو کم از کم دے ہی دوں' مگر بعد میں پانچ ہزار پر بھی راضی ہو گیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ نچلے اسٹاف کو اس میں سے برائے نام ہی حصّہ ملے گا اور ساری رقم وہی ہضم کر جائے گا' مگر اس سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس نے میرے ساتھ سادہ لباس والے ایک شخص کو بھیج دیا۔ میں اس شخص کو اپنے ہمراہ کوٹھی لے آیا اور پانچ ہزار روپے ایک تھیلے میں رکھ کر اس کے حوالے کر دیئے۔ اس کے بعد میں ناشتا کر کے فارغ ہوا تھا کہ میرے ملازم ارشاد علی نے کمرے میں آنے کی اجازت طلب کی۔

"آجاؤ!" میں نے کہا۔

"ڈاکٹر انورالحق صاحب نے کسی ڈاکٹر کو بھیجا ہے اور ان کے ساتھ دو نرسیں بھی ہیں۔ میں نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے جناب!" ارشاد علی نے بتایا۔

"ٹھیک ہے' میں آتا ہوں۔" میں باتھ روم کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

ارشاد علی واپس چلا گیا۔ گردن کی تکلیف بہ دستور تھی۔ یہ میرا ہی حوصلہ تھا کہ میں اب تک اسے برداشت کر رہا تھا۔ اس تکلیف سے بچنے کی صرف یہی ایک صورت تھی کہ

دواؤں کے ذریعے ہر وقت زخمی حصّے کو سن رکھا جائے۔ میں نے اسی لیے ڈاکٹروں اور نرسوں کا بندوبست کیا تھا۔ تاکہ جس وقت بھی تکلیف بڑھے یا کوئی اور صورت حال درپیش ہو تو وہ اسے سنبھال سکیں۔

کچھ دیر بعد ہی میں اپنی کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں داخل ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر انورالحق نے شاید ان لوگوں کو بتا دیا تھا کہ میں سرمایہ دار آدمی ہوں اور غالباً میرے رکھ رکھاؤ سے انہوں نے خود بھی یہ اندازہ لگایا ہو گا۔ میں نے اندر قدم رکھا تو وہ لوگ شاید یہی سوچ کر احتراماً" کھڑے ہو گئے۔ عام لوگوں کی نظر میں بڑائی کا پیمانہ دولت ہی ہوتی ہے۔ جس کے پاس جتنی زیادہ دولت ہے' وہ اتنا ہی بڑا آدمی ہے اور بڑے آدمی کا احترام سبھی کرتے ہیں۔

"تشریف رکھیے!" میں نے یہ کہتے ہوئے ان سب پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور ایک دم چونک اٹھا۔ میری نظریں ایک چہرے سے الجھ کر رہ گئی تھیں۔ یہ انہی دونوں نرسوں میں سے ایک نرس کا چہرہ تھا۔ اس قدر مشابہت! میں حیران رہ گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مہ پارہ میرے سامنے صوفے پر بیٹھی ہو۔

"جناب ڈاکٹر انورالحق نے یہ خط آپ کے لیے دیا ہے۔" ڈاکٹر نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس کا ایک ہاتھ میری طرف بڑھا ہوا تھا جس میں لفافہ تھا۔

میں نے اس سے لفافہ لے لیا اور پھر ان لوگوں کے مقابل پڑے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا میری حالت اس وقت بڑی عجیب سی تھی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر جیسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ یہ کس طرح ممکن ہے؟ ایسا تو صرف کہانیوں میں ہوتا ہے' حقیقی زندگی میں نہیں میں لاکھ کوشش کر رہا تھا کہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز کروں' مگر بار بار میری نگاہیں اس کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ یوں بھی کسی لڑکی یا عورت کو اس طرح براہ راست دیکھنا بے ادبی میں شمار ہوتا ہے' میں نے اس کی طرف سے توجہ ہٹانے کے لیے ڈاکٹر انوارالحق کا لفافہ کھول لیا اور اس میں رکھے ہوئے پرچے کو نکال کر پڑھنے لگا۔ اس میں وہی لکھا تھا جو مجھے توقع تھی۔ اس نے اپنے خط میں نوجوان ڈاکٹر کا تعارف کرایا تھا جس کا نام امتیاز احمد تھا۔ حال ہی میں اس نوجوان نے ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کی تھی اور اب اپنا کوئی پرائیویٹ کلینک کھولنا چاہتا تھا۔ ڈاکٹر انوارالحق کے ایماء پر کچھ عرصے کے لیے میری ملازمت پر آمادہ ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر انوارالحق نے اسے میری کیس ہسٹری بھی فراہم کر دی تھی۔ نوجوان ڈاکٹر امتیاز کے لیے اس نے ایک مخصوص معاوضے کی بھی سفارش کی تھی۔ اس کے علاوہ مجھے ماہانہ جو معاوضہ دینا تھا' وہ بھی لکھا تھا۔ ڈاکٹر اور نرسوں کا معاوضہ اس نے لکھا تھا وہ مجھ ایسے آدمیوں کے لیے ادا کرنا کوئی مشکل نہیں تھا۔ میں نے

خط پڑھ کر قریبی تپائی پر رکھ دیا اور دانستہ اس نرس سے نظریں بچاتے ہوئے ڈاکٹر کو مخاطب کیا جو مہ پارہ کی ہم شکل تھی۔ میں نے کہا۔ "آپ لوگ اپنا سامان لے کر نہیں آئے؟"

"ہم نے سوچا کہ پہلے آپ سے ملاقات کر لیں' اس کے بعد......" نوجوان ڈاکٹر نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

میں سمجھ گیا اس ادھورے جملے کا مقصد کیا ہے! سیدھی سی بات تھی کہ اگر مجھے معاوضہ منظور ہو تو وہ میری کوٹھی میں منتقل ہو جائیں۔ میں نے مسکرا کر نوجوان ڈاکٹر کی طرف دیکھا' پھر بولا۔ "اب تو ملاقات ہو گئی نا؟"

"جی..... جی ہاں۔" وہ بھی مسکرا دیا۔

"تو پھر جتنی جلد ہی ممکن ہو آپ لوگ یہاں سامان لے کر آ جائیں۔" یہ کہتے ہوئے میری نگاہ ایک بار پھر اس حسین چہرے سے الجھ گئی۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ بھی مجھے دلچسپ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ شاید نوجوان ڈاکٹر نے بھی اس بات کو محسوس کر لیا۔

"میں نے آپ سے ان دونوں کا تعارف تو کرایا ہی نہیں!" ڈاکٹر نے کہا۔ ان کا نام بیلا ہے اور یہ......"

چنبیلی ہیں۔" بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔

"جی نہیں۔" وہ خود ہی بول اٹھی۔ "میرا نام مہ پارہ ہے۔"

میرے عصاب جھنجھنا اٹھے۔ اس کی آواز بھی سو فیصد مہ پارہ سے ملتی جلتی تھی اور نام بھی وہی تھا۔ "مہ پارہ!" میں نے زیر لب کہا۔

"یہ دونوں ہی تربیت یافتہ ہیں۔" مجھے ڈاکٹر امتیاز کی آواز جیسے کہیں بہت دور سے آتی محسوس ہوئی۔ "اچھا اب ہمیں اجازت دیں۔ ہم جلد ہی لوٹ آئیں گے۔"

پھر وہ لوگ چلے گئے اور میں اپنے کمرے میں آ کر بستر پر دراز ہو گیا۔ میرا ذہن اس وقت بہت الجھا ہوا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کہیں یہ مہ پارہ کا دوسرا حربہ تو نہیں؟ کہیں اس نے مجھے شکست دینے کے لیے نرس کا روپ تو اختیار نہیں کر لیا؟ مگر یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ کیا روح کوئی مادی جسم اپنا سکتی ہے؟

عمل کے دوران میں مجھے پوری طرح چاق و چوبند رہنا تھا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ میں دن کے وقت اپنی نیند پوری کر لوں۔ فجر کی نماز پڑھنے کے بعد مجھے زیادہ دیر سونے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ اس لیے میری آنکھوں میں نیند کروٹیں لے رہی تھیں۔ اس کے باوجود میری آنکھ نہ لگ سکی۔ میں سوالوں کے گرداب میں ڈوبتا ابھرتا رہا۔

دوپہر کے وقت میں خود بیدار ہوا۔ ابھی ظہر کا وقت نہیں نکلا تھا۔ اس لیے میں نے وضو کر کے پہلے ظہر کی نماز پڑھی' پھر ارشاد علی کو بلایا۔

"وہ لوگ آ گئے؟" میں نے ارشاد علی سے دریافت کیا۔

"جی ہاں جناب!" اس نے جواب دیا۔ "میں نے انہیں ان کے کمروں میں ٹھہرا دیا ہے۔ دوپہر کا کھانا بھی وہ کھا چکے ہیں۔ آپ کے لیے کھانا لاؤں؟"

"ہاں لے آؤ۔"

"ڈاکٹر صاحب کئی دفعہ پوچھ چکے ہیں کہ آپ جاگے یا نہیں۔" اس نے جاتے جاتے بتا دیا۔

"ٹھیک ہے کھانا کھا کر میں انہیں خود یہاں بلوالوں گا۔"

ارشاد علی چلا گیا۔ میرا ذہن ایک بار پھر انہی سوالوں میں الجھنے لگا جو سونے سے قبل مجھے پریشان کئے ہوئے تھے۔ عمل کی ایک کڑی شرط یہ بھی تھی کہ میں لڑکیوں سے دور رہوں۔ عمل کے دوران میں مجھے اپنا زیادہ تر وقت عبادت اور مطالعے میں گزارنا تھا' مگر وہ لڑکی میرے لیے خواہ مخواہ ایک مسئلہ بن گئی تھی۔ اگر یہ کوئی فریب بھی نہیں تھا تو پھر بھی میرے لیے سخت آزمائش تھی۔ وہ لڑکی ایک ایسی ہستی کی ہم شکل تھی جسے میں حاصل نہیں کر سکا تھا۔ اپنی تمام تر پُراسرار قوتوں کے باوجود میں اسے جھکنے پر مجبور نہیں کر سکا تھا۔ اس نے اپنی آنا کی خاطر موت کو گلے لگا لیا تھا اور میں ہاتھ ملتا رہ گیا تھا۔ اس سخت آزمائش سے بچنے کی ایک اور صورت بھی تو ہے۔ معاً میرے ذہن میں ایک نیا خیال آیا۔ کیوں نہ میں اسے اپنی ملازمت سے الگ کر دوں۔ اس کی جگہ دوسری نرس کا بندوبست بھی کیا جا سکتا ہے۔ میں اس سلسلے میں ڈاکٹر امتیاز سے بات کر سکتا ہوں۔ مگر میں' ڈاکٹر کو اس کی وجہ کیا بتاؤں گا؟

ابھی میرے ذہن میں یہی سوال گردش کر رہا تھا کہ ارشاد علی کھانا لے کر آ گیا۔ کھانے سے پہلے میں نے کئی طرح کی گولیاں زہر مار کیں اور پھر کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کھانا کھاتے ہوئے بھی میں سوچتا رہا۔ رات کا بڑا حصّہ کیوں کہ عمل کے لیے مخصوص ہے اس لیے ایک نرس سے بھی تو کام چل سکتا ہے۔ میں نے سوچا۔ بس یہ ٹھیک ہے میں ڈاکٹر امتیاز سے کہہ دوں گا کہ دو نرسوں کی ضرورت نہیں اس لیے وہ اپنے طور پر مہ پارہ کو جواب دے دے۔ یہ سوچ کر میرے ذہن کا بوجھ کچھ ہلکا ہو گیا۔

کھانے سے فراغت پاتے ہی میں نے فوراً ڈاکٹر امتیاز کو بلوایا تاکہ اس سے مہ پارہ کے سلسلے میں بات کر لوں۔

پھر جب کچھ دیر بعد ڈاکٹر امتیاز میرے کمرے میں داخل ہوا تو اس کے ساتھ وہ لڑکی بھی تھی جو کچھ سامان اٹھائے ہوئے تھی۔ ڈاکٹر کے ہاتھ میں بھی بیگ تھا۔

"ڈاکٹر صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ آپ کی گردن کے زخم کی ڈریسنگ صبح شام ہونی چاہیے۔" ڈاکٹر امتیاز نے آتے ہی کہا۔ "میں اس لیے کئی بار آپ کے ملازم سے پوچھ چکا تھا کہ آپ جاگے ہیں یا نہیں! اب کیا حال ہے؟"

اس کے سوال پر میں چونک اٹھا کیوں کہ میری نظریں تو اس غارت گر ہوش کی نظروں سے الجھی ہوئی تھیں۔ میں نے چونک کر کہا۔ "ٹھیک نہیں خاصی تکلیف ہے۔"

میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور ڈاکٹر امتیاز میری گردن کے گرد لپٹی ہوئی پٹیاں کھولنے لگا۔ نرس مہ پارہ اس کے قریب ہی کھڑی تھی میں سوچ رہا تھا کہ اس کی موجودگی میں کس طرح بات ہو سکتی ہے! مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ ڈاکٹر اپنے ساتھ اسے بھی لے آئے گا۔

پٹیاں کھلتے ہی تکلیف اتنی بڑھ گئی کہ میں کوشش کے باوجود میں اپنی کراہیں نہ روک سکا۔

زخم کھلا تو ڈاکٹر امتیاز کے منہ سے حیرت زدہ سی آواز نکلی۔ میں نے اپنی گردن پر چپچپاہٹ سی محسوس کی جو یقیناً خون رسنے کے سبب تھی۔ ڈاکٹر امتیاز کو شاید یہ توقع نہ ہوگی کہ وہ زخم اس نوعیت کا اور خطرناک ہوگا۔

"آپ واقعی بہت قوت ارادی کے مالک ہیں۔ شیخ صاحب!" اس نے کہا۔ "اگر آپ کی جگہ کوئی دوسرا آدمی ہوتا تو اس وقت اس کے منہ سے چیخیں نکل رہی ہوتیں۔ میں تو سمجھا تھا کہ معمولی زخم ہوگا۔ دوا کا اثر بھی تقریباً ختم ہو چکا تھا' اس کے باوجود آپ...... حیرت ہے!"

یہ کہتے ہوئے وہ جھکا اور اپنے بیگ سے ایک بوتل نکالی جس کے منہ پر اسپرے لگا ہوا تھا۔ اس نے میری گردن کی چاروں طرف اس دوا کا اسپرے کیا۔

دوا کی پہلی پھوار پڑتے ہی مجھے یوں لگا جیسے میرے زخم میں ٹھنڈک اترنے لگی ہے۔

"یہ بہت موثر دوا ہے اور بہتے ہوئے خون کو فوراً بند کر دیتی ہے۔" وہ بولا اور مہ پارہ کو مخاطب کر کے بیگ سے دوسری دواؤں کو نکالنے کے لیے کہنے لگا۔

پھر کچھ ہی دیر میں اس نے میرے زخم کی ڈریسنگ کر دی۔ مہ پارہ اس کی مدد کر رہی تھی۔

ڈریسنگ ہوتے ہوتے میری تکلیف جیسے ختم ہو گئی۔

"اب رات آٹھ بجے تک کے لیے دوبارہ ڈریسنگ کی ضرورت پیش نہیں آئے

گی۔" ڈاکٹر امتیاز نے طویل سانس لیتے ہوئے بتایا' پھر بولا۔ "اب کیسا محسوس کر رہے ہیں آپ؟"

"بالکل ٹھیک۔" میں نے جواب دیا۔ "اب ذرا بھی تکلیف محسوس نہیں ہو رہی۔"

اس کے بعد ڈاکٹر نے جانے کی اجازت چاہی۔

"آپ سے کچھ بات کرنا ہے۔" میں نے بالآخر کہہ ہی دیا۔

"فرمایئے!" وہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

مہ پارہ اس وقت دوائیں اور ڈریسنگ کا دوسرا سامان ڈاکٹر کے بیگ میں رکھ رہی تھی۔

"ابھی عرض کردوں گا' پہلے....." میں نے مہ پارہ کی طرف دیکھتے ہوئے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"اچھا۔" اس نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے۔"

اسی وقت مہ پارہ نے مجھے نظر اٹھا کر دیکھا اور میں خود کو چور سا محسوس کرنے لگا۔ مہ پارہ کی اس ایک نظر میں جانے کیا تھا کہ میرا ارادہ متزلزل ہونے لگا۔ میں نے اس کی طرف سے نگاہ پھیر لی۔

"مہ پارہ! آپ چلیں' میں شیخ صاحب سے بات کر کے ابھی آتا ہوں۔" ڈاکٹر امتیاز نے اس فتنے کو مخاطب کیا۔ "میرا بیگ اور دوسرا سامان..... یا بیگ رہنے دیں' میں خود لے آؤں گا' بس ڈریسنگ کا سامان لے جائیں۔"

جواب میں مہ پارہ نے صرف گردن ہلانے پر اکتفادہ کیا اور کمرے سے نکل گئی۔

"جی اب فرمایئے' کیا بات ہے؟" مہ پارہ کے جاتے ہی ڈاکٹر امتیاز میری طرف متوجہ ہو گیا۔

"دراصل بات یہ ہے ڈاکٹر کہ....." میں بات کرتے ہوئے کچھ جھجک سی محسوس کر رہا تھا۔

"جی جی فرمائیں۔" اس نے مجھے خاموش دیکھ کر کہا۔

"پہلے مجھے اندازہ نہیں تھا کہ..... کہ ایک نرس سے بھی کام چل سکتا ہے۔ میں نے اسی غلط فہمی میں ڈاکٹر انوار الحق سے دو نرسوں کے لیے کہہ دیا تھا جب کہ ایک نرس سے بھی کام چل سکتا ہے۔" میں رک رک کر کہنے لگا۔ "آپ سمجھ رہے ہیں نا! یوں بھی رات کا بڑا حصّہ میں مختلف عبادات میں گزارتا ہوں اور..... اور اس وقت مجھے کچھ ہوش نہیں ہوتا' میرا

مطلب یہ کہ یاد الٰہی میں اتنا غرق ہوتا ہوں کہ تکلیف اگر ہو بھی تو مجھے اس کا زیادہ احساس نہیں ہوتا۔"

"ٹھیک ہے جناب۔" ڈاکٹر امتیاز بولا۔ "میں بیلا کو جواب دے دوں گا۔ یوں بھی اسے ایک جاب ملنے والا تھا اور وہ صرف میرے کہنے پر یہاں آنے کو تیار ہو گئی تھی۔"

"بیلا کو جواب دے دیں گے۔" یہ کہتے ہوئے میں چکرا کر رہ گیا۔

"جی ہاں۔ کیوں' کیا آپ کو اس پر کوئی اعتراض ہے؟"

"نہیں' اعتراض تو کوئی نہیں' لیکن......" میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے کہوں تو کیا کہوں؟" میں نے جو عذر ظاہر کیا تھا' وہ اس نے بلاچوں وچرا تسلیم کر لیا تھا۔ اب میں اس سے یہ کس طرح کہتا کہ وہ بیلا کو نہیں' مہ پارہ کو جواب دے دے۔

"آپ مجھے کسی الجھن کا شکار معلوم ہو رہے ہیں جناب۔" اس نے کہا۔ "شاید آپ جو کہنا چاہتے ہیں وہ کہہ نہیں پا رہے۔"

"نہیں' ایسی کوئی بات نہیں ڈاکٹر!" میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے مسکرا کر کہا اور پھر موقع کی مناسبت سے بات کا رخ بدل دیا کیونکہ جو اصل مقصد تھا' مفقود ہو گیا تھا۔ میں بولا۔ "دراصل میں یہ سوچ رہا تھا کہ یہ کچھ غیر اخلاقی سی بات ہے۔"

"کیا؟"

"یہی کہ بیلا کو اس طرح جواب دے دیا جائے۔" میں بولا۔

"نہیں' وہ بالکل خیال نہیں کرے گی۔ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ اگر آپ کو دو نرسوں کی ضرورت نہیں تو ظاہر ہے فضول خرچی کی کیا ضرورت ہے۔"

ڈاکٹر امتیاز کی بات سن کر میں کچھ اور شرمندہ ہو گیا۔ یقیناً وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ میں اس طرح ایک نرس کی تنخواہ بچانا چاہتا ہوں۔ اپنی خجالت دور کرنے کی غرض سے میں نے کہا۔ "میرے ذہن میں پیسوں کا خیال نہیں تھا۔ ڈاکٹر میں نے تو حقیقت حال کا اظہار کیا تھا۔ بہرحال اب میں آپ سے یہی درخواست کروں گا کہ اسے جواب نہ دیجئے۔"

"جو حکم آپ کا جناب!" وہ بولا

"ہاں یہ بتایئے کہ آپ کے ذہن میں بیلا ہی کیوں آئی؟ آپ نے مہ پارہ کو جواب دینے کے بارے میں کیوں نہیں سوچا؟" میں نے موقع دیکھ کر پوچھ لیا۔

"دراصل مہ پارہ ایک جگہ جاب کر رہی تھی۔ ڈاکٹر انوار الحق صاحب کے کہنے پر وہ جاب چھوڑ کر یہاں آئی۔ ایسی صورت میں اسے جواب دینا کسی طرح مناسب نہ ہوتا۔" ڈاکٹر

امتیاز نے جواب دیا۔

میں نے کچھ سوچ کر اس سے ایک اور سوال کیا۔ "ویسے ان باتوں سے قطع نظر دونوں میں سے بہتر کون ہے؟ آپ تو دونوں ہی کو اچھی طرح جانتے ہوں گے۔"

"بیلا کو تو بہت دن سے جانتا ہوں۔ وہ یقیناً ایک اچھی تربیت یافتہ نرس ہے' لیکن مہ پارہ کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"اس سے میری ملاقات آج ہی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے اس کا پتا دیا تھا اور اس کے بارے میں بتایا تھا۔ میں اس پتے پر پہنچا تو وقت مقررہ پر وہ مجھے اپنے گھر کے دروازے پر بالکل تیار ملی۔ ہاں میں نے اس کی اسناد وغیرہ ضرور دیکھی تھیں جن سے معلوم ہوا کہ وہ بھی تجربہ کار اور تربیت یافتہ ہے۔" ڈاکٹر امتیاز نے تفصیل کے ساتھ مہ پارہ کے متعلق بتایا۔

یہ باتیں معلوم ہونے کے بعد میرا ذہن کچھ اور الجھ گیا۔ میری پوچھ گچھ کا اصل مقصد یہ تھا کہ اگر اس نرس کی مہ پارہ سے مشابہت اتفاقی ہو گی تو ڈاکٹر امتیاز یقیناً اسے پہلے سے جانتا ہو گا۔ جن حالات میں ڈاکٹر امتیاز سے اس کی ملاقات ہوئی تھی وہ میرے دل میں شک پیدا کر رہے ہیں کہ ممکن ہے اس نے اصل نرس کی جگہ لے لی ہو۔ اسے ملازمت سے الگ کرنے کا ایک بہانا رائیگاں چلا گیا تھا اور اب مزید کوئی نیا بہانہ تلاش کرنے کے لیے سوچنے کی ضرورت تھی۔ میں نے اسی لیے اس وقت ڈاکٹر امتیاز سے مزید کوئی بات نہیں کی اور اسے رخصت کر دیا۔

وقت گزاری کے لیے میں نے الماری سے ایک کتاب مطالعے کے لیے نکال لی اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ اب میں اپنے بستر پر آ کر نیم دراز ہو گیا تھا۔ مختلف زبانوں میں مختلف مضامین پر میرے پاس خاصی کتابیں تھیں۔ لیکن صرف انہی زبانوں میں جو میں جانتا تھا۔ اس وقت میرے ہاتھ میں نفسیات کے مضمون پر لکھی ہوئی ایک امریکی مصنف کی کتاب تھی۔ کتاب میں انسانی رشتوں پر بحث کی گئی تھی۔ مصنف نے لکھا تھا کہ ایک مکمل انسان وہ ہے جو رشتوں پر یقین رکھتا ہو' رشتے ہی زندگی سے اس کی گہری وابستگی کا ثبوت ہوتے ہیں۔ ان رشتوں کے بغیر انسان ادھورا رہتا ہے۔ میں مصنف کے استدلال کی روشنی میں اپنا جائزہ لینے لگا اور کتاب بند کر کے سرہانے رکھ دی۔

کیا میں ادھورا ہوں؟ میرے تو تمام رشتے مر چکے ہیں۔ تو کیا میں یونہی رائگاں جاؤں گا؟ کیا کوئی ہے جسے میں اپنا کہہ سکوں؟ میں نے زندگی میں کیا کمایا؟ میں سوچتا رہا اور مجھ پر کھلا

کہ زندگی میں میری جڑیں گہری پیوست نہیں ہیں۔ میں ایک ایسے درخت کے مانند ہوں جس کی جڑیں نہیں۔ تند و تیز ہوا کا ایک جھونکا بھی مجھے اپنے ساتھ بہا کر کہیں سے کہیں لے جاسکتا ہے۔ زندگی میں کچھ لمحے ایسے بھی ہوتے ہیں جب کوئی معمولی سی بات دل پر اثر کر جاتی ہے۔ شاید یہ ایسے ہی لمحات تھے۔ زندگی میں پہلی بار مجھے ایک گھر کی خواہش ہوئی' ایسا گھر جسے واقعی ایک گھر کہا جاسکے۔ جہاں میرے لیے کوئی چشم انتظار وا ہو' کوئی دیر سے گھر لوٹنے پر پوچھ گچھ کرتا ہو کہ کہاں تھے؟ آنگن میں معصوم بچوں کی قلقاریاں گونجتی ہوں۔ کیا یہ سکھ مجھے مل سکتا ہے؟ میرا ماضی اتنا تیز رفتار گزرا تھا کہ کبھی میں نے رک کر ان سوالوں پر غور نہیں کیا تھا۔ ایک ترنگ تھی جس میں میں بہا چلا جارہا تھا۔ فرد حساب ماہ و سال میرے سامنے تھی اور جو کچھ گزر چکا تھا ایک خواب سا لگ رہا تھا۔ میری سرخوشی کے دن جانے کہاں گزر گئے تھے۔ میں کہ شاد کام بھی تھا اور ناکام بھی۔ میں نے سکھ بھی پائے تھے اور دکھ بی' مگر نہ سکھوں کی عمر طویل تھی نہ دکھوں کی۔ اک عمر کا حاصل تنہائی تھی۔ شاید اس لیے کہ میں نے رشتوں کو انسانی رشتوں کو' کبھی بھی اہمیت نہیں دی تھی۔ اگر میں آج مر بھی جاتا تو کوئی مجھے رونے والا نہیں تھا کیوں کہ میں نے خود کو آنے والی نسلوں میں محفوظ نہیں کیا تھا۔ مجھ سے شاید بھول ہوگئی تھی میں نے شاید اپنی زندگی کو سمجھا نہیں تھا۔ زندگی سے لذت کشید کرنے کے ساتھ ساتھ مجھے یہ خیال رکھنا چاہیے تھا کہ کہیں میں دنیا کی بھیڑ میں بالکل اکیلا نہ رہ جاؤں۔ آدمی ساری دنیا سے جھوٹ بول سکتا ہے مگر اپنے آپ سے نہیں۔ یہ سچ تھا کہ نہ میرا کوئی دوست تھا' نہ ساتھی نہ کوئی غمگسار تھا نہ محرم راز۔ میں ایک محروم شخص تھا۔

انہی خیالوں میں عصر کا وقت ہوگیا۔ میں نے وضو کر کے نماز پڑھی اور پھر دست دعا بلند کیے۔ وہ جو دلوں کا حال جاننے والا ہے' میں نے اس سے کچھ نہ کہا' کچھ نہ مانگا کہ اسے سب خبر تھی۔ سب کچھ معلوم تھا۔ اس وقت جانے کیوں مجھ پر رقت سی طاری ہوگئی۔ پھر جانے کب تک میرے ہاتھ اٹھے رہے اور میرے رخساروں پر آنسو بہتے رہے۔ میں چونکا اس وقت جب دروازہ آہستہ سے کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز سنی میں نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھ لیے کمرے میں داخل ہونے والا میرا ملازم ارشاد علی تھا۔ میں نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"ڈاکٹر صاحب نے ایک نرس کو بھیجا ہے اور وہ آپ کے کمرے میں آنا چاہتی ہے۔ میں نے آپ سے اجازت لینا ضروری سمجھا۔ کہیں تو اسے اندر بھیج دوں۔" ارشاد علی نے بتایا۔

"کس لیے آئی ہے وہ؟" میرا انداز خود کلامی کا سا تھا۔

"معلوم نہیں جناب۔" وہ بولا۔

"ٹھیک ہے' اسے آنے دو۔" یہ کہتے ہوئے میں اٹھ کھڑا ہوا اور پھر مصلیٰ لپیٹ کر اس کی جگہ رکھ دیا۔

چند ہی لمحے بعد نرس مہ پارہ کمرے میں داخل ہوئی اور میں اسے دیکھ کر چونک اٹھا۔ میں یہ سوچنے میں حق بہ جانب تھا کہ بار بار وہی میرے سامنے کیو آجاتی ہے؟

"چارٹ کے مطابق اس وقت آپ کو یہ دو ٹیبلیٹس کھانا ہیں جناب۔"

وہ یہ کہتی ہوئی میری طرف بڑھی۔ "ڈاکٹر صاحب نے آپ کا چارٹ میرے حوالے کردیا ہے جناب کہ وقت پر آپ کو دوائیں استعمال کراتی رہوں۔ یہاں پانی ہوگا؟"

"جی ہاں۔ وہ ادھر میز پر جگ اور گلاس رکھا ہے۔" میں نے میز کی طرف اشارہ کیا' پھر بولا۔ "ویسے آپ نے ناحق زحمت کی' میں خود وقت پر دوا کھالیتا ہوں۔"

وہ میز کی طرف بڑھ گئی اور گلاس میں پانی بھر کے پھر میرے پاس آگئی۔ "لیجئے۔" اس نے گولیاں مجھے دیں' پھر پانی کا گلاس میری طرف بڑھایا۔

میں جب پانی کا گلاس اس کے ہاتھ سے لے رہا تھا تو اس کی انگلیاں میری انگلیوں سے مس ہوگئیں اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے سارے جسم میں ایک برقی رو سی دوڑ گئی ہو۔

"آپ کے پاس جو دوائیں ہیں' مجھے دے دیں۔" اس نے کہا۔ "میں وقت پر......"

"میرا خیال ہے کہ اس کی ضرورت نہیں۔" میں اس کی بات کاٹ کر بولا۔ میں نے دونوں گولیاں کھالیں تھیں اور اس نے خالی گلاس میرے ہاتھ سے لے لیا تھا۔

"آپ کو زیادہ سے زیادہ آرام اور نگہداشت کی ضرورت ہے اور ظاہر ہے کہ آپ نے اسی لیے ہمیں ملازم رکھا ہے۔"

میں نے اس سے بحث کرنے کی بجائے ساری دوائیں اس کے حوالے کردیں۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے شاداب چہرے سے لمحہ بھر کو بھی میری نظر نہیں ہٹی تھی۔

معاف کیجئے گا یہ کچھ ذاتی سا سوال ہے' لیکن..... چھوڑیں۔" وہ جانے کے لیے پلٹی۔

"ٹھہر جائیں۔" میں نے اسے روک لیا۔ "جو بات زبان پر آجائے اسے کہہ دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔"

"دراصل میں یہ سوچ رہی تھی کہ کہیں آپ خیال نہ کریں اس لیے....." میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"میں تنگ نظر نہیں ہوں، آپ جو سوال کرنا چاہتی تھیں بلا جھجک کریں۔"

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہاں کوٹھی میں جتنے بھی مرد اور عورتیں ہیں، وہ سبھی آپ کے ملازم ہیں۔"

"تو پھر؟"

"پھر یہ..... یہ کہ کیا آپ نے شادی نہیں کی"؟ کیا آپ کے بیوی بچے نہیں ہیں؟" اس نے جھجکتے ہوئے پوچھ ہی لیا۔

"آپ کھڑی کیوں ہیں۔ بیٹھیں نا۔" میں نے دوسری کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ "اور ہاں آپ نے شام کی چائے پی لی؟"

"جی ابھی نہیں۔" یہ کہہ کر وہ کچھ جھجکتی ہوئی میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

میں نے ارشاد علی کو آواز دی اور جب وہ آگیا تو چائے لانے کو کہا۔ ارشاد علی چائے لانے چلا گیا تو وہ پھر میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

مجھے اس وقت جانے کیسے وملا یاد آگئی۔ میری زندگی میں ایک وہی ایسی لڑکی آئی تھی جس نے زندگی بھر ساتھ نبھانے کا عہد کیا تھا۔ میں نے ذہنی طور پر اسے قبول کرلیا تھا۔ میری خاطر اس نے اپنے مذہب کو بھی چھوڑ دیا تھا اور مسلمان ہوگئی تھی۔ وہی ایک ایسی تھی میں نے جس سے نکاح کیا تھا۔ اس وقت بھی میں نے گھر کے خواب دیکھے تھے، مگر وہ سارے خواب فوراً ہی بکھر گئے تھے۔ وہ بے وفا ثابت ہوئی تھی۔ اس نے مجھ سے اپنے باپ کا انتقام لینے کے لیے یہ سارا ڈھونگ رچایا تھا۔ اس نے موقع پاتے ہی مجھ پر خطرناک قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ اگر ہمزاد چوکنا نہ ہوتا تو شاید وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتی۔ اس دن کے بعد سے عورت پر میں نے اعتماد کرنا چھوڑ دیا تھا، لیکن اب میرے انداز فکر میں تبدیلی آ رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ ہر عورت وملا نہیں ہوتی۔

"آپ کیا سوچنے لگے جناب؟" مہ پارہ مجھے خیالوں میں کھویا ہوا دیکھ کر بول اٹھی۔ "کیا کوئی یاد آگیا؟"

میں چونک اٹھا۔ مہ پارہ نے لاعلمی میں بالکل صحیح بات کی تھی۔ میں نے ایک طویل سانس لیا، پھر بولا۔ "ہاں ایک بے وفا کی یاد آگئی تھی۔"

"کون تھی وہ؟" اس نے پوچھا۔

"تھی کوئی۔" میں نے اس ذکر کو ٹالنا چاہا اور بات کا رخ بدلنے کے لیے کہا۔ "آپ

نے مجھے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔"

میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ کچھ اداس سی نظر آنے لگی تھی۔ پھر اس نے بھاری آواز میں بتایا۔ "اس بھری پری دنیا میں میرا کوئی نہیں۔ میں نے بھی آپ کی طرح کسی کو چاہا تھا، مگر..... مگر اس نے بھی میرے ساتھ بے وفائی کی۔ اگر میری جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو شاید حقیقت حال جاننے کے بعد کبھی اپنی محبت پر قائم نہ رہ سکتی۔"

نہ جانے اس کے لہجے اور آواز میں کیا سحر تھا کہ اس وقت میرے ذہن سے تمام تاثرات حرف غلط کی طرح مٹ گئے ہیں ہمہ تن گوش ہوگیا، مگر اب وہ خاموش تھی اور میری طرف دیکھنے کی بجائے بس ایک ٹک خلا کو گھورے جا رہی تھی۔ پھر اسی عالم میں اس کی حسین پلکیں بوجھل ہونے لگیں اور اس نے جلدی سے اپنا چہرہ دوسری جانب کرلیا۔ میں نے اس کے باوجود اس کے رخساروں پر موتیوں کی لڑیاں دیکھ لی تھیں۔ جنہیں اس نے بڑی تیزی سے اپنے آنچل میں چھپالیا تھا۔ پھر وہ اس طرح میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔ جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ اس کے بعد وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اب مجھے اجازت دیجئے۔" اس نے کہا۔

"مگر آپ نے اپنے بارے میں ابھی تو کچھ بتایا بھی نہیں۔" میں بولا۔

"آپ نے بھی تو کچھ نہیں بتایا۔" وہ مسکرائی۔

"بس میری تو اتنی سی کہانی ہے کہ کسی نے زندگی بھر کے لیے ساتھ نہیں نبھایا اور کسی نے یہ وعدہ کیا بھی تو وفا نہیں کی۔ میں بھی آپ ہی کی طرح اکیلا ہوں۔"

"گویا ہم دونوں کا دکھ ایک ہے۔"

"ہاں۔" میری آواز جذبات سے بوجھل ہوگئی۔ "آپ اٹھ کیوں گئیں، بیٹھیں نا۔"

"پھر آؤں گی۔" وہ بولی۔

"کب؟"

"آج رات۔" اس نے جواب دیا۔

"مگر رات کو میں عبادت میں مصروف ہوتا ہوں۔"

"میں نصف شب سے پہلے آجاؤں گی۔" اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

میں ایک بار پھر چونک اٹھا۔ "آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں نصف شب کے بعد عبادت میں مصروف ہوتا ہوں؟"

"اگر آنکھیں اور کان کھلے رکھے جائیں تو بہت سی باتیں خود معلوم ہو جاتی ہیں۔"

بہرحال میرا قیام بھی آپ کی کوٹھی ہی میں ہے۔ آپ کا ملازم خاص مجھے تاکید کر چکا ہے کہ نصف شب کے بعد کسی بھی صورت کوٹھی کے اس حصّے کا رخ نہ کروں۔ میں نے اسی سے یہ اندازہ لگایا کہ یہ وقت آپ کی عبادت کا ہو گا۔"

اس کا جواب سن کر میرا شک دور ہو گیا۔ ارشاد علی نے ان لوگوں کو یہ تاکید کر کے یقیناً عقل مندی کا ثبوت دیا تھا۔ پھر وہ جانے لگی تو اسی وقت ارشاد علی چائے کی ٹرے اٹھائے کمرے میں داخل ہوا۔ اسے بھی یاد نہیں رہا تھا اور میں بھی بھول گیا تھا کہ چائے آ رہی ہے۔ میرے اصرار پر اس نے چائے پی لی، مگر اس دوران میں زیادہ بات نہیں کی۔ وہ مجھے کچھ کھوئی کھوئی سی لگ رہی تھی۔ شاید اس وقت کی گفتگو سے اس کے زخم ہرے ہو گئے تھے۔ چائے پیتے ہی وہ چلی گئی۔

میں کمرے میں تو تنہا رہ گیا تو سوچنے لگا کہ اس کی طرف سے میرے ذہن میں جو خدشات ہیں۔ وہ درست نہیں۔ وہ میری دشمن جاں کی ہم شکل ضرور ہے، مگر حقیقتاً ایسا نہیں جیسا میں نے سوچا ہے نام اور آواز کی مماثلت بھی اتفاقی ہو سکتی ہے۔ اگر مہ پارہ مجھ سے اس طرح انتقام لینا چاہتی تو کبھی اپنے اصل روپ میں سامنے نہ آتی۔ یہ کوئی اور ہی لڑکی ہے۔

ڈاکٹر امتیاز نے مجھ سے رات کو آٹھ بجے میرے کمرے میں آنے کے لیے کہا تھا تاکہ میری گردن کے زخم کی ڈریسنگ دوبارہ کر دے۔ اس وقت تک مجھے اپنی گردن میں کوئی تکلیف محسوس نہ ہوئی تھی۔ اسی لیے جب وہ آیا تو میں نے کہا۔ "ابھی تک تو دوا کا اثر برقرار ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ صبح......"

"میں نے احتیاطاً آٹھ بجے کا وقت رکھا تھا۔" وہ میری بات کاٹ کر مسکرایا۔ "دوا کا اثر تو رات بارہ بجے تک رہے گا مگر اس وقت تک آپ عبادت میں مصروف ہو جائیں گے۔"

"اگر ایسا ہے تو پھر ٹھیک ہے۔"

میرا جملہ ختم ہوا ہی تھا کہ معاً کمرے کا دروازہ کھلا اور دوسری نرس بیلا اندر آ گئی۔ وہ ڈریسنگ کے لیے ضروری سامان لے کر آئی تھی۔ میں نے دانستہ مہ پارہ کے بارے میں کچھ نہ پوچھا تاکہ ڈاکٹر امتیاز کو یہ شک نہ ہو کہ میں، مہ پارہ میں دلچسپی لے رہا ہوں۔

دن کے وقت ڈریسنگ ہوئی تھی تو مجھے سخت اذیت سے گزرنا پڑا تھا، مگر اب ایسا نہ ہوا۔ شاید اس کا سبب یہ تھا کہ دوا کا اثر ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ ڈریسنگ کے بعد ڈاکٹر اور نرس دونوں چلے گئے۔ ارشاد علی نے کھانے کے لیے آ کر پوچھا تو مجھے ان دواؤں کا خیال آیا جو کھانے سے پہلے استعمال کرتا تھا ساری دوائیں مہ پارہ میرے کمرے سے لے جا چکی تھی۔

"کچھ دیر ٹھہر جاؤ، میں خود تمہیں بلا کر کھانے کے لیے کہہ دوں گا۔" میں نے اس سے کہا اور وہ چلا گیا۔

ذرا دیر ہوئی تھی کہ ارشاد علی نے مہ پارہ کے آنے کی اطلاع دی۔

"دیکھو دن کے وقت..... بلکہ اس وقت تک کم از کم ڈاکٹر اور نرسوں کو میرے کمرے میں آنے سے نہ روکا کرو جب تک میری عبادت کا وقت نہ ہو جائے۔ سمجھ گئے نا۔"

"بہتر ہے جناب۔ آئندہ ایسا ہی ہو گا۔" وہ ادب سے سر جھکا کر بولا۔

"ڈاکٹر اور نرسوں کو کھانا دے دیا گیا؟" میں نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

"ابھی نہیں جناب!" اس نے جواب دیا۔

"تو پھر ایسا کرو کہ اس نرس کا کھانا بھی یہیں لے آؤ اور اسے اندر بھیج دو۔" میں بولا۔ "اور ہاں سنو! جب تک وہ میرے کمرے میں رہے کسی کو اندر نہ آنے دینا۔"

ارشاد علی کو میری ملازمت میں خاصے دن ہو گئے تھے۔ وہ میرے مزاج اور طبیعت کی رنگینی سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس کے باوجود میں نے لمحہ بھر کو اس کے چہرے پر حیرت سی دیکھی۔ شاید اس کا سبب یہ رہا ہو کہ میں نے اپنی حسین و خوب رو ملازماؤں پر اپنے کمرے میں آنے پر پابندی لگا دی تھی۔ مگر مہ پارہ کے معاملے میں اسے اس طرح کا معنی خیز حکم دے رہا تھا بہرحال وہ اثبات میں سر ہلا کر کمرے سے نکل گیا۔

ارشاد علی کے جاتے ہی مہ پارہ اندر آ گئی اور آتے ہی بولی۔ "معاف کیجئے گا کہ میں آپ کے ملازم سے یہ پوچھنا بھول گئی تھی کہ آپ رات کو کس وقت کھانا کھاتے ہیں کیوں کہ کھانے سے پہلے دوائیں ضروری ہیں آپ بتا دیں کس وقت....."

"آپ ٹھیک وقت پر آئی ہیں۔ میں اسی وقت کھانا کھاتا ہوں۔ ملازم کھانے کے لیے ہی پوچھنے آیا تھا اور اب لا ہی رہا ہو گا، بیٹھیں۔"

وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس وقت وہ مجھے کچھ زیادہ ہی حسین معلوم ہو رہی تھی۔ ہلکے سے میک اپ نے اس کے حسن کو کچھ اور نکھار دیا تھا۔

"آپ بھی ساتھ ہی کھانا کھا لیجئے گا۔" میں نے اس کے حسین چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کو اپنا پرہیزی کھانا نہیں کھلاؤں گا، گھبرائیں نہیں۔" میرے لہجے میں شوخی آ گئی۔

"نہیں یہ بات نہیں تھی۔" وہ نظریں جھکا کر بولی۔

"پھر کیا بات ہے؟"

"لوگ جانے کیا سوچیں۔"

"کون لوگ؟"

"آپ کے ملازمین اور..... اور ڈاکٹر امتیاز' بیلا....."

"کسی کے ساتھ کھانا کھالینا کوئی قابل اعتراض بات تو نہیں۔" میں نے کہا۔ "پھر یہ کہ آپ کسی کو جواب دہ ہیں نہ میں! ہم دونوں ہی شاید بالغ اور خود مختار ہیں۔" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے میرا لہجہ پھر شوخ ہو گیا۔ میں نے مزید کہا۔ "آپ بالغ ہو چکی ہیں نا۔"

میرے جملے کی معنویت کے سبب شرم سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور یوں وہ مزید حسین نظر آنے لگی۔ وہ خاص مشرقی لڑکیوں کی طرح اپنے دوپٹے کا آنچل' انگلی پر لپیٹنے اور کھولنے لگی۔

"آپ تو بالکل کنواری لڑکیوں کی طرح شرما رہی ہیں۔" میں نے اسے چھیڑا۔ "شاید ابھی آپ کی شادی نہیں ہوئی اور آپ کنواری ہیں۔"

"شادی۔" اس نے زیر لب کہا اور پھر ٹھنڈا سانس بھرا۔ "میری شادی ہو چکی ہے' مگر..... مگر....." وہ اپنا جملہ پورا نہ کر سکی۔ اس کے چہرے پر ایک بار پھر حیا کی سرخی دوڑ گئی تھی۔

"مگر کیا؟" میں اسے خاموش دیکھ کر بولا۔

"چھوڑیں اس ذکر کو' کوئی اور بات کریں۔"

"مگر آپ نے تو کہا تھا کہ رات کو اپنے بارے میں بتائیں گی۔"

"میں نے یہ تو نہیں کہا تھا۔" اس نے جھکی ہوئی نظریں اٹھائیں۔

"کچھ باتیں بغیر کہے ہوئے بھی تو سمجھ لی جاتی ہیں۔"

"کھانا کھالیں پہلے پھر باتیں کریں گے کیوں کہ آپ کا ملازم کسی بھی وقت کمرے میں آسکتا ہے اور میں نہیں چاہتی کہ کسی کو بھی میری محرومی کا علم ہو۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"تو گویا آپ مجھے اپنی داستان حیات سنانے پر راضی ہیں۔"

"آپ ہی مجبور کر رہے ہیں ورنہ..... ورنہ کون اپنی خوشی سے اپنے زخموں کو کریدنے پر آمادہ ہوتا ہے۔"

کچھ دیر ہم دونوں کے درمیان خاموشی رہی اور میں اس دوران میں بار بار اس کے حسین و پرکشش چہرے کو دیکھتا رہا۔ کئی بار ہم دونوں کی نظریں بھی آپس میں ٹکرائیں۔ میں

نے اس کی نظروں میں اپنے لیے محبت کی جھلک محسوس کر لی پھر ارشاد علی کھانا لے آیا۔

کھانے سے فارغ ہو کر چائے کا دور چلا اور پھر جب ارشاد علی برتن سمیٹ کر چلا گیا تو میں نے اسے مخاطب کیا۔ "اب کوئی کمرے میں نہیں آئے گا۔ اب کہیں آپ کیا کہہ رہی تھیں؟"

"کب؟"

کھانا آنے سے پہلے آپ نے بتایا تھا کہ آپ کی شادی ہو چکی ہے' پھر آپ 'مگر' کے بعد رک گئی تھیں۔ کیا شوہر سے علیحدگی ہو گئی؟" میں نے اسے بولنے پر اکسایا۔

"ہاں۔" اس نے آہستہ سے کہا' پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ اب آپ اس کی وجہ بھی جاننا چاہیں گے۔"

"ظاہر ہے۔" میں مسکرایا۔

"اس سے محبت میں پہل میں نے ہی کی تھی۔" اس نے اپنی داستان حیات کا آغاز کیا۔ "اس نے دامن بچانا چاہا' گریز کیا تو میری محبت میں اور شدت آ گئی۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کس لیے مجھ سے کھنچا کھنچا سا رہتا تھا اور کیوں ایک خوف سا اسے میرے قریب نہیں آنے دیتا تھا۔ وہ اکثر کہتا کہ مہ پارہ تم میرا ساتھ نہ دے سکو گی' اب بھی وقت ہے لوٹ جاؤ تمہیں میں وہ خوشیاں نہ دے سکوں گا جو ہر لڑکی چاہتی ہے۔ تم میرے ساتھ خوش نہ رہ سکو گی۔ میں اس کی وجہ پوچھتی تو وہ ادھر ادھر کی باتوں میں میرے سوال کو ٹال جاتا۔ اس وقت مجھ میں اتنی سمجھ نہیں تھی کہ اس کی باتوں کی گہرائی تک پہنچ سکتی۔ وہ کھاتے پیتے خاندان کا فرد تھا۔ بہ ظاہر کوئی ایسی بات معلوم نہ ہوتی تھی کہ واقعی وہ مجھے خوش نہ رکھ سکے گا۔ مختصر یہ کہ میری محبت کی شدتوں کے سامنے اس نے سپر ڈال دی تھی۔ شادی سے پہلے اس نے میری یہ بات مان لی تھی کہ میں بہ دستور ملازمت کرتی رہوں گی۔ اور اپنی تنخواہ ماں کو دیتی رہوں گی جن کی گزر بسر کا دارومدار میری تنخواہ ہی پر تھا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ اسے حاصل کرنے کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتی ہوں۔ پھر وہ وقت آگیا جب مجھے اپنا یہ دعویٰ ثابت کرنا تھا۔ میری اس سے شادی ہو گئی۔ پھر اسی رات مجھے معلوم ہوا کہ وہ کس لیے گریزاں رہتا تھا۔ اس کی محرومی کا کوئی علاج ممکن نہیں تھا۔ اس حقیقت کا علم ہونے کے بعد کچھ دیر کو میں سناٹے میں رہ گئی اور سوچا کہ اسے پہلے ہی صاف صاف مجھے سب کچھ بتا دینا چاہیے تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ اس نے کب میری تمنا کی تھی' میں ہی تو اس کی محبت میں دیوانی ہو گئی تھی۔ اس نے تو آخر وقت تک کوشش کی تھی کہ شادی نہ ہو۔ میں نے ہی تو دعویٰ کیا تھا کہ اس کی

خاطر ہر قربانی دے سکتی ہوں۔ میں نے سوچا کہ جسم ہی تو سب کچھ نہیں محبت صرف جسمانی رشتوں کا نام نہیں، محبت اس سے بلند ہے۔ وہ مجھے گم صم دیکھ کر خود بھی اداس ہو گیا تھا۔ معاً میں آگے بڑھی اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔ پھر میں نے جو کچھ سوچا تھا، اس سے کہہ دیا اور اس کا چہرہ کھل اٹھا سب کچھ جان لینے کے باوجود میں نے ایک بار پھر ساتھ نبھانے کا عہد کیا۔ میری محبت قربانی چاہتی تھی اور میں نے قربانی دے دی تھی۔ لیکن..... پھر بھی....." وہ چپ ہو گئی۔

کچھ دیر میں اس کے بولنے کا منتظر رہا، مگر اس کے لب نہ ہلے۔ میں نے اس خاموشی کو توڑا۔ "تم نے واقعی بہت بڑی قربانی دی تھی، پھر کیا ہوا؟ علیحدگی کیوں ہو گئی؟ اس کی نوبت کیوں آئی؟" میں اب "آپ" سے "تم" پر آ گیا تھا۔ شاید اس لیے کہ میرے اور اس کے درمیان حجابات کے پردے اٹھتے جا رہے تھے۔

"اس کا سبب اس کا باپ تھا۔" بالآخر وہ بول اٹھی۔ "پہلے پہل کچھ دن میں اس کی بے تکلفی جو نظر انداز کرتی رہی، یہ سوچ کر کہ بہرحال وہ میرے شوہر کا باپ ہے اور شاید اسی رشتے کی وجہ سے ہر وقت میرا خیال رکھتا ہے تاکہ میں نئے گھر میں اجنبیت محسوس نہ کروں۔ وہ وقت بے وقت میرے کمرے میں آ جاتا۔ پھر ایک دن یہ ہوا کہ میں اکیلی اپنے کمرے میں سو رہی تھی کہ اس نے ایک ایسی نازیبا حرکت کی جسے کوئی شریف لڑکی برداشت نہیں کر سکتی میں جاگ اٹھی اور اس پر برس پڑی۔ وہ پہلے بے حیائی سے ہنستا رہا، پھر سنجیدہ ہو گیا اور..... اور کہنے لگا کہ....." کہ وہ ایک بار پھر خاموش ہو گئی۔

میں اس کے چہرے پر آتے جاتے رنگ دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ اپنی بات کہنے کے لیے مناسب الفاظ کا انتخاب کر رہی تھی۔ اس مرتبہ مجھے درمیان میں بولنے کی ضرورت نہ پڑی۔

"اس بے غیرت شخص نے مجھ سے کہا کہ اگر مجھے اپنے شوہر سے واقعی محبت ہے اور اسے بدنامی سے بچانا چاہتی ہوں تو....." وہ رک رک کر دوبارہ بولنے لگی۔ "تو مجھے اس کی ہر بات مان لینا چاہیے، مجھے یہ قربانی دینے سے دریغ نہیں کرنا چاہیے، اس نے مجھے یہ دھمکی بھی دی کہ اگر میں نے اس کی بات نہ مانی تو وہ مجھے اپنے بیٹے سے طلاق دلوا دے گا۔ یہ سن کر میں آپے سے باہر ہو گئی اور اس شیطان کو اپنے کمرے سے نکال دیا۔ میں نے اپنے شوہر سے اس کی شکایت کی اور تمام واقعہ بیان کر دیا اور پھر..... پھر میرے سارے خواب بکھر گئے۔ مجھے پہلی بار اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا۔ بے غیرت باپ کا بیٹا بھی بے غیرت نکلا کیوں کہ وہ اپنے باپ کا ہم نوا بن گیا تھا۔" یہ کہتے ہوئے مہ پارہ کی آواز بھرا گئی۔ شدت جذبات سے اس کے نازک نازک ہونٹ لرز رہے تھے۔

حسین لڑکی اداس بھی ہو تو حسین لگتی ہے بلکہ بعض لڑکیاں تو حالت سوگواری میں اور بھی قیامت ڈھانے لگتی ہیں۔ مہ پارہ بھی ایسی ہی لڑکیوں میں سے تھی۔ جانے کیسے اور کب میں نے اس کا نرم و گداز ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اور اب تسلی آمیز انداز میں اسے تھپکیاں دے رہا تھا۔

"مہ پارہ زندگی نے تمہیں بھی تنہا کر دیا ہے اور..... اور میں بھی اکیلا ہوں، مگر تمہاری والدہ تو ابھی زندہ ہوں گی۔"

"نہیں۔" اس نے جواب دیا اور آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ "مجھے طلاق ہوئی تو وہ یہ صدمہ برداشت نہ کر سکیں اور..... اور کچھ ہی دن بعد....." وہ سسک اٹھی۔

"ہمت کرو مہ پارہ۔" میں نے اسے سمجھایا۔ "آنسو بہت قیمتی شے ہوتے ہیں، انہیں یوں نہیں گنواتے۔ اگر..... اگر تم چاہو تو مجھے..... مجھے اپنی اداس اور محروم زندگی کا سہارا سمجھ سکتی ہو۔"

"آپ..... آپ....." اس کے ہونٹ لرزے۔ "آپ تو خود زندگی کی آخری سرحد پر کھڑے ہیں۔"

"نہیں مہ پارہ۔" میں نے پرزور آواز میں کہا۔ "اگر تم چاہو تو مجھے موت کی سرحد سے کھینچ کر دوبارہ زندگی کی حدود میں واپس لا سکتی ہو۔ محبت میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔"

"کیا..... کیا یہ..... یہ ممکن ہے؟" وہ جیسے اپنے آپ سے مخاطب تھی۔

"ہاں بالکل ممکن ہے۔" میں پر اعتماد آواز میں بولا۔ ہمزاد کا عمل پورا ہونے کے بعد مجھے یقیناً نئی زندگی مل جاتی، مگر میں یہ بات اسے نہیں بتا سکتا تھا میں نے اسی لیے محبت کا بہانہ بنایا تھا۔

اس نے گرم جوشی سے میرا ہاتھ دبایا اور اپنے آنسو پونچھ لیے۔ اب اس کا چہرہ کسی ایسے گلاب کے مانند محسوس ہو رہا تھا جیسے شبنم کے قطروں نے اور نکھار دیا ہوں وہ اس لڑکی کی ہم شکل تھی جسے پانے کی تمنا میں مجھے بڑے عذابوں سے گزرنا پڑا تھا اور اب تک ان عذابوں سے مجھے نجات نہیں ملی تھی۔ میں اسے نہیں پا سکا تھا۔ اب میں سوچ رہا تھا کہ اگر یہ لڑکی مجھے مل گئی تو شاید میری زندگی کا وہ خلا پر ہو جائے گا۔ مجھے ٹھیک طرح یاد نہیں وہ اسی جذباتی فضا میں جانے کب میں نے اس کا ہاتھ تھام کر کرسی سے اٹھایا اور پھر اسے لیے ہوئے اپنی مسہری پر آ بیٹھا۔ اس وقت یقیناً میں اپنے حواس میں نہیں تھا اور وہ بھی شاید ہوش کھو بیٹھی تھی یہ وہ لمحے تھے جو الفاظ کا بوجھ نہیں اٹھاتے۔ بے زبانی کی زبان میں گفتگو کا فن اسے آتا ہو یا نہ آتا ہو

مگر مجھے آتا تھا۔ یہ وہ فن ہے جسے سیکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ خود بہ خود آجاتا ہے۔ چند ہی لمحے بعد میں نے محسوس کیا کہ اسے بھی گفتگو کا یہ فن آتا جارہا ہے۔ انفاس کی خوشبو سے مہکتی ہوئی ساعتوں میں مجھے اچانک شدید خطرے کا احساس ہوا۔ میں یہ کیا کر رہا ہوں؟ میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بج اٹھیں اس طرح تو میرا عمل ناکام ہو جائے گا۔ میں نے موت کو گلے کیوں لگالیا ہے؟ نہیں' مجھے زندہ رہنا ہے' میں زندہ رہوں گا اس احساس کے ساتھ ہی منزل شوق کی طرف اٹھتے ہوئے قدم رک گئے اور میں نے خود پر قابو پالیا' مگر ضروری نہیں کہ جو ہم سفر ہو اس کے قدم بھی رک جائیں۔

مجھے گریز پا دیکھ کر اس پر ایک جنون سا طاری ہو گیا۔

"مہ پارہ..... مہ پارہ! خود کو سنبھالو!" میں نے اسے جھنجوڑا۔

"تم ظالم ہو..... دھوکے باز ہو..... فریبی اور سنگ دل ہو۔" وہ چیخ اٹھی۔ "تم میری توہین کر رہے ہو..... مجھے ذلیل کیا ہے تم نے..... میں تمہیں..... تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔" یہ کہتے ہوئے اس نے میرے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔ نہ معلوم اس میں اتنی طاقت کہاں سے آگئی تھی کہ ایک ہی جھٹکے میں میرا گریبان' دامن سے جاملا۔

یقیناً اس کی چیخیں کمرے سے باہر بھی جارہی ہوں گی' مگر ارشاد علی اندر نہ آیا۔ پھر وہ میرے چہرے پر نقش و نگار بنانے لگی۔ اور میری قوت برداشت جواب دے گئی تو میں نے اسے پیچھے دھکیل دیا۔ وہ مسہری سے فرش پر گری اور پھر اسے جانے کیا سوجھی کہ چیختے ہوئے اس نے خود اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے۔

"جس طرح تو نے مجھے...... مجھے ذلیل کیا ہے' میں بھی تجھے ذلیل و رسوا کروں گی۔"

وہ کسی پاگل عورت کی طرح چیخی اور پھر اٹھ کر دروازے کی طرف بھاگی۔

"وہ چیختی ہوئی دروازہ کھول کر نکل گئی۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے اور اچانک ہوا تھا کہ کچھ دیر کو میری عقل گم ہو کر رہ گئی۔ میری سمجھ ہی میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔

پھر جب میرے حواس کچھ بجا ہوئے تو میں نے تیزی کے ساتھ لباس تبدیل کیا اور کمرے سے نکلا۔ دروازے پر ارشاد علی بوکھلایا ہوا سا کھڑا تھا۔ اس نے اب سے پہلے یقیناً میری کوٹھی میں کوئی ایسا منظر نہیں دیکھا تھا۔ اس کی بوکھلاہٹ فطری تھی۔

"وہ کہاں گئی؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"وہ..... وہ ادھر چیختی ہوئی گئی تھی جناب۔" اس نے جواب دیا۔

"اسے ڈھونڈو..... تلاش کرو..... جلدی! کہیں وہ کوٹھی سے نکل نہ جائے۔" میں نے ارشاد علی کو حکم دیا۔ مجھے اب پوری طرح خطرے کی شدت کا احساس ہو چکا تھا۔

ارشاد علی میرا حکم سنتے ہی دوڑ گیا۔ مجھ پر اتنی بدحواسی طاری تھی کہ خود بھی اس کے پیچھے دوڑنے لگا۔

ساری کوٹھی میں ایک ہنگامہ سا برپا تھا۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ اچانک ہوا کیا! ڈاکٹر امتیاز اور نرس بیلا مہ پارہ کی چیخیں سن کر اپنے کمروں سے نکل آئے تھے۔ انہوں نے مہ پارہ کو چیختے ہوئے صدر دروازے کی طرف بھاگتے دیکھا تھا۔ مجھے یہ معلوم ہوا تو جیسے میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔

"ہوا کیا جناب؟" ڈاکٹر امتیاز مجھ سے پوچھ رہا تھا۔ "وہ آپ کے کمرے کی طرف گئی تھی اور پھر جب وہ لوٹی تو اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور وہ چیختی ہوئی بھاگ رہی تھی۔" اس کے لہجے سے شک و شبہے کا اظہار ہو رہا تھا۔

"مجھے خود نہیں معلوم ڈاکٹر کہ اسے کیا ہوا"؟" میں نے جواب میں کہا۔ "اس نے ایک دم ہی مجھ پر حملہ کر دیا تھا اور پھر خود ہی اپنے کپڑے پھاڑ لیے تھے اور....."

"لیکن..... لیکن جناب' یہ کس طرح ممکن ہے۔" وہ بولا۔

"میں خود حیران ہوں۔" میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "ممکن ہے' وہ کسی دماغی عارضے میں مبتلا ہو۔"

اسی وقت ارشاد علی اور میرے دوسرے ملازمین نے آکر بتایا کہ مہ پارہ' کوٹھی میں کہیں نہیں ہے اور صدر دروازہ کھلا ہوا پایا گیا ہے۔ انہوں نے خیال ظاہر کیا کہ وہ یقیناً کوٹھی سے فرار ہو چکی ہے۔

"صدر دروازہ بند کر دیا تم لوگوں نے؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں جناب۔" ارشاد علی نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر میں اپنے کمرے کی طرف مڑ گیا۔

"سنئے جناب۔" ڈاکٹر امتیاز نے پیچھے سے مجھے آواز دی۔

"جی۔" میں نے رک کر کہا۔

"مجھے آپ سے کچھ بات....."

"میرے ساتھ آجائیے۔" میں بات کاٹ کر بولا۔ "کمرے میں چل کر بات کریں گے۔"

ڈاکٹر امتیاز میرے ساتھ ہولیا۔ جلد ہی میں اس کے ساتھ اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ وہ میرے اشارے پر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ہاں اب کہیں' کیا بات ہے؟" میں اس کے مقابل والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"ڈاکٹر انوار الحق صاحب یقیناً مجھ سے اس سلسلے میں استفسار کریں گے۔ اس صورت میں انہیں میں کیا جواب دوں؟" اس نے مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ "مہ پارہ بہرحال انہی کے ایما پر یہاں آئی تھی۔ ظاہر ہے کہ ان کے علم میں بھی یہ واقعہ آئے گا۔"

"غالباً ابھی کچھ دیر پہلے میں اس سلسلے میں وضاحت کر چکا ہوں۔ میرے لہجے میں تلخی سی آگئی۔

"لیکن یہ بیان تو آپ کا ہے۔"

"تو کیا آپ مجھے جھوٹا سمجھ رہے ہیں۔ کیا آپ کا خیال ہے کہ میں نے اس پر مجرمانہ حملہ کیا ہوگا؟" میرا لہجہ کچھ اور تلخ ہوگیا۔ میرا ذہن یوں ہی پریشان تھا اور وہ بحث کیے جارہا تھا اس لیے جھنجلاہٹ سوار ہو جانا فطری ہی تھی۔

"نہیں' میرا مطلب یہ نہیں تھا جناب۔" وہ کچھ سٹپٹا گیا حالانکہ مجھے یقین تھا کہ جو کچھ میں نے کہا تھا' اس کے ذہن میں وہی تھا۔

"پھر کیا مطلب تھا آپ کا؟" میں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اسے لاجواب کرنا چاہا۔

"میرا مطلب تھا جناب کہ ڈاکٹر انوار الحق میری بات پر یقین بھی کریں گے یا نہیں۔ کیوں کہ انہوں نے دونوں نرسوں کو بہرحال میری ذمے داری پر اور میرے ساتھ یہاں بھیجا تھا۔" وہ اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔ "آپ مجھے غلط نہ سمجھیں۔ مجھے آپ کی بات پر یقین ہے۔ عین ممکن ہے کہ مہ پارہ کسی دماغی عارضے ہی کا شکار ہو۔"

"حقیقت بہرحال حقیقت ہوتی ہے۔" میں نرمی سے بولا۔ "یہ بہرحال میرا مسئلہ نہیں کہ ڈاکٹر انوار الحق آپ کی بات پر یقین کرتے ہیں یا نہیں۔"

ابھی میری بات ختم ہوئی تھی کہ میرا ملازم ارشاد علی کمرے میں داخل ہوا اور کہا۔

"جناب دوسری نرس صاحبہ' ڈاکٹر صاحب کو بلا رہی ہیں۔ کہہ رہی ہیں کہ انہیں ڈاکٹر صاحب سے کوئی ضروری بات کرنا ہے۔" یہ کہہ کر وہ میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"جائیں آپ۔" میں نے ڈاکٹر امتیاز سے کہا۔ "دیکھیں کیا بات ہے۔"

میری بات سن کر ڈاکٹر امتیاز اٹھ کھڑا ہوا اور پھر کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

پھر جب وہ کچھ دیر بعد لوٹ کر آیا تو اس کے چہرے پر فکر مندی کے آثار تھے۔ وہ کرسی پر بیٹھتے

ہی بولا۔ "آپ ہی بتائیں جناب کہ اب کیا کیا جائے؟"

"کس سلسلے میں؟" میں نے پوچھا۔

"نرس بیلا فوری طور پر یہاں سے جانا چاہتی ہے۔ وہ اپنا سامان بھی باندھ چکی ہے۔ میرے سمجھانے اور اصرار پر وہ کچھ دیر رک گئی ہے۔" ڈاکٹر امتیاز نے بتایا۔

"آپ نے ناحق روکا اسے۔" میں جھنجلا گیا۔ "اگر وہ جانا چاہتی ہے تو جانے دیں۔ اسے زبردستی تو یہاں رہنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔"

"لیکن کوئی ایک نرس تو ہونا ہی چاہیے تھی۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"کیوں' کیا آپ تنہا ڈریسنگ نہیں کرسکتے؟"

"کرسکتا ہوں' مگر اور بھی تو مسئلے ہیں۔ وقت پر آپ کو دوائیں....."

"اس کی آپ فکر نہ کریں۔" میں اس کی بات کاٹ کر بولا۔ "میں خود بھی وقت پر دوائیں کھا سکتا ہوں۔ مسئلہ صرف ڈریسنگ کا ہے۔"

اگر ایسا ہی ہے تو پھر یہاں میرے قیام کی بھی کوئی ایسی خاص ضرورت نہیں رہتی۔"

"تو کیا آپ بھی جانا چاہتے ہیں؟" میں نے دریافت کیا۔

"میں سوچ رہا تھا کہ جب صرف ڈریسنگ ہی کرنا ہے تو صبح و شام آکر....."

"ٹھیک ہے۔" میں بول اٹھا۔ "مجھے کوئی اعتراض نہیں....." میں دراصل اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ عمل کے دوران میں کوٹھی کے اندر کوئی باہر کا آدمی نہ ہو تو بہتر ہے ملازمین سے تو کسی طرح نمٹا بھی جاسکتا ہے۔ مگر باہر کے آدمی پر حکم نہیں چلایا جاسکتا۔ کیا خبر ابھی کیا صورت پیش آئے اور میری دشمن جاں کے ترکش میں میرے لیے کتنے تیر باقی ہوں۔

"پھر میں کل صبح آپ کی ڈریسنگ کرکے یہاں سے چلا جاؤں گا۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں بیلا سے کہہ دیتا ہوں کہ وہ چلی جائے۔"

میں کچھ نہ بولا اور ڈاکٹر امتیاز میرے کمرے سے نکل گیا۔

ابھی ڈاکٹر امتیاز کو گئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ارشاد علی نے آکر وہ خبر دی جس کا میں بہت دیر سے منتظر تھا۔

"انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا دو' میں آرہا ہوں۔" میں نے اس سے کہا۔

مجھے علم تھا کہ وہ لڑکی جو دھمکی دے کر گئی تھی' اس کا نتیجہ بھی برآمد ہوگا۔ پولیس میری کوٹھی تک پہنچ چکی تھی۔

ڈرائنگ روم میں پہنچ کر میں نے دیکھا کہ وہ ایک اے ایس آئی تھا اور اس کے ساتھ

دو پولیس والے بھی تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اے ایس آئی بولا۔ "آپ کو ہمارے ساتھ تھانے چلنا ہے۔"

"مگر کیوں؟" میں جان کر انجان بن گیا۔

"ایک نرس مہ پارہ نے آپ کے خلاف رپورٹ درج کرائی ہے کہ آپ نے اس پر مجرمانہ حملہ کیا ہے۔" اے ایس آئی نے جواب دیا' پھر بولا۔ "اور یہ بھی سن لیجئے کہ اس وقت آپ کی کوٹھی میں جو افراد موجود ہیں' وہ یہاں سے کہیں نہ جائیں کیوں کہ بہ طور گواہ ان کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔"

"مجھے بیلا کا خیال آگیا۔ کیا خبر وہ اب تک جا چکی ہو یا موجود ہو۔" ٹھہریں' میں آتا ہوں ابھی۔" میں نے کہا۔

"کہاں جا رہے ہیں آپ؟" اے ایس آئی فوراً کھڑا ہو گیا۔ "آپ اس وقت تک خود کو زیرِ حراست سمجھیں جب تک بے گناہ ثابت نہ ہو جائیں۔"

اس کی بات سن کر مجھے غصّہ آگیا' مگر یہ وقت غصّے کے اظہار کا نہیں تھا۔ میں نے اسی لیے غصہ ضبط کرتے ہوئے اسے بتا دیا کہ کہاں جا رہا ہوں۔

"ٹھیک ہے' چلیں۔" اے ایس آئی میرے ساتھ ہو لیا اور دونوں پولیس والوں نے بھی اس کی تقلید میں ایسا ہی کیا۔

ڈاکٹر امتیاز اپنے کمرے میں تھا' مگر بیلا کا کمرہ خالی تھا۔ وہ جا چکی تھی۔

"آپ کے پاس اس کا پتا ہے؟" اے ایس آئی نے ڈاکٹر امتیاز سے پوچھا۔

"جی ہاں۔" ڈاکٹر امتیاز نے جواب دیا اور پھر اے ایس آئی کے کہنے پر پتا لکھ کر دے دیا۔

"ممکن ہے کہ آپ کو بھی ابھی کچھ دیر بعد یا کل صبح تھانے بلوایا جائے اس لیے یہیں رہیں۔" اے ایس آئی نے ڈاکٹر امتیاز سے کہا' پھر میری طرف مڑا۔ "چلیں جناب' آپ تو چلیے۔"

میں اس کے ساتھ چل دیا کیوں کہ اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔ اس وقت رات کے پونے گیارہ بج رہے تھے۔ ابھی عمل شروع کرنے میں سوا گھنٹا باقی تھا اور اسی عرصے میں مجھے بہرحال یہ معاملہ نمٹانا تھا ورنہ یہ عمل شروع نہ کر سکتا۔

مجھے توقع تھی کہ تھانے پہنچ کر میری ملاقات ایس ایچ او سے ہو گی جسے میں اس دن صبح پانچ ہزار روپے بہ طور رشوت دے چکا تھا۔ وہ یقیناً میرا کچھ نہ کچھ خیال کرے گا' مگر وہاں

جا کر معلوم ہوا کہ موصوف گشت پر ہیں۔ پولیس والوں سے اب تک میرا بڑا سابقہ پڑ چکا تھا۔ مجھے "گشت" کا مطلب اچھی طرح معلوم تھا۔ جب ایس ایچ او اندراجات کے مطابق علاقے کے گشت پر ہوتا ہے تو عموماً اس کا گشت صرف گھر تک ہوتا ہے اور وہ اس وقت خوابِ خرگوش کے مزے لوٹ رہا ہوتا ہے۔

مہ پارہ ابھی تک تھانے میں موجود تھی۔ اے ایس آئی نے اس سے میری شناخت کرائی اور پھر اس کو جانے کی اجازت دے دی۔ وہ اس وقت بھی مجھے بڑی خوں خوار نظروں سے گھور رہی تھی جیسے کچا ہی چبا جائے گی۔ میرا خیال تھا کہ اب اے ایس آئی مجھ سے پوچھ گچھ کرے گا' میرا بیان وغیرہ لے گا' مگر ایسا نہیں ہوا' اس نے ایک کانسٹیبل کو حکم دیا۔ انہیں لے جا کر حوالات میں بند کر دو۔"

یہ سنتے ہی جیسے میری سٹی گم ہو گئی اور میں بہ مشکل کہہ سکا۔ "مگر کیوں؟ ابھی..... ابھی تو مجھ پر ثابت نہیں ہوا۔"

""حوالات میں صرف مجرموں ہی کو نہیں' ملزموں کو بھی بند کیا جاتا ہے۔" اے ایس آئی کے لہجے میں چبھن تھی۔ "آپ یقیناً پڑھے لکھے آدمی معلوم ہوتے ہیں' مجرموں اور ملزم کا فرق اچھی طرح سمجھتے ہوں گے۔"

"ہاں میں جانتا ہوں کہ مجرم اسے کہتے ہیں جس پر جرم ثابت ہو جائے اور ملزم وہ ہے جس پر کوئی الزام ہو۔" مجھے غصّہ آنے لگا۔ "آپ مجھے صفائی کا موقع بھی نہیں دے رہے اور حوالات میں بند کرا رہے ہیں۔ یہ کچھ مناسب بات تو نہیں۔"

"کیا مناسب ہے کیا نہیں' اسے ہم بہتر سمجھتے ہیں۔" وہ سختی سے بولا۔ "اس وقت رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔ ضروری نہیں کہ اسی وقت تفتیش شروع کر دی جائے۔ یہ کام صبح بھی ہو سکتا ہے۔"

"تو پھر مجھے بھی آپ صبح بلوا سکتے ہیں۔" میں ترکی بہ ترکی بولا۔

"اور رات کو تم فرار ہو جاؤ تو۔" وہ "آپ" سے "تم" پر اتر آیا۔ "تمہارے خلاف ایف آئی آر کٹ چکی ہے' سمجھے! اور تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس میں وقت بھی درج ہوتا ہے۔ اگر ہم سے جواب طلب کیا گیا کہ رات ہی کو کارروائی کیوں نہیں کی گئی؟ پھر..... پھر ہمارے پاس کیا جواب ہو گا۔"

"اچھا یہ بتائیں کہ آپ کے ایس ایچ او صاحب کب تک گشت سے لوٹ آئیں گے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ انہیں گشت کے دوران میں اطلاع دی جا سکے....."

"کس بات کی اطلاع؟" اس نے آنکھیں نکالیں۔ رفتہ رفتہ اس کا رویہ میرے ساتھ سخت ہوتا جارہا تھا۔

"یہی کہ میں ان سے فوری طور پر ملنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا "آپ کو شاید معلوم نہیں کہ میرے ان سے اچھے تعلقات ہیں۔"

"آپ کے ان سے اچھے تعلقات ہیں' اس کا اندازہ تو مجھے گذشتہ رات ہی ہو گیا تھا۔" اس کے لہجے میں کاٹ تھی۔ "کل جب آپ کے کمرے کا تالا توڑا گیا تھا تو یہ خادم بھی وہاں موجود تھا۔ ظاہر ہے کہ آپ کے ایس ایچ او صاحب سے اچھے تعلقات نہ ہوتے تو ایسا کیوں ہوتا۔ ویسے میں سمجھ رہا ہوں کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔" اس کے بعد وہ پھر بے تکلفی پر اتر آیا۔ "سنو! ایف آئی آر کٹنے کے بعد وہ بھی کچھ نہیں کر سکتے۔ گزشتہ رات والا معاملہ مختلف تھا۔ اس کی رپورٹ درج نہیں ہوئی تھی۔ سمجھ گئے اب کہ اس معاملے میں تعلقات نہیں چلیں گے۔" اس نے لفظ تعلقات پر زور دے کر کہا۔ یقیناً اس کے علم میں یہ بات ہوگی کہ میں نے ایس ایچ او کو رشوت دی ہے۔

میں چکرا کر رہ گیا۔ عمل شروع کرنے میں صرف ایک گھنٹا باقی رہ گیا تھا۔ اگر وہ مجھے حوالات میں بند کر دیتا تو سارا کھیل ہی ختم ہو جاتا۔ ہمزاد کے عمل میں وقت اور جگہ کو خصوصی حیثیت حاصل تھی۔ شرائط کے مطابق نہ جگہ بدلی جاسکتی تھی۔ نہ وقت جس جگہ اور جس وقت عمل شروع کیا گیا تھا' اس کی پابندی لازمی تھی ورنہ عمل باطل ہو جاتا اور عمل کے باطل ہونے کا مطلب میری یقینی موت تھا۔ اب میں بڑی حد تک اس نتیجے تک پہنچ گیا تھا کہ میرے ساتھ جو کچھ ہوا ہے' اس میں میری دشمن جاں کے انتقام کو دخل ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ میں عمل پورا کرسکوں۔ گذشتہ شب وہ میری قوت ارادی کے سبب ناکام ہو گئی تھی۔ کوئی اور میری جگہ ہوتا تو ان حالات میں کسی نہ کسی مرحلے پر دھوکا کھا جاتا یا اگر میں بھی تجربہ کار نہ ہوتا تو اس کے وار سے بچنا مشکل تھا۔ اس مرتبہ اس نے ایک اور حربہ آزمایا تھا' مگر کس طرح ایسا ممکن ہوا؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اب تک میں نے ارواح کے متعلق جو کچھ پڑھا تھا اور جو باتیں خود میرے تجربے میں آئی تھیں' موجودہ واقعہ ان سے قطعی مختلف تھا۔ کوئی روح بھلا کسی مادی جسم کو کس طرح اپنا سکتی ہے۔ میں نے اس نرس کے مادی وجود کو چھوا تھا۔ وہ ایک جیتی جاگتی لڑکی تھی۔ اس پر کسی روح کا گمان نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس وقت مجھے وہ زمانہ یاد آگیا جب مہ پارہ ایک عمل کر رہی تھی اور میں چاہتا تھا کہ وہ عمل پورا نہ کرسکے۔ میں نے بھی اس پر بہت حربے آزمائے تھے' مگر کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ چند ہی لمحوں میں میرے ذہن نے ایک فیصلہ کرلیا' اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا' لیکن اس کا دارومدار اس شخص پر تھا جو میرے سامنے وردی میں ملبوس بیٹھا ہوا تھا۔ معاً میں نے اس سے کہا۔ "میں آپ سے خلوت میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"دیکھو یہ معاملہ بہت ٹیڑھا ہے' میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکوں گا۔" اس نے غالباً اپنا بھاؤ بڑھانے کے لیے پیش بندی کی' پھر بولا۔ "خیر کہو کیا بات ہے؟" یہ کہتے ہی اس نے اپنے کمرے سے دونوں کانسٹیبلوں کو باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔

کمرے میں وہ اکیلا رہ گیا تو میں بولا۔ "یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں کہ آپ لوگوں کے لیے بدتر سے بدتر حالات میں کوئی بہتر راہ نکالنا مشکل نہیں ہوتا۔"

"تمہید نہ باندھو۔ اس نے مجھے تاکید کی۔ "جو کہنا ہے' صاف صاف کہو اور یہ بات ذہن میں رکھو کہ میں تمہیں چھوڑ نہیں سکتا' یہ میرے اختیار کی بات نہیں ہے۔ اس وقت ضمانت بھی نہیں ہو سکتی۔ جو کچھ ہونا ہے' صبح ہی ہوگا۔ یہ تم بھی جانتے ہو کہ اس وقت کوئی عدالت کھلی نہیں ہوگی۔"

"میں جانتا ہوں۔" میں نے سر ہلایا۔ "مگر میں نے کچھ اور ہی سوچا ہے۔ یہ آپ کے بس میں ہے۔"

"کچھ کہو بھی تو۔" اس نے منہ بگاڑ کر کہا۔

"دراصل میری ایک مجبوری ہے کہ میں اپنی کوٹھی سے باہر رات بسر نہیں کر سکتا۔" میں نے آخر کہہ ہی دیا۔ "میں ایک عمل کر رہا ہوں جس کے لیے جگہ اور وقت لازمی شرائط ہیں۔"

"پھر میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں؟" اس کے لہجے میں روکھا پن تھا' شاید اس لیے کہ میں نے ابھی اس کے مطلب کی بات نہیں کی تھی۔

"آپ ہی تو سب کچھ کر سکتے ہیں۔" میں جلدی سے بولا۔ "آپ مجھے گھر جانے کی اجازت دے کر یہ بھی ظاہر کر سکتے ہیں کہ آپ نے کارروائی کی مگر میں اپنی کوٹھی میں نہیں ملا۔"

"بہت خوب۔" اس نے طنزیہ آواز میں کہا۔ "تمہارے خیال میں یہ بات چھپی رہ سکتی ہے۔"

"اگر یہ ممکن نہیں تو ایک اور صورت ہے۔"

"وہ بھی بیان کردو۔" اس کے لہجے میں بدستور چبھن تھی۔

میں نے اس کے طنزیہ لہجے کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ "آپ روزنامچے میں یہی درج کریں کہ مجھے حوالات میں بند کر دیا گیا ہے' مگر مجھے صبح تک کے لیے اپنے گھر جانے کی اجازت دے دیں تاکہ میں عمل کر سکوں۔"

"اور تم رات کو غائب ہو جاؤ تو اپنی نوکری سے ہاتھ دھو بیٹھوں۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ صبح ہوتے ہی حاضر ہو جاؤں گا۔" میں نے پرزور آواز میں اسے یقین دلانا چاہا۔

"یہ جو تم اتنی باتیں بنا رہے ہو' اور مجھے رستہ دکھا رہے ہو تو اس سے مجھے کتنی رکعت کا ثواب ملے گا۔" وہ آخر مطلب کی بات پر آ ہی گیا۔

"آپ جو حکم دیں' میں وہ خدمت کرنے کو تیار ہوں۔ صرف ایک رات کی بات ہے۔"

وہ کچھ سوچنے لگا' پھر بولا۔ "دیکھو یہ کوئی ہنسی کھیل نہیں۔ اگر تم صبح لوٹ کر نہ آئے تو میری وردی اتر جائے گی۔" اس نے انکار میں سر ہلایا۔ "نہیں' میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ اگر ملک صاحب کو معلوم ہو گیا اور وہ صبح جلدی تھانے آ گئے تو بات بگڑ جائے گی۔"

"میں ان کے آنے سے پہلے صبح فجر پڑھتے ہی یہاں آ جاؤں گا۔ ویسے آپ کے اس اطمینان کے لیے کہ میں فرار نہیں ہوں گا' ایک اور صورت ہے۔"

"کیا؟" اس نے پوچھا۔

"آپ اپنے کسی سپاہی کو میرے ساتھ بھیج دیں جو میرے کمرے کے دروازے پر کھڑا رہے اور صبح ہونے تک میری نگرانی کرے۔" میں نے تجویز پیش کی۔

"ہاں یہ ہو سکتا ہے' لیکن....." وہ کچھ سوچنے لگا' پھر خود ہی سر ہلا کر کہنے لگا۔ "شریف اللہ..... ہاں وہ ٹھیک رہے گا۔" اس کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔ پھر اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور بولا۔ "مگر ابھی تم نے مطلب کی بات تو کی ہی نہیں۔"

پھر "مطلب کی بات" دو ہزار میں طے ہو گئی۔ اس سودے بازی میں ساڑھے گیارہ بج گئے اور مجھ پر اضطراب طاری ہونے لگا۔ وہ خود میرے ساتھ کوٹھی تک آیا۔ اس کے ساتھ ایک کانسٹیبل بھی تھا اور شاید اسی کا نام شریف اللہ تھا۔ اس کانسٹیبل کو صبح تک میری نگرانی کرنا تھی۔

جب اے ایس آئی جانے لگا تو مجھ سے اس نے کہا۔ "یہ غریب شریف اللہ صبح تک محض تمہاری خاطر جاگے گا' اسے بھی سو دو سو دے دینا۔"

"بہتر ہے۔" میں نے ہامی بھرلی' پھر مجھے ایک بات یاد آ گئی۔ "سنیں صبح ہونے سے کچھ پہلے میں' کوٹھی سے نکل کر جاؤں گا اور پھر کچھ دیر بعد میری واپسی ہو گی۔ اپنے آدمی سے کہہ دیں کہ وہ مجھے نہ روکے اور چاہے تو اس دوران میں بھی مجھ پر نظر رکھے' مگر کوئی بات نہ کرے۔"

"ٹھیک ہے' میں کہے دیتا ہوں' مگر خیال رکھنا' کوئی دھوکا کیا تو تمہارے حق میں اچھا نہیں ہو گا۔" اے ایس آئی نے کہا۔ پھر وہ کانسٹیبل کو الگ لے جا کر کچھ ہدایات دیتا رہا' اس کے بعد رخصت ہو گیا۔

اب عمل شروع کرنے میں صرف پانچ منٹ باقی رہ گئے تھے۔ میں جلدی سے اپنے کمرے میں گھس گیا۔ میں نے ارشاد علی کو اس سے پہلے یہ بتا دیا تھا کہ وہ کانسٹیبل بھی میرے کمرے کے دروازے پر متعین رہے گا' مگر اس کے باوجود کمرے کا دروازہ کسی صورت نہیں کھولنا ہے۔ میں اندر چلا گیا تو اس نے دروازہ بھیڑ دیا۔ میں نے بہ طور احتیاط اندر سے کنڈی چڑھائی۔ عمل کے دوران میں مجھے جن چیزوں کی ضرورت تھی' وہ میری ہدایات کے مطابق ارشاد علی نے پہلے ہی وہاں رکھ دی تھیں۔

عمل شروع کیے ہوئے مجھے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اپنے سائے کے قریب میں نے مہ پارہ کا ہیولا دیکھا۔ معاً مجھے اس کی زہریلی آواز سنائی دی۔ "میرے دوسرے وار سے بھی بچ گئے۔ شیخ میں بھی دیکھتی ہوں کہ تم کب تک بچتے ہو۔"

اس کی آواز میرے کانوں میں آ رہی تھی اور اس کا ہیولا بھی میرے دائرہ نظر میں تھا' مگر عمل کا ورد بہ دستور جاری تھا۔ اس کے الفاظ ختم ہوئے ہی تھے کہ اچانک مجھے بہت زور کی گڑگڑاہٹ محسوس ہوئی۔ یوں لگا جیسے میں جس زمین پر بیٹھا ہوں' وہ اندر دھنستی جا رہی ہے۔ اور کمرے کی دیواریں میرے اوپر گرنے والی ہیں۔

اسی وقت کسی نے باہر سے دروازہ دھڑ دھڑایا اور پھر مجھے اپنے ملازم ارشاد علی کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ "زلزلہ!..... زلزلہ آ رہا ہے جناب! دروازہ کھولیے ورنہ دب جائیں گے۔"

لمحہ بھر کو جیسے میں خوف زدہ ہو گیا۔ چاٹگام میں زلزلہ آنا کوئی ناممکن بات نہیں تھی۔ وہاں آئے دن یوں بھی طوفان آتے رہتے تھے۔ میں نے سوچا کہ کہیں سچ مچ زلزلہ نہ آ گیا ہو۔ مگر پھر میں نے فوراً ہی اپنے حواس کو قابو میں کرلیا۔ مجھے خیال آیا کہ حصار سے اٹھ کر بھاگنے کا مطلب بھی موت ہے' اب نہیں تو کچھ دن بعد' اور اگر واقعی زلزلہ آ گیا ہے' کوٹھی کے درو

دیوار گرنے والے ہیں تو بھی موت یقینی ہے۔ پھر میں کیوں عمل کا ورد چھوڑوں۔ اس دوران میں مہ پارہ کا ہیولا غائب ہو چکا تھا۔

ارشاد علی نے مزید کچھ دیر کوشش کی کہ میں دروازہ کھول دوں' پھر شاید وہ ناکام ہو کر اپنی جان بچانے کی خاطر وہاں سے بھاگ گیا۔ پھر یوں لگا جیسے میرا وجود تیز ہواؤں کی زد میں ہو اور یہ کہ میں اپنی جگہ بیٹھا نہ رہ سکوں گا۔ یہ بھی فریب ہے۔ میں نے سوچا۔ اگر واقعی طوفانی جھکڑ چل رہے ہوتے تو چراغ کیسے جلتا رہتا اور چراغ نہ جل رہا ہوتا تو دیوار پر میرا سایہ کس طرح دکھائی دیتا۔ اس شب یہی ہنگامہ آرائی رہی۔ میں نے اسی دوران میں عمل کی ہدایات کے مطابق آئینہ بینی بھی کی اور پھر روٹی لے کر اپنے کمرے سے نکلا۔ مجھے قدم اٹھانا دوبھر ہو رہا تھا۔ ہر قدم پر یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں منہ کے بل زمین پر گر پڑوں گا۔ میرے پیروں کے نیچے جیسے زمین کانپ رہی تھی۔ دروازے کے باہر مجھے نہ ارشاد علی ملا نہ کانسٹیبل شریف اللہ وہی کیا' ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کوٹھی میں کوئی نہیں ہے۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں' صدر دروازے پر پہنچا تو اس کے دونوں پٹ کھلے ہوئے ملے۔ یوں جیسے کوٹھی سے نکلنے والے وحشت زدہ ہو کر وہاں سے بھاگے ہوں اور انہیں اتنا ہوش بھی نہ رہا کہ دروازہ بند کر جاتے۔

پھر جب چوراہ پر روٹی رکھ کر میں نے دوبارہ اپنی کوٹھی میں قدم رکھا تو ہر چیز معمول کے مطابق تھی۔ نہ اب زمین ہل رہی تھی' نہ طوفانی ہواؤں کا شور تھا۔ اس وقت صبح کی اذان ہو رہی تھی میں نے اپنے کمرے میں پہنچ کر وضو کیا اور پھر کچھ دیر بعد نماز پڑھی۔ سلام پھیرا تو مجھے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے توجہ نہ دی اور دعا مانگنے لگا۔

مصلّی تہ کر کے میں اٹھا تو سامنے ہی ارشاد علی کھڑا تھا اور اس کے چہرے پر انتہائی بدحواسی نظر آ رہی تھی۔

"تم حماقت سے باز نہیں آ رہے۔" میں نے اسے گھور کر دیکھا۔ "رات کو تم کیوں میرا دروازہ دھڑ دھڑا رہے تھے؟"

"وہ..... وہ جناب زلزلہ....." ہکلانے لگا۔

"بکو مت۔" میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ "جب میں کہہ چکا ہوں کہ کسی صورت رات کے وقت میرے کمرے کا دروازہ کھلوایا جائے تو پھر تم نے ایسا کیوں کیا؟"

"غلطی ہو گئی جناب۔" اس نے ندامت سے سر جھکا لیا۔

"اور تم غارت کہاں ہو گئے تھے؟"

"میں قریبی مسجد میں پناہ لینے چلا گیا تھا۔ وہاں کے مولوی صاحب سے میری جان پہچان

ہے۔ بقیہ سارے ملازمین اور ملازمائیں بھی مولوی صاحب کے حجرے میں ہیں۔" اس نے بتایا۔

"میں نے سوچا کہ صرف میں ہی فریب سماعت اور فریب نظر کا شکار نہیں ہوا تھا بلکہ میری کوٹھی میں جتنے بھی افراد تھے' ان پر یہی گزری تھی۔ اس خیال نے میرا غصّہ کم کر دیا اور میں نے نرمی سے کہا۔ "ان سب کو اب کوٹھی میں لے آؤ۔ یہ کہتے ہی مجھے ڈاکٹر امتیاز کا خیال آیا۔ "اور ڈاکٹر صاحب کہاں ہیں؟"

"معلوم نہیں جناب! ہوش کسے تھا' سب کو اپنی اپنی پڑی تھی۔" اس نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "میں نے تو بس سپاہی کو بھاگتے دیکھا تھا۔ وہ مجھ سے بھی پہلے بھاگ گیا تھا' اس وقت جب میں آپ کے کمرے کا دروازہ کھلوانے کی کوشش کر رہا تھا جب میں کوٹھی سے نکلا تو سارے ملازموں اور ملازماؤں کو کوٹھی سے کچھ فاصلے پر کھڑے ہوئے دیکھا۔ ان میں ڈاکٹر صاحب نہیں تھے۔ پھر میں ان سب کو لے کر قریبی مسجد میں چلا گیا۔ صاحب! یہ بڑی عجیب بات ہے کہ جب میں نے مولوی صاحب سے زلزلے کا ذکر کیا تو انہوں نے صفا انکار کر دیا اور کوٹھی سے نکلتے ہی خود مجھے بھی ایسا لگا جیسے زلزلہ آنا بند ہو گیا ہے۔"

میں اسے کیا بتاتا کہ محلے کی مسجد کا مولوی ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ زلزلہ ولزلہ کچھ نہیں آیا تھا' وہ سب کچھ مہ پارہ کی شیطانی قوتوں کا کمال تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ میں کسی طرح گھبرا کر حصار سے نکل جاؤں' مگر اسے کیا خبر تھی کہ میرے اوپر اس کا یہ وار بھی رائگاں جائے گا۔

"تم ذرا ڈاکٹر صاحب کو دیکھو اور آ کر مجھے بتاؤ کہ وہ اپنے کمرے میں ہیں یا نہیں۔" میں نے اس سے کہا۔

ارشاد علی چلا گیا تو میں نے لباس تبدیل کیا۔ اب میں حسب وعدہ تھانے پہنچنا چاہتا تھا' لیکن اس سے پہلے ڈریسنگ ہو جاتی تو بہتر تھا۔ ویسے مجھے امید نہیں تھی کہ ڈاکٹر امتیاز اپنے کمرے میں ہو گا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ بھی رات کو کوٹھی سے نکل بھاگا ہو گا۔ جب میرے ملازمین کو یہ صورت حال پیش آئی تھی تو پھر ڈاکٹر امتیاز اس سے کیسے بچ جاتا۔

تھانے پہنچ کر کیا گزرتی' میں فی الحال اس سے بے خبر تھا۔ ممکن ہے کہ آج ہی میرا چالان عدالت میں پیش کر دیا جاتا یا پھر آج پولیس تفتیش اور پوچھ گچھ میں گزارتی اور پھر آئندہ روز پورا کیس تیار کر کے عدالت میں پیش کرتی۔ ایسی صورت میں مجھے حوالات ہی میں رہنا پڑتا۔ میں اسی لیے یہ چاہتا تھا کہ اگر ڈاکٹر امتیاز موجود ہو تو کم از کم اس وقت تو ڈریسنگ کرا ہی لوں' آگے اللہ مالک ہے۔

ذرا دیر بعد ارشاد علی نے آکر بتایا کہ ڈاکٹر امتیاز اپنے کمرے میں موجود ہے اور سو رہا ہے تو مجھے حیرت سی ہوئی۔ میں کپڑے بدل چکا تھا اور ایک بڑی رقم بھی اپنی جیب میں رکھ لی تھی کہ ضرورت کے وقت کام آئے۔ میں نے سوچا کہ ڈاکٹر امتیاز کو وہاں بلوانے کی بجائے خود ہی اس کے کمرے میں کیوں نہ چلا جاؤں' ڈریسنگ وہیں کرالوں گا۔ وہ خود مجھے اپنے کمرے میں دیکھے گا تو ذرا جلدی ہاتھ منہ دھو کر تیار ہو جائے گا۔ یہ سوچ کر میں تیزی کے ساتھ اپنے کمرے سے نکلا۔ میں چاہتا تھا کہ جلد از جلد تھانے پہنچ جاؤں۔ تاکہ اے ایس آئی پر کوئی حرف نہ آئے۔

ڈاکٹر امتیاز کے کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی' مگر دروازہ بند تھا۔ میں نے کھڑکی سے اس پر ایک نظر ڈالی۔ وہ بے خبر سو رہا تھا۔ پھر دروازے پر کئی زوردار دستکیں دینے کے بعد اس کی غنودہ سی آواز سنائی دی۔

"دروازہ کھولیں ڈاکٹر۔" میں نے بلند آواز میں کہا۔

چند لمحے کے بعد دروازے کے پیچھے سے قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر دروازہ کھل گیا۔ ڈاکٹر امتیاز کے چہرے سے حیرت اور قدرے ناگواری کا سا اظہار ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

"دراصل مجھے اسی وقت پہنچنا ہے۔" میں نے کمرے میں داخل ہو کر اس کی طرف معذرت خواہانہ انداز میں دیکھا۔ "معاف کیجئے گا۔ آپ کو صبح ہی صبح زحمت دی۔ وجہ یہ کہ کچھ خبر نہیں کب تک واپسی ہو' میں یہ چاہتا تھا کہ آپ اسی وقت ڈریسنگ کر دیتے۔"

"کوئی..... کوئی بات نہیں۔" اس نے بظاہر اخلاق کا مظاہرہ کیا۔ "آپ تشریف رکھیں' ذرا میں منہ دھولوں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھ لیا۔ مجھے اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار نظر آئے۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ڈاکٹر؟" میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔

"بات یہ ہے جناب کہ اگر ٹینشن ہو تو میرے سر میں درد شروع ہو جاتا ہے۔" اس نے بتایا "کل رات کا واقعہ بھی میرے لیے ٹینشن کا سبب ہوا تھا۔ سر درد ہی کی وجہ سے مجھے رات کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ اسی لیے میں نیند کی گولی کھا کر سویا تھا۔"

اس کی بات سن کر میں نے طویل سانس لیا۔ اب یہ بات میرے لیے کوئی معما" نہیں رہی تھی کہ رات کو ڈاکٹر امتیاز کوٹھی سے کیوں نہیں نکلا تھا۔ اس وقت وہ یقیناً گہری نیند سو رہا تھا۔ جب رات کو کوٹھی پر ہنگامہ ہوا تھا۔

پھر کچھ ہی دیر میں ڈاکٹر نے میری گردن کے زخم کی ڈریسنگ کر دی' پھر کہنے لگا۔ "ممکن ہے میرا بیان لینے کے لیے بھی مجھے تھانے بلایا جائے۔"

"ہاں ممکن ہے۔" میں نے کہا۔

"ظاہر ہے کہ پولیس کی ہدایت کے مطابق مجھے اس وقت تک یہیں رہنا پڑے گا جب تک میرا بیان نہ ہو جائے۔"

"تو کیا حرج ہے۔ آپ آرام سے رہیں یہاں میرے ملازم ہر طرح آپ کا خیال رکھیں گے۔" یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ نادرہ کو ہوا کیا تھا۔ بظاہر تو وہ ایسی لڑکی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ پھر یہ کہ اس کی صورت شکل بھی....."

"کون نادرہ؟" میں نے ڈاکٹر کی بات کاٹ کر پوچھا۔

جواب دینے کی بجائے ڈاکٹر امتیاز مجھے حیرت سے دیکھنے لگا' یوں جیسے میں نے واقعی کوئی عجیب بات پوچھ لی ہو۔ بالآخر وہ بولا میں اسی نرس کا ذکر کر رہا ہوں۔ جو کل رات چیختی ہوئی آپ کے کمرے سے بھاگی تھی۔"

"کیا۔"

اب میرے حیران ہونے کی باری تھی۔ "اس کا نام تو مہ پارہ تھا' شاید آپ بھول رہے ہیں ڈاکٹر۔"

"میں تو نہیں بھول رہا' آپ یقیناً بھول رہے ہیں۔"

خدا جانے ڈاکٹر امتیاز مجھے کیوں جھٹلا رہا تھا۔ مگر یہ وقت اس سے بحث کرنے کا نہیں تھا۔ میں مزید کچھ کہے بغیر اس کے کمرے سے نکل آیا۔ اب میرا رخ صدر دروازے کی طرف تھا۔

تھانے کی طرف جاتے ہوئے میں گزشتہ واقعات پر غور کر رہا تھا۔ گزشتہ شب میری دشمن جاں نے یہ اعتراف کر لیا تھا اس کا مطلب یہی تھا کہ نرس کے معاملے میں اسی کا ہاتھ تھا' مگر کس طرح؟ یہ سوال میرے لیے اب تک تشنہ جواب ہی تھا۔ وہ آخر نرس کا جسم کیسے اپنا سکتی تھی۔ کوئی رُوح کسی مادی جسم پر اس طرح قبضہ نہیں کر سکتی۔ بالفرض وہ جسم اسی کا تھا تو پھر برسوں پہلے مٹی ہو جانے والا جسم دوبارہ کس طرح وجود میں آگیا؟ یہ قطعی ناممکن بات تھی۔ یہ معاملہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

انہی خیالوں میں گھرا ہوا میں تھانے پہنچ گیا۔ اے ایس آئی میرا ہی منتظر تھا۔ مجھے دیکھ

کراس کے چہرے پر بہار آگئی اور اس نے خوش ہو کر کہا۔ "تم واقعی وعدے کے پکے نکلے۔۔۔۔
اور ہاں۔۔۔۔" پھر اسے جیسے کوئی بات یاد آگئی۔ "یہ رات کو تمہاری کوٹھی میں کیا چکر چل رہا تھا؟ کیا تمہاری کوٹھی آسیب زدہ ہے؟ شریف اللہ کچھ دیر بعد ہی بدحواس ہو کر وہاں سے بھاگ آیا تھا۔" اس نے کانسٹیبل شریف اللہ کا ذکر کیا جسے میری نگرانی کے لیے ساتھ بھیجا تھا۔

"معلوم نہیں اسے کیا محسوس ہوا' کیا نہیں میں تو عبادت میں مصروف تھا۔" میں بات کو ٹال گیا۔

"صرف اسی پر کیا منحصر' وہ کہہ رہا تھا کہ تمہارے ملازم بھی گھبرائے ہوئے تھے۔" وہ مجھے مشتبہ انداز میں دیکھتا ہوا بولا۔ "انہوں نے بھی تو تمہیں بتایا ہوگا۔"

"ہاں وہ لوگ بھی کہہ رہے تھے۔" میں نے اس طرح سرسری انداز میں کہا جیسے اس بات کی کوئی اہمیت نہ ہو۔ "مجھے بہرحال اس سلسلے میں کچھ نہیں معلوم اور نہ ہی میں نے کوئی ایسی بات محسوس کی۔"

"کوئی بات ہے ضرور۔" اس کا شک دور نہ ہوا۔ "اس سے پہلے تمہارے کمرے میں ایک لڑکی کی لاش پائی گئی تھی جو پراسرار طور پر غائب ہوگئی اور کل رات یہ واقعہ ہوا۔ کوئی نہ کوئی چکر تو ہے خیر۔۔۔۔" یہ کہہ کر اس نے کسی کانسٹیبل کو آواز دی۔

"انہیں حوالات میں بند کر دو۔" اس نے کانسٹیبل کو حکم دیا' پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔ "ایس ایچ او صاحب بس اب آنے والے ہوں گے۔ وہ آجائیں گے تو پھر تمہارا بیان وغیرہ ہوگا۔"

میں نے سر ہلایا اور کانسٹیبل کے ساتھ چل دیا۔ مجھے ضمانت کی فکر نہیں تھی۔ میرا شریک کار نصیرالدین میری ضمانت لے لیتا میں نے اس کی شراکت میں کام شروع کیا تھا۔ میرے کاروبار کی ساری ذمے داری ایک طرح سے اسی کے کاندھوں پر تھی۔ میں تو بس یوں ہی کبھی کبھار دفتر چلا جایا کرتا تھا۔ کاروبار تو بس ایک آڑ کے لیے تھا کہ کسی کو یہ شبہ نہ ہو' اتنی دولت کہاں سے آئی اور یہ کہ میں ایسی پر آسائش زندگی کس طرح گزار رہا ہوں۔ ہمزاد کی موجودگی میں بھلا کس چیز کی مجھے کمی ہوتی۔ وہ میرے سامنے دولت کے انبار لگا سکتا تھا۔ اس اطمینان نے کبھی مجھے دولت کی ذخیرہ اندوزی پر مائل نہیں کیا۔ جب بھی ضرورت ہوتی اور جتنی ہوتی' میں ہمزاد سے کہہ دیتا۔ میرے بینک اکاؤنٹ میں بھی پچاس ساٹھ ہزار روپے سے زیادہ نہیں ہوتے تھے۔ گھر میں بھی میں زیادہ رقم نہیں رکھتا تھا۔ اس کے باوجود میرے گھر کی سیف میں دس پندرہ ہزار روپے پڑے ہی رہتے تھے کہ کیا خبر کب ضرورت پڑ جائے۔ اسی رقم

ں سے اب تک پولیس والوں کو رشوت دی تھی۔

حوالات میں بند ہوئے مجھے نصف گھنٹا گزرا تھا کہ میری طلبی ہوگئی۔ ایک کانسٹیبل نے حوالات کا دروازہ کھولا اور بتایا کہ ایس ایچ او کے سامنے میری پیشی ہے۔

میں جب ایس ایچ او کے کمرے میں پہنچا تو وہاں اے ایس آئی بھی موجود تھا۔ ایس ایچ او نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا' پھر اپنی بھاری آواز میں بولا "تم آخر ہو کیا شے؟"

"میں سمجھا نہیں جناب کہ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔" میں نے جان کر انجان بنتے ہوئے کہا۔

"بیٹھو۔" اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"شکریہ۔" میں یہ کہہ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"سمجھتے تو ہو تم سب کچھ۔" وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔ بس ہمیں چکر دے رہے ہو۔ آخر معاملہ کیا ہے؟ مجھے معلوم ہوا ہے کہ کل تم نے ایک لڑکی پر مجرمانہ حملہ کیا تھا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ لڑکی بھی کوئی حور پری نہیں تھی۔ تمہاری ملازمائیں اس سے کہیں زیادہ خوبصورت ہیں۔"

وہ مجھے خود صفائی کا موقع دے رہا تھا اس لیے میں نے فوراً کہا۔ "یہ الزام ہے مجھ پہ جناب کہ میں نے اس پر مجرمانہ حملہ کیا تھا۔ اس نے خود ہی اپنے کپڑے پھاڑ لیے تھے اور پھر یہاں۔۔۔۔"

"تو کیا وہ لڑکی مینٹل کیس تھی۔ آخر کوئی تو ایسی وجہ ہوگی جو اس نے ایسا کیا۔"

"دو ہی باتیں ہو سکتی ہیں جناب۔" میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔ "یا تو وہ واقعی کسی دماغی عارضے میں مبتلا ہے یا پھر وہ کسی وجہ سے مجھے بدنام کرنا چاہتی ہوگی۔"

"کیوں کیا اس سے تمہاری کوئی پرانی دشمنی تھی۔" اس کی آواز میں طنز تھا۔ "اس کا بیان پڑھا ہے میں نے وہ کل ہی تمہاری کوٹھی میں آئی تھی۔ کیا اس سے پہلے بھی تمہاری اس سے شناسائی تھی؟"

لفظ شناسائی پر اس نے زور دیا۔

"جی نہیں جناب!" میں نے جواب دیا۔ "کل سے پہلے میں نے اسے نہیں دیکھا تھا۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم اس کے لیے اور وہ تمہارے لیے کل سے پہلے بالکل اجنبی تھے۔ پھر پرانی دشمنی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اصل بات بتاؤ تھا کیا چکر؟" وہ پولیس

والوں کے مخصوص لہجے میں مجھ سے کہنے لگا۔ "دیکھو اگر تم نے سچ بات اگل دی تو یہ تمہارے ہی حق میں بہتر ہوگا۔"

"دراصل اس نے مجھے اپنی دکھ بھری کہانی سنائی تھی کہ وہ بھری دنیا میں تنہا ہے۔ میں نے اخلاقاً" بطور ہمدردی اسے دلاسا دیا تھا۔ بس پھر وہ پھیلتی چلی گئی۔ گلے پڑ گئی۔"

"اور جب تم نے اس کی بات نہیں مانی تو اس نے یہ ڈراما کھیلا۔ یہی کہنا چاہتے ہو، نا تم۔"

"جی..... جی ہاں جناب۔" میں بولا۔

"تم ذرا باہر جاؤ۔" ایس ایچ او نے اے ایس آئی سے کہا۔ نہ معلوم وہ مجھ سے تنہائی میں کیا بات کرنا چاہتا تھا۔ اے ایس آئی باہر چلا گیا تو وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "سنو جو کچھ تم نے کہا ہے، اس میں کوئی حقیقت ہو یا نہ ہو، لیکن کیس کو عدالت کے سامنے اس انداز میں ضرور پیش کیا جاسکتا ہے، مگر میرے پاس بھی تو اس کا کوئی جواز ہونا چاہیے۔ سمجھ رہے ہو، نا تم۔"

میں خوب سمجھ رہا تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ اسی لیے میں نے کہا۔ "میں آپ کے حکم سے باہر نہیں ہوں، جو حکم دیں گے اسے پورا کرنے کی کوشش کروں گا۔"

"میرے حکم کو چھوڑو، اپنی بات کرو۔ یہ معاملہ اور ہے۔ اس میں مدعی موجود ہے اور ایف آئی آر بھی کٹ چکی ہے، لیکن تمہاری خاطر میں کوئی نہ کوئی راستہ نکال ہی لوں گا۔ میں اس لڑکی کو تھانے بلوا کر بات کرتا ہوں کہ وہ کچھ لے دے کر معاملہ یہیں ختم کردے۔ دوسرا بیان دے دے میرا خیال ہے پندرہ بیس ہزار میں بات بن جائے گی، مان جائے گی وہ۔"

"یہ تو بہت ہیں جناب۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"بہرحال تمہاری بے عزّتی سے کم ہیں۔" وہ بولا۔ "اور یہ تو محض میرا اندازہ ہے۔ ممکن ہے وہ اس پر راضی ہی نہ ہو یا پھر اس سے بھی زیادہ کا مطالبہ کرے۔"

"ٹھیک ہے، آپ بلوالیں اسے۔" مجھے کہنا ہی پڑا کیوں کہ اس کے سوا کوئی اور چارۂ کار بھی نہیں تھا۔ میں ایس ایچ او کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔

پھر اس نے اے ایس آئی کو طلب کرکے حکم دیا کہ کسی کانسٹیبل کو بھیج کر وہ لڑکی کو بلوا لے۔ اس کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوا "اب تم جاؤ، اگر معاملہ طے ہوگیا تو میں تمہیں بلوالوں گا اور ہاں یہ معاملہ نمٹ گیا تو تمہیں میرے عملے کو بھی خوش کرنا پڑے گا۔"

میں کہتا بھی کیا، مجبوراً اقرار میں گردن ہلانا پڑی۔ اسی وقت مجھے خیال آیا کہ یہ معاملہ لمبا کھنچ رہا ہے اور اس میں دس پندرہ ہزار سے کم میں بات نہیں بنے گی۔ سات ہزار پہلے ہی

خرچ ہوچکے تھے۔ آج تک میں نے کبھی اپنی سیف میں موجود رقم گنی نہیں تھی کہ کتنی ہے، کیا خبر اتنے روپے ہوں گے بھی یا نہیں یہی سوچ کر میں نے ایس ایچ او سے کہا کسی کانسٹیبل کو میری کوٹھی پر بھیج کر ذرا میرے ملازم ارشاد علی کو بلوادیں۔"

"کیوں کیا ناشتا کرکے نہیں آئے؟ میں تمہارے لیے منگوادیتا ہوں۔ ناشتا۔"

"نہیں، یہ بات نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "دراصل احتیاطاً" میں کچھ رقم بینک سے نکلوانا چاہتا ہوں۔"

"اچھا اچھا۔" وہ ہنسا۔ "ٹھیک ہے۔ تم کافی سمجھ دار آدمی معلوم ہوتے ہو۔ اور ہاں کچھ رقم سے کام نہیں چلے گا۔ یہ بات اپنے ذہن میں رکھنا۔"

میرا جی چاہا کہ اس لالچی شخص کو کھری کھری سنادوں، مگر اپنا غصّہ پی گیا۔ اس طرح بات بگڑ جاتی میں نے سرہلانے پر ہی اکتفا کیا۔

کچھ ہی دیر بعد مجھے پھر حوالات میں بند کردیا گیا۔ میں سوچنے لگا کہ اگر اس معاملے میں میری دشمن جاں کا ہاتھ ہے تو پھر وہ نرس کسی صورت کوئی اور بیان دینے پر آمادہ نہیں ہوگی، لیکن اب مجھے اس کی زیادہ پروا نہیں تھی کیوں کہ ایس ایچ او میرے ساتھ تھا۔ وہ میرے بیان کی روشنی میں کیس کو دوسرا رخ بھی دے سکتا تھا۔ اس طرح سارا الزام اس نرس پر آجاتا۔ وہ خود اس کیس میں پھنس جاتی کہ اس نے ایک شریف اور باعزّت شہری کی عزّت و آبرو سے کھیلنا چاہا اور جب وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے تو مجھے بدنام کرنے کے لیے الٹا مجھ پر مجرمانہ حملے کا الزام لگادیا۔ اس سلسلے میں یقیناً گواہوں کی ضرورت بھی پیش آتی۔ پولیس بہ ایں وجوہ میرے ساتھ تعاون کررہی تھی اس لیے جھوٹے گواہ فراہم کرنا کوئی ایسا مسئلہ نہیں تھا۔ میرے ملازم میرے ایما پر عدالت میں وہی بیان دیتے جو میں چاہتا۔ ایس ایچ او کے ذہن میں بھی یقیناً یہ بات ہوگی مجھے یہ اندازہ تھا کہ ایس ایچ او اس معاملے میں دہری کمائی کے چکر میں تھا۔ ایک طرف تو وہ اس نرس کو کم سے کم رقم لینے پر راضی کرتا، اسے ڈراتا، دھونساتا اور دوسری جانب مجھ سے لڑکی کے نام پر زیادہ رقم اینٹھنے کی کوشش کرتا۔ اس کے علاوہ معاملہ ختم کرانے کی "خدمت" مجھ سے الگ وصول کرتا۔ بعض معاملات ایسے ہوتے ہیں کہ آدمی سب کچھ جان بوجھ کر خود بے وقوف بن جاتا ہے اور یہ معاملہ بھی ایسا ہی تھا۔

میں انہی خیالات میں سرگرداں تھا کہ معاً" میری نگاہ حوالات کی سلاخوں کے باہر ارشاد علی پر پڑی۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا حوالات کی طرف آرہا تھا اور تنہا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ میرا شریک کار نصیرالدّین بھی کسی فٹ بال کی طرح لڑھکتا ہوا چلا آرہا تھا۔ اس

کے جسم پر کچھ زیادہ ہی چربی چڑھی ہوئی تھی ایک تو اس کا قد چھوٹا تھا' اس پر ستم یہ کہ جسم پر گوشت کی بے تحاشا تہیں چڑھی ہوئی تھیں۔ اس کی وجہ سے اس کی گردن گم ہو کر رہ گئی تھی' دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے شانوں پر سر رکھا ہو۔ پھر یہ کہ وہ ظالم چست کپڑے پہنتا تھا۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی گول اور اندر کو دھنسی ہوئی تھیں اور سر پر برائے نام بال تھے۔ اسے تیز چلتے دیکھ کر ہمیشہ میری ہنسی چھوٹ جاتی تھی۔ اس وقت ہر چند کہ میں پریشان کن حالات سے دوچار تھا' مگر اس کے باوجود میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آہی گئی۔ خدا معلوم اسے کیسے خبر ہو گئی تھی کہ میں تھانے میں ہوں۔

بالآخر ارشاد علی اور نصیر الدّین دونوں حوالات کے دروازے پر پہنچ گئے۔ تیز تیز چلنے کی وجہ سے نصیر الدّین کا سانس چڑھ گیا تھا اور وہ مجھے ہاتھ کے اشارے سے سلام کر کے ہانپنے لگا۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ارشاد علی کو مخاطب کیا جس کے چہرے پر فکر مندی اور حیرت کے آثار تھے۔ "میری الماری کی چابی تکیے کے نیچے رکھی ہے۔ الماری کھول کر درمیانی خانے میں سے تم میری چیک بک لے آؤ۔ کچھ دیر بعد بینک کھل جائیں گے۔ میں تمہیں چیک دوں گا' تم بینک سے رقم نکلوا کر سیدھے یہاں آجانا اور سنو کسی کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ میں نے بینک سے کتنی رقم نکلوائی ہے۔" "سمجھ گئے؟"

"جی صاحب۔" اس نے سعادت مندی سے سر ہلایا۔

"اچھا تو پھر جاؤ۔" میں نے اس سے کہا۔

"مگر..... مگر صاحب' آپ کو..... ان لوگوں نے حوالات میں کیوں..... کیوں بند کر دیا ہے؟" وہ آخر مجھ سے پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"تم سے جو کہا ہے' وہ کرو اور فضول باتوں میں اپنا دماغ نہ لگاؤ۔" میں نے سختی سے کہا۔ "تمہارے سمجھنے کی باتیں نہیں ہیں' سمجھے۔"

وہ غریب منہ لٹکا کر الٹے قدموں واپس ہو گیا۔ میں اسے بتاتا بھی کیا۔ بہرحال ایک وفادار ملازم ہونے کی حیثیت سے اس کی فکر مندی بجا تھی۔

نصیر الدّین اب اپنے پھولے ہوئے سانس پر قابو پا چکا تھا۔ ارشاد علی چلا گیا تو وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "کیا ہوا شیخ صاحب! یہ کیا معاملہ ہے؟"

"پہلے تم یہ بتاؤ کہ یہاں تک کیسے چلے آئے؟" میں نے پوچھا۔ "تمہیں کیسے خبر ہوئی کہ....."

"میں کل ہسپتال گیا تھا' رات کو" وہ کہنے لگا۔ "معلوم ہوا کہ آپ ڈسچارج ہو کر گھر

جا چکے ہیں۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ دراصل مجھے کچھ کاغذات پر آپ سے دستخط کرانا تھے۔ اس وقت مجھے ایک دعوت میں جدا نا تھا اس لیے سوچا صبح کوٹھی پر آپ سے مل لوں گا۔ یہاں آیا تو ارشاد علی نے مجھے بتایا کہ آپ تھانے گئے ہیں پھر میرے ہی سامنے تھانے سے ایک سپاہی آیا اور اس نے کہا کہ ارشاد علی کو بلوا رہے ہیں' پھر میں بھی ارشاد علی کے ساتھ یہاں چلا آیا۔ راستے میں ارشاد علی سے میں نے پوچھا کہ آپ کس لیے تھانے گئے ہیں؟ مگر اس نے کچھ بتایا ہی نہیں' آپ کم سے کم مجھے تو اطلاع کرا دیتے۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات تھی۔" آخر میں نصیر الدّین کا لہجہ شکایتی ہو گیا۔

"کوئی ایسی فکر کی بات نہیں تھی کہ میں تمہیں بلاتا۔ بہرحال اب تم آگئے ہو تو ممکن ہے کہ تمہاری ضرورت پڑ جائے۔" میں نے کہا۔ "تمہیں میری ضمانت لینا پڑے گی۔"

"مگر کس سلسلے میں؟ کچھ بتائیں تو سہی۔" وہ بولا۔

"بس یوں سمجھ لو کہ برا وقت کہہ کر نہیں آتا۔" میں نے طویل سانس لیا اور پھر مختصراً اسے ساری بات بتا دی۔

"حیرت ہے شیخ صاحب۔" وہ واقعی حیرت سے کہنے لگا۔ "آپ کے لیے کمی کیا ہے۔" وہ میری حسن پرست فطرت سے کسی حد تک واقف تھا۔ "آپ نے اسے اپنے کمرے سے نکلنے ہی کیسے دیا۔ آپ تو اس میدان کے کھلاڑی ہیں۔"

"کھلاڑی ہی کبھی کبھی اناڑی بن جاتے ہیں۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"ظاہر ہے لڑکی بہت ہی خوبصورت ہو گی جبھی تو....."

"خیر چھوڑو اس کا ذکر۔" میں نے اس کی بات کاٹی۔ "ایس ایچ او نے اسے بلوایا ہے' تم خود دیکھ لینا۔" یہ کہتے ہوئے میرے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ میں مہ پارہ کو تو کیا اس کی ہم شکل کو بھی حاصل نہیں کر سکا تھا۔ میں نے اس کی طرف سے اپنا دھیان ہٹانے کے لیے نصیر الدین سے کاروبار کا ذکر چھیڑ دیا۔ "کہو کام کیسا چل رہا ہے؟"

"ٹھیک ہے' لیکن....." وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"لیکن کیا؟" میں نے دریافت کیا۔

"یہ موقع تو نہیں تھا اس بات کا شیخ صاحب' مگر آپ..... آپ نے ذکر چھیڑ ہی دیا ہے تو پھر..... دراصل میں اسی لیے آپ سے ملنا چاہتا تھا۔" وہ یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"تم کھل کر بات کرو نصیر الدّین کیا بات ہے؟"

"ایک سودے میں خاصا گھاٹا ہو گیا ہے اور اس وقت ساکھ برقرار رکھنے کے لیے رقم

کی بڑی ضرورت ہے۔ فرم کوئی تین لاکھ سے اوپر کے گھاٹے میں آگئی ہے۔ میں نے کل حساب کیا تھا۔ آپ کی طرف فرم کے تقریباً پونے دو لاکھ روپے واجب الادا ہیں۔ اگر وہی مل جائیں تو فی الحال کام چل سکتا ہے۔"

"میری طرف واجب ہیں؟ پونے دو لاکھ؟..... کہہ کیا رہے ہو تم؟" میں چکرا گیا۔

"میرے پاس ساری رسیدیں موجود ہیں جن پر آپ کے دستخط بھی ہیں۔ آپ وقتاً فوقتاً" جو رقم لیتے رہے ہیں اس کا پورا اندراج ہے میرے پاس! اس کے لہجے میں عیّاری تھی اور اب وہ مجھ سے نظریں بھی چرا رہا تھا۔

"کاروبار کے سلسلے میں اکثر وہ مجھ سے مختلف کاغذات پر دستخط کراتا رہتا تھا۔ میرے نزدیک یہ سب خانہ پری تھی۔ مجھے کاروبار سے دلچسپی ہوتی تو کبھی ان کاغذات کو پڑھنے کی کوشش بھی کرتا۔ مجھے کبھی گمان بھی نہیں ہوا کہ نصیرالدّین خاموشی سے کیا کھیل کھیل رہا ہے۔ مجھے اس سے رقم لینے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ میں نے اس سے آج تک ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں لی تھی بلکہ کاروبار میں میری ہی ساری رقم لگی ہوئی تھی۔ بنیادی سرمایہ پانچ لاکھ روپے تھا جو میں نے ہی فراہم کیا تھا۔ نصیرالدّین ورکنگ پارٹنر تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ میں نے اس سے کبھی رقم کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔ اب وہ مجھ پر پونے دو لاکھ روپے واجب بتا رہا تھا تو ظاہر ہے کہ یہ سراسر فراڈ ہی تھا۔ بالآخر میں نے اپنے غصّے کو ضبط کرتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ "دیکھو نصیرالدّین مجھے نہیں معلوم کہ تم مجھ سے کن کن کاغذات پر دستخط کراتے رہے ہو۔ مجھے تم پر پورا اعتماد تھا اس لیے میں نے کبھی تم سے کچھ نہیں پوچھا' لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ تم میری آنکھوں میں دھول ہی جھونکنے لگو۔ تم نے اس وقت میرے اعتماد کو زبردست ٹھیس پہنچائی ہے۔"

"اس میں ٹھیس پہنچنے کی تو کوئی بات نہیں شیخ صاحب۔" وہ مجھ سے نظریں چراتے ہوئے بولا۔ "حساب تو حساب کی جگہ ہے۔ آپ نے جو رقم لی ہے' یعنی جو آپ کی طرف واجب الادا ہے وہ تو....."

"بکو مت۔" مجھے غصّہ آگیا۔ آخر میں برداشت کرتا بھی تو کب تک۔ "میں تمہیں پھوٹی کوڑی دینے کو تیار نہیں۔"

"تو پھر مجبوراً مجھے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑے گا۔" اس نے ڈھٹائی سے کہا۔ "پونے دو لاکھ کی رقم ایسی تو نہیں کہ یوں ہی چھوڑ دی جائے۔"

"اور میرے پانچ لاکھ! وہ کیا ہوئے؟ ان کا حساب کون کرے گا جو میں نے کاروبار میں

لگائے تھے۔"

"وہ تو کبھی کے واپس لے چکے شیخ صاحب۔"

"کیا؟" میں تقریباً چیخ اٹھا۔

"جی ہاں! اور انہی پانچ لاکھ کی واپسی کے بعد اصولی طور پر ہماری شراکت کا معاہدہ بھی ختم ہوگیا ہے۔ اب صرف میں فرم کا مالک ہوں۔ فرم سے دست برداری کے کاغذات پر بھی آپ کے دستخط موجود ہیں اور ان کاغذات پر بھی جن کی رو سے آپ پر میرے پونے دو لاکھ واجب الادا ہیں۔"

"بہت خوب نصیرالدّین۔" میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "تم نے یقیناً اپنی دانست میں یہ بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے' لیکن شاید ابھی تم مجھے جانتے نہیں۔ میرا نام شیخ کرامت ہے وہ شیخ کرامت جس نے اچھے اچھوں کو زمین چاٹنے پر مجبور کردیا ہے۔"

ابھی میری بات ختم ہی ہوئی تھی کہ ارشاد علی' چیک بک لے کر آگیا۔ میں نے اس سے چیک بک لے لی اور پھر بیس ہزار روپے کا چیک کاٹ کر اسے دیتے ہوئے بولا۔ "رقم احتیاط سے سنبھال کر لانا۔ بینک جاتے ہوئے میرے کمرے سے بریف کیس لے لینا۔" میں نے موقع محل کی نزاکت کے پیش نظر اسے سمجھایا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں رقم کی اتنی پرواہ نہ کرتا' مگر اب عمل پورا کرنے سے پہلے مزید رقم کا حصول میرے لیے ناممکن تھا۔ نصیرالدّین سے اب اس سلسلے میں کچھ کہنا ہی فضول تھا۔ اس کی نیت میں تو پہلے ہی فتور آچکا تھا۔

ارشاد علی چیک لے کر چلا گیا۔ میں اسے پہلے ہی یہ ہدایت دے چکا تھا کہ وہ رقم لے کر تھانے ہی میں آئے۔ مجھے توقع تھی کہ وہ میری ہدایت پر پورا عمل کرے گا۔

"شیخ صاحب۔" معاً نصرالدّین نے مجھے مخاطب کیا۔

"ہوں۔" میں نے تیوریوں پر بل ڈال کر اس کی طرف دیکھا۔

"بہتر یہ ہے کہ بات عدالت تک نہ جائے۔ میرے آپ کے دیرینہ تعلقات ہیں' خواہ مخواہ جگ ہنسائی ہوگی۔ بہتر یہی ہے کہ آپ رقم کی ادائیگی کردیں۔"

میں اسے غصّے سے گھورنے لگا' پھر بولا۔ "تم شاید میرے ضبط کا امتحان لے رہے ہو۔"

"ابھی بھی میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے۔"

"وہ بھی بک دو۔"

"اگر آپ کے پاس ادائیگی کے لیے نقد رقم نہیں ہے تو جس کوٹھی میں آپ رہتے ہیں' میرے نام کردیں۔ مگر یہ کام فوری طور پر ہونا چاہیے کیوں کہ مجھے رقم کی شدید ضرورت

ہے۔ میں پونے دولاکھ کے عوض کوٹھی لینے پر تیار ہوں۔ حالانکہ ضروری نہیں کہ مجھے کوٹھی بیچ کراتنی رقم مل ہی جائے، مگر محض آپ سے تعلقات برقرار رکھنے کی خاطر اگر کچھ گھاٹا بھی ہو جائے تو میں اسے برداشت کرلوں گا۔ اس سلسلے میں زیادہ سے زیادہ میں آپ کو ایک ہفتے کی مہلت دے سکتا ہوں۔ وہ بھی یہ سوچ کر کہ آپ اس دوران میں اپنی سکونت کا کہیں بندوبست کرلیں۔"

"نصیرالدّین۔" میں پھر چیخ اٹھا۔ "بہت ہوگیا۔ بند کرو اپنی بکواس! دفع ہو جاؤ یہاں سے! میں تمہاری صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم اتنے گھٹیا اور کمینے آدمی ہوگے۔"

"کون گھٹیا ہے شیخ صاحب، یہ تو صاف معلوم ہو رہا ہے۔ آپ سلاخوں کے پیچھے ہیں اور میں سلاخوں کے باہر۔" اس نے اوچھا وار کیا، پھر میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی مزید کہا۔ "میں جو بات ایک بار کہہ دیتا ہوں، اس سے پیچھے نہیں ہٹتا۔ میں نے آپ کو ایک ہفتے کی مہلت دی ہے اس عرصے میں آپ خوب سوچ سمجھ لیں۔ میں ایک ہفتے کے بعد آپ سے ملوں گا، بشرطیکہ آپ سلاخوں کے باہر ہوئے۔ دوسری صورت میں ظاہر ہے مجھے آپ کے باہر آنے کا انتظار کرنا پڑے گا۔" یہ کہتے ہی وہ مڑا اور پھر گویا لڑکھتا ہوا میری نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

میں سوچنے لگا جب آدمی پر بُرا وقت آتا ہے تو ہر طرف ہی سے مصیبتیں اس پر ٹوٹ پڑتی ہیں۔ نصیرالدین کو بھی اسی وقت مجھ سے نظریں پھیرنا تھیں۔ میں غصّے کے سبب اندر ہی اندر کھولتا رہا۔ نصیرالدّین کو شاید اندازہ نہیں تھا کہ اس نے کس شخص کو چھیڑ دیا ہے۔ وقت کی بات تھی ورنہ میں اسے ایک منٹ میں بھنگی بنا دیتا اور اپنے سامنے منت سماجت پر مجبور کر دیتا۔

کچھ وقت اور گزرا ہوگا کہ ایک سپاہی نے آکر بتایا کہ ایس ایچ او مجھے بلوا رہا ہے۔ اس نے حوالات کا قفل کھول کر مجھے باہر نکالا اور پھر میں اس کے ہمراہ ایس ایچ او کے کمرے میں پہنچ گیا۔ مجھے توقع تھی کہ وہاں وہ نرس بھی ہوگی، مگر کمرے میں صرف ایس ایچ او ہی تھا۔ اس کے اشارے پر میں نے کرسی سنبھال لی۔

"میں نے نادرہ کو راضی کرلیا ہے۔" ایس ایچ او نے میرے بیٹھتے ہی کہا۔

"نادرہ۔" میں چونک اٹھا۔ میں نے دوسری بار یہ نام سنا تھا، پہلی بار آج ہی ڈاکٹر امتیاز نے اسے نادرہ کہا تھا۔

"ہاں وہ نرس جس نے تمہارے خلاف رپورٹ درج کرائی تھی میرے بھائی۔"

"مگر اس کا نام تو مہ پارہ ہے۔" میں نے کہا۔

"رپورٹ میں اس نے اپنا یہی نام لکھوایا ہے، تمہیں اگر اس نے مہ پارہ بتایا ہو تو مجھے نہیں معلوم! بہرحال نام کا جھگڑا چھوڑو۔ اصل بات سنو۔ میرے سمجھانے بجھانے پر وہ دس ہزار روپے پر آمادہ ہوگئی ہے بولو اب تم کیا کہتے ہو؟"

"مجھے کیا کہنا ہے جناب۔" میں نے بے دلی سے کہا۔ ویسے مجھے حیرت ضرور تھی کہ وہ لڑکی اپنا بیان بدلنے پر کیسے راضی ہوگئی۔

"تو تم رقم مجھے دو اور باقی معاملہ مجھ پر چھوڑ دو۔"

"میں نے اپنے ملازم کو بینک بھیجا ہے، وہ آتا ہی ہوگا۔"

"اور ہاں۔" وہ مسکرایا۔ "دس ہزار تو وہ لے جائے گی اور ہم...." ہمارا بھی تو کچھ حق ہے نا۔

"کیوں نہیں جناب۔" میں نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ "آپ جو کہیں۔" میں نے اس کی طرف دیکھا۔

"نہیں بھئی یہ خوشی کا سودا ہے۔ تم جو مٹھی بند کر کے دوگے لے لوں گا میں! وہ بھی نچلے عملے کے لیے، مجھے اس میں سے کچھ بھی نہیں چاہیے۔"

مجھے نہیں معلوم کہ اس نے لڑکی سے کیا طے کیا تھا، مگر اتنا اندازہ ضرور تھا کہ وہ درمیان میں "روڑا" ضرور لگائے گا۔ اس نے میرے اندازے کے مطابق لڑکی سے دو تین ہزار روپے دلوانے کی بات کی ہوگی اور بقیہ رقم خود ہضم کر رہا ہوگا لیکن مجھے اس سے کوئی سروکار نہ تھا میں تو یہ چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح یہ جھنجٹ ختم ہو جائے۔

پھر ایس ایچ او نے مجھے وہیں بٹھالیا اور ایک کانسٹیبل کو بلا کر کہا کہ دیکھو شیخ صاحب کا ملازم آئے گا، اسے میرے کمرے میں بھیج دینا۔

کانسٹیبل اقرار میں سر ہلا کر "یس سر" کہتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

"وہ لڑکی نظر نہیں آئی مجھے۔" میں نے کہا۔

"اسے میں نے دوسرے کمرے میں بٹھا دیا ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "دراصل وہ یہ کہہ رہی تھی کہ تمہارا سامنا نہیں کرنا چاہتی۔ ایسے معاملوں میں ایسا ہوتا ہے اس لیے میں نے بھی زور نہیں دیا۔" یہ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں عیاری تھی۔

میں خوب سمجھ رہا تھا کہ وہ میرے سامنے لڑکی کو رقم دینا نہیں چاہتا تھا تاکہ اس کی "دلالی" کا بھانڈا نہ پھوٹ جائے۔ میں نے پھر کچھ نہیں کہا۔

"کچھ ہی دیر بعد ایک کانسٹیبل ' ارشاد علی کو لے کر وہاں آگیا۔ میں نے اس سے بریف کیس لے لیا۔ بریف کیس میں پانچ پانچ ہزار کی چار گڈیاں تھیں میں نے تین گڈیاں نکال کر ایس ایچ او کی طرف بڑھادیں تاکہ اسے مزید کچھ کہنے کا موقع نہ ملے۔ پندرہ ہزار روپے اسے تھماکر میں نے بریف کیس بند کیا اور ارشاد علی کو تھمادیا۔

ایس ایچ او کے چہرے پر نوٹوں کی گڈیاں تھامتے ہی بہار آگئی۔ وہ انہیں اپنی میز کی دراز میں ڈالتا ہوا بولا۔ "اب تم جاسکتے ہو' بے دھڑک۔" اس کی آواز سے خوشی چھلکی پڑ رہی تھی۔

میں فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا اور دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔

آج مجھے فجر کے بعد سونے کا موقع نہیں ملا تھا اور اس وقت صبح کے ساڑھے نو بج رہے تھے اس لیے کوٹھی پہنچتے ہی میں نے اپنے کمرے کا رخ کیا۔ راستے میں ڈاکٹر امتیاز سے مڈبھیڑ ہوگئی میں نے اس سے کہا "ڈاکٹر اب اگر آپ جانا چاہیں تو جاسکتے ہیں' ہاں شام کو ضرور آجایئے گا ڈریسنگ کرنے۔"

"اور وہ جو پولیس کا چکر تھا اور......"

"وہ ختم ہوگیا۔" میں نے مزید وضاحت ضروری نہیں سمجھی اور آگے بڑھ گیا۔

اپنے کمرے میں آکر ابھی میں لباس تبدیل کرکے بستر پر سونے کے لیے لیٹا ہی تھا کہ ارشاد علی اندر آگیا۔

"میں نے تم سے کہا تھا کہ اب میں سونا چاہتا ہوں۔" میں ناگواری سے بولا۔

"میں نے ان سے کہا تھا جناب' مگر وہ مان ہی نہیں رہیں۔" اس کے لہجے میں بے بسی سی تھی۔

"کون؟" میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"نرس نادرہ۔" اس نے جواب دیا۔

تیسری بار یہ نام سن کر مجھ پر جھنجلاہٹ طاری ہوگئی۔ "کون نادرہ...... یا تو تم پاگل ہوگئے ہو یا میرا دماغ چل گیا ہے' اس کا نام مہ پارہ ہے مہ پارہ سمجھے۔"

"جی صاحب۔"

پھر معاً مجھے خیال آیا کہ اب وہ مجھ سے ملنے کیوں آئی ہے؟ اب آخر کیا چاہتی ہے وہ؟ میں نے ارشاد علی سے کہا۔

"اچھا بھیجو اسے۔"

ارشاد علی سر جھکا کر چلا گیا اور پھر چند لمحے بعد ہی ایک بدشکل لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کا رنگ سیاہ تھا اور چہرے پر چیچک کے نمایاں داغ تھے۔ وہ میرے لیے قطعی اجنبی تھی۔ پھر اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا۔ وہ بول اٹھی۔ "میں آپ سے معافی مانگنے آئی ہوں۔"

"کس بات کی معافی؟" میں حیرت سے بولا۔ "اور...... اور تم ہو کون؟"

"ہاں میں اسی قابل ہوں کہ آپ مجھے پہچاننے سے انکار کردیں۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ میں نے اس سے اب تک بیٹھنے کو بھی نہیں کہا تھا۔ اس نے مزید کہا۔ "میں...... میں خود بھی حیران ہوں جناب کہ...... کہ مجھے کل کیا ہوگیا تھا۔ جو...... جو میں نے آپ...... آپ ایسے شخص پر اتنا بڑا الزام لگادیا کہ...... کہ آپ نے مجھ پر مجرمانہ حملہ کیا ہے۔ میں...... میں اسی کی معافی مانگنے آئی ہوں۔ خدا کے لیے مجھے معاف...... معاف کریئے ورنہ میرا ضمیر مجھے...... مجھے چین نہیں لینے دے گا۔" اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

میں حیرت سے اس لڑکی کو دیکھے جارہا تھا اور میرے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ اے خدا یہ کیا طلسم ہے؟ کہیں میں پاگل تو نہیں ہوگیا؟ آخر یہ لڑکی کون ہے اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کیوں کررہی ہے کہ گزشتہ شب جو اندوہناک واقعہ پیش آیا تھا' اسی سے متعلق تھا؟ اس کی آواز بھی بھدی تھی۔

"کیا تمہارا نام مہ پارہ ہے؟" میں نے یقین اور بے یقینی کی ملی جلی کیفیت میں پوچھا۔

"جی نہیں' میرا نام نادرہ ہے۔" اس نے اپنے رخساروں سے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔

OO.....O.....OO

میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا کہ شاید جھوٹ اور سچ کا اندازہ لگا سکوں ورنہ قابل دید کچھ بھی نہ تھا۔ لڑکیاں بڑی خوب صورتی سی جھوٹ بولتی ہیں اور ان کے آنسو بھی مگر وہ ایسی معلوم نہیں ہو رہی تھی پھر وہ کیا معما ہے؟ میں سوچنے لگا۔ آخر اسے کیا پڑی جو اجنبی ہونے کے باوجود مجھ سے ملتی' معافی مانگتی اور ایک ایسی لڑکی بننا پسند کرتی جس سے ایک شرم ناک واقعہ وابستہ تھا؟ کیا آنکھوں دیکھا اور کانوں سنا بھی جھوٹ ہو سکتا ہے؟ اس سوال نے رفتہ رفتہ میرے ذہن کو جیسے جھنجوڑنا شروع کر دیا۔

مہ پارہ کے سلسلے میں آنکھوں دیکھا کئی بار غلط ثابت ہو چکا تھا۔ گزشتہ شب وہ ایک مقتول لڑکی بن گئی تھی اور میں ہی نہیں میرے نوکروں اور پولیس والوں نے بھی اس کی لاش دیکھی تھی۔ اس نے مجھے فریب نظر میں مبتلا کر دیا تھا اور میرے علاوہ وہ دوسروں کو بھی۔ وہ ایسا کرنے کی اہل تھی کہ حقیقتاً جو نہ ہو' آدمی کو نظر آنے لگے۔ جب وہ یہ قوت رکھتی تھی تو اس کے لیے یہ کیا مشکل تھا کہ ایک بدصورت لڑکی مجھے حسین اور اس کی ہم شکل نظر آنے لگے۔ عمل کے دوران ہی میں یہ واقعہ بھی پیش آیا تھا کہ میں نے زلزلے کی گڑگڑاہٹ سنی تھی۔ یہ فریب سماعت تھا۔ حقیقت میں زلزلہ نہیں آیا تھا۔ جس کا ثبوت ارشاد علی کا بیان تھا۔ اس نرس کی آواز مجھے مہ پارہ جیسی معلوم ہوئی' یہ بھی سماعت کا فریب ہو سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کا نام مجھے نادرہ کی بجائے مہ پارہ سنائی دیا اسے بھی اسی خانے میں رکھا جا سکتا تھا۔ اس کے لیے یہ بھی ممکن تھا کہ میں تو مہ پارہ کہوں اور دوسرے فریب سماعت میں مبتلا ہو کر نادرہ سنیں۔ یقیناً اس نے بڑی ہوشیاری اور چالاکی سے یہ کھیل کھیلا تھا' ایسی ہوشیاری کہ میں بھی دھوکا کھا گیا تھا۔ نرس نادرہ اس وقت مہ پارہ کی پُراسرار قوتوں ہی کے زیر اثر رہی ہو گی۔ جب اس نے اپنے کپڑے پھاڑ لیے تھے اور میرے خلاف تھانے میں جا کر رپورٹ درج کرائی تھی۔ پھر ان خطرناک حالات میں بھی میں نے ایک راہ نکال لی تو مہ پارہ نے نادرہ کو اپنے سحر سے آزاد

کر دیا تھا۔ مجھے اپنا قیاسات صدفی صد درست معلوم ہونے لگے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اب وہ لڑکی یہاں نظر نہ آتی۔

اس طرح مہ پارہ نے مجھ پر دہرا وار کیا تھا۔ اول یہ کہ میں جذ[illegible] بہک جاؤں اور اس طرح عمل کی ایک شرط پوری کرنے میں ناکام ہو جاؤں۔ بروقت مجھے خطرے کا احساس ہو گیا اور میں سنبھل گیا تو اس نے دوسرا راستہ اختیار کر لیا۔ اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ عمل کی شرط پوری نہ ہو سکے' یعنی میں مقررہ وقت پر اور مقررہ جگہ پر عمل جاری نہ رکھ سکوں۔ ظاہر ہے کہ میں حوالات میں بند ہوتا تو جگہ کی پابندی نہ کر پاتا۔ یہ بھی مہ پارہ کی کامیابی ہوتی۔ مہ پارہ نے اپنا مقصد پورا کرنے کے لیے اس مظلوم لڑکی نادرہ کو اپنا آلہ کار بنایا تھا جو اس وقت میرے سامنے سر جھکائے کھڑی تھی۔ یہ لڑکی مظلوم اور بے گناہ ہے' اس خیال نے میرے دل میں اس بدصورت لڑکی کے لیے ہمدردی پیدا کر دی۔

"بیٹھ جاؤ نادرہ!" میں نے اسے کافی دیر بعد مخاطب کیا۔

"جی؟" اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور اس کی حیرت غلط نہیں تھی کیوں کہ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے اسے پہچاننے سے بھی انکار کر دیا تھا۔

"ہاں بیٹھ جاؤ اور اپنے دل سے یہ بات نکال دو کہ میں تم سے خفا ہوں۔" میں پھر بولا۔

وہ کچھ جھجکی پھر کرسی پر بیٹھ گئی۔

"نادرہ! جو کچھ ہوا' اسے اپنے ذہن سے جھٹک دو کہ اسی میں تمہاری اور میری بھلائی ہے۔"

"تو... تو کیا آپ نے مجھے... مجھے معاف کر دیا؟" اس کی آواز میں ارتعاش تھا۔

"تم نے کوئی غلطی نہیں کی کیوں کہ تمہیں خود اعتراف ہے' تم اس وقت اپنے حواس میں نہیں تھیں۔ اس کے باوجود اگر تمہارا دل اس سے مطمئن ہو سکتا ہے کہ میں تمہیں معاف کر دوں تو میں نے معاف کیا' میرے خدا نے معاف کیا۔"

میں نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مگر یقیناً یہ آنسو ممنونیت اور خوشی کے تھے۔ "آپ.... آپ بہت اچھے ہیں۔" اس کے ہونٹ کانپے۔

"تمہیں اپنی غلطی کا احساس کب ہوا؟" میں نے یوں ہی پوچھ لیا' مقصد وہ نہیں تھا جو از خود سامنے آ گیا۔

"آج صبح۔" اس نے بوجھل سی آواز میں جواب دیا۔ "میں خود یہ سوچ رہی تھی کہ

تھانے جا کر حقیقت کا اظہار کروں گی‘ چاہے مجھے خود ہی کیوں نہ سزا بھگتنا پڑے۔ غلط بیانی اور کسی پر جھوٹا اور اتنا سخت الزام لگانا بھی بہرحال جرم ہے۔ اسی دوران میں تھانے سے خود ہی بلاوا آگیا۔"

میں چونک اٹھا۔ تو گویا نادرہ خود ہی اپنا بیان بدلنے پر آمادہ تھی۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ ایس ایچ او نے اسے بیان بدلنے پر راضی نہیں کیا تھا اور اس نے مجھے خواہ مخواہ اچھا خاصا "چھیل" لیا تھا‘ وہ بھی ایسے وقت جب کہ میرے پاس زیادہ رقم نہ تھی۔ یہ سوچ کر مجھے اس عیار شخص پر غصہ آنے لگا‘ مگر جلد ہی میں نے اپنے غصّے پر قابو پا کر پہلے اپنے اقیاس کی تصدیق کی۔

پھر جواباً" نادرہ نے جو کچھ بتایا‘ اسے سن کر میں مزید کھول اٹھا۔ پولیس نے واقعی حد کر دی تھی مجھ سے رقم اینٹھی تو اینٹھی تھی‘ اس غریب کو بھی نہیں چھوڑا تھا۔ ہوا یہ کہ نادرہ نے تھانے پہنچ کر صاف صاف کہہ دیا کہ اسے مجھ سے کوئی شکایت نہیں اور وہ اپنا تحریری بیان واپس لینا چاہتی ہے۔ ایس ایچ او نے اسے کہا کہ یہ مشکل ہے کیوں کہ میں‘ نادرہ پر جھوٹا الزام لگانے پر کیس کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے منت سماجت کی تو ایس ایچ او بڑی مشکل سے پانچ سو روپے لے کر اس بات پر راضی ہوا کہ اس کا تحریری بیان واپس کر دے گا۔ پھر مجھ سے اس نے پندرہ ہزار روپے اینٹھے۔ نادرہ نے وہ تحریری بیان لے کر پھاڑ دیا اور مجھ سے معذرت کرنے چلی آئی۔ نادرہ کے بیان کی روشنی میں‘ میں اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ پولیس نے یقیناً اس کی رپورٹ درج نہیں کی ہوگی تاکہ اس کا تحریری بیان دکھا کر مجھ سے رقم اینٹھ سکے گویا یہ جھوٹ تھا کہ ایف آئی آر کٹ چکی ہے۔ تحریری بیان کی کوئی اہمیت نہیں تھی‘ اسے استعمال بھی کیا جا سکتا تھا اور نہیں بھی۔ اس کا انحصار حالات پر تھا۔ پولیس اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب رہی تھی۔ اگر ایف آئی آر کٹ چکی ہوتی تو اس تحریری بیان کو ضائع نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پہلے جانے یہ کیوں نکتہ میری سمجھ میں نہ آیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ پے در پے واقعات نے مجھے کچھ سوچنے سمجھنے کی مہلت ہی نہ دی تھی۔

نادرہ ایک معمولی نرس تھی اور اس کے لیے پانچ سو روپے بھی بہت تھے۔ یہ سوچ کر میں اٹھا اور اسے الماری سے پانچ سو روپے نکال کر دینے لگا۔ "یہ رکھ لو!" میں نے اس سے کہا۔

"مگر کیوں جناب!" [illegible] سے بولی۔ "آپ یہ روپے کیوں دے رہے ہیں؟"

"اس لیے کہ میری نظر میں تم بے قصور ہو اور کسی بے قصور کو سزا نہیں ملنا

چاہیے۔" میں بولا۔ "رکھ لو انہیں!" میں نے پھر اس کی طرف نوٹ بڑھا دیے۔

"لیکن میں یہ روپے نہیں لوں گی۔ آپ کا یہی احسان کم نہیں کہ مجھے معاف کر دیا۔"
اس نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔

میں نے بہت چاہا کہ وہ روپے لے لے‘ مگر اس نے انکار کر دیا۔ وہ یقیناً ایک شریف ضمیر لڑکی تھی۔ دکھے ہوئے دل کے لوگ شاید ایسے ہی ہوتے ہیں۔

"اچھا اب میں جاؤں؟" اس نے بڑے بھولپن سے کہا‘ بالکل اس طرح جیسے میں اسے جانے نہ دوں اور روک لوں۔

میں اس کی آنکھوں میں مچلنے والے جذبات کو محسوس کر رہا تھا اور مجھے یہ بھی یاد تھا کہ میں نے اس سے گزشتہ روز کیا کہا تھا! مگر وہ اور لمحے تھے اور بات تھی۔ میں اسے مہ پارہ کی ہم شکل سمجھ رہا تھا حالانکہ حقیقت یہ نہ تھی۔ میں اب مزید کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا اس لیے اس سے نظریں چراتے ہوئے بولا۔ "ہاں نادرہ تم جاؤ۔"

"آپ.... آپ نے مجھے دل سے معاف کر دیا ہے نا؟ میرا... مطلب ہے کہ اس نازیبا حرکت پر!" وہ رک رک کر کہنے لگی۔

"ہاں ہاں بالکل!" میں نے اسے یقین دلایا۔

"پھر.... پھر آپ نے کل مجھ سے.... جو کچھ کہا تھا تاکہ....میں.... میں آپ کو اپنی اداس اور محروم زندگی کا سہارا سمجھ سکتی ہوں" آخر اس کی محرومیاں جاگ ہی اٹھیں اور دل کی بات زبان پر آگئی۔

مجھے اس بھولی اور اداس لڑکی پر بہت ترس آیا‘ مگر ظاہر ہے کہ اب وہ طلسم ٹوٹ چکا تھا۔ میں نے اس سے یہ نہیں‘ مہ پارہ سے اظہار محبت کیا تھا‘ یعنی اسے مہ پارہ سمجھ کر!

"سنو نادرہ!" میں نے کچھ سوچتے ہوئے انتہائی نرمی سے کہا۔ "جس طرح تمہیں کل کچھ ہو گیا تھا‘ وہی میرے ساتھ ہوا۔ اس عالم میں جانے کیا کیا کہتا رہا! ان باتوں کو بھلا دو اور اپنے ہی شب و روز میں آباد رہو۔ میں نے اس عالم میں جو کچھ کہا اس کے لیے تم سے معذرت چاہتا ہوں۔"

وہ ایک دم اٹھ کر کھڑی ہوئی اور اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ میں سمجھ گیا کہ یقیناً میری بات سن کر ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے ہوں گے جنہیں چھپانے کی خاطر اس نے منہ پھیر لیا تھا۔

"خدا حافظ!" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی

دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

"خدا حافظ نادرہ!" میں بھی جواباً بولا اور اس کی طرف سے نگاہ ہٹالی۔

وہ دروازہ کھول کر باہر چلی گئی تو میں بستر پر دراز ہو گیا' پھر رات بھر کی تھکن اور بیداری نے بہت جلد میری آنکھوں میں نیند کے جال بن دیے۔

پھر پانچ چھ دن کسی قابل ذکر واقعے کے بغیر گزر گئے۔ میں بہ دستور عمل کرتا رہا۔ ڈاکٹر امتیاز صبح شام آکر میرے گردن کے زخم کی ڈریسنگ کر جاتا تھا جس کے سبب مجھے تکلیف و اذیت سے نجات ملی ہوئی تھی ورنہ جانے مجھ پر کیا گزرتی!

میں اب یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ شاید مہ پارہ کی روح میری طرف سے مایوس ہو گئی ہے ورنہ مجھ پر کوئی نیا حربہ ضرور آزماتی۔ شاید اب اس کی ترکش میں کوئی تیر نہیں رہا۔

اس عرصے میں مجھے اپنے ورکنگ پارٹنر نصیرالدّین کا خیال ہی نہیں تھا جس کے دل میں بے ایمانی آگئی تھی۔ اس نے نہ صرف فرم پر قبضہ کر لیا تھا اور اس کا تنہا مالک بن بیٹھا تھا بلکہ مجھ پر پونے دو لاکھ روپے بھی واجب الادا بتا رہا تھا۔ اس نے مجھے ایک ہفتے کی مہلت دی تھی کہ میں رقم ادا کروں ورنہ وہ میرے خلاف قانونی کارروائی کرے گا۔ اس کے پاس اس رقم کی رسیدیں موجود تھیں۔ مہلت ختم ہوتے ہی وہ بڑی ڈھٹائی سے آدھمکا چوری اور سینہ زوری والا معاملہ تھا۔ ظاہر ہے مجھے اس پر سخت غصہ آرہا تھا۔ جب میری ملازم ارشاد علی نے ایک شام اس کے آنے کی اطلاع دی تو میں بپھر گیا۔

"اس کمینے کو دھکے دے کر میری کوٹھی سے باہر نکال دو!میں تقریباً" چیخ اٹھا۔

"جی!" ارشاد علی حیران رہ گیا۔ ظاہر ہے اسے یہی معلوم تھا کہ نصیرالدّین میرا شریک کار ہے۔ اس کی حیرت بجا تھی۔

"میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو جاؤ!" میں پھر چیخا۔

ارشاد علی سٹپٹا کر کمرے سے نکل گیا۔ مجھے نصیرالدّین کی فکر نہیں تھی۔ اگر اس کے پاس یہ ثبوت تھا کہ میں فرم سے دستبردار ہو چکا ہوں اور یہ کہ فرم کے مجھ پر پونے دو لاکھ روپے نکلتے ہیں تو یہ روپے وہ مجھ سے فوری طور پر نہیں لے سکتا تھا' پہلے اسے مجھ پر کیس کرنا پڑتا' پھر اس دعوے کو ثابت کرنے میں ایک لمبا عرصہ لگتا۔ یہ "دیوانی" کا کیس تھ جو دیوانہ بنا دیتا ہے۔ کچہری کے چکر کاٹتے کاٹتے جوتیاں گھس جاتی ہیں اور برسوں میں جا کے فیصلہ ہوتا ہے۔ مجھے تو صرف چند دن درکار تھے۔ اس کے بعد اس خبیث اور بے ایمان کے سارے کس بل نکال دیتا۔

جاتے جاتے وہ چند سطری خط میرے نام لکھ گیا تھا۔ یہ خط مجھے ارشاد علی نے لا کر دیا۔ غصے کے باوجود میں نے اس پر ایک نظر ڈال لی اور پھر پرزے پرزے کر دیا۔ نصیرالدّین نے مجھ پر کیس کرنے کی دھمکی دی تھی اور یہ بتایا کہ وہ بہت بارسوخ آدمی ہے جلد ہی مجھ سے اپنی رقم وصول کر لے گا۔

یہ واقعہ اس کے دوسرے دن کا ہے کہ مجھے بلدیہ چاٹگام کی جانب سے ایک خط ملا۔ خط میں لکھا تھا کہ میں فوری طور پر بلدیہ کے متعلقہ حکام سے ملوں۔ مجھے اس طلبی پر بڑی حیرت ہوئی۔ بہرحال میں اپنا تجسس دور کرنے کے لیے بلدیہ کے دفتر پہنچ ہی گیا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ مجھے بلدیہ کی طرف سے جو خط بھیجا گیا تھا۔ "اس پر اشد ضروری درج تھا۔

بلدیہ کے دفتر پہنچ کر مجھے متعلقہ افسر تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہ ادھیڑ عمر شخص تھا اور خدوخال سے چڑچڑے مزاج کا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اس سے اپنا تعارف کرایا تو وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "تو آپ ہیں شیخ کرامت! آگئے آپ!"

"جی۔" میں نے اس کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے سکون سے کہا۔

"تشریف رکھئے!" اس نے سامنے پڑی ہوئی کرسیوں کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔

میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا۔ "فرمایئے مجھے کیوں طلب کیا گیا ہے؟"

"ہفتے بھر میں تین خط آپ کو لکھے جا چکے ہیں۔ معلوم نہیں آپ سرمایہ دار لوگ اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہیں!" وہ منہ بگاڑ کر کہنے لگا۔

"مگر مجھے تو یہ پہلا خط ملا ہے' جناب!" میں نے احتجاج کیا۔ "آپ بلا سبب میری طرف سے بدگمان ہو رہے ہیں! یہ بتائیں کہ بات کیا ہے؟"

"بات بہت اہم ہے!" اس نے اپنی عینک درست کرتے ہوئے کہا۔ "احکام بہ راہ راست ڈھاکہ سے آئے ہیں جن کی تعمیل جلد سے جلد ضروری ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔" میں حیرت سے بولا۔

"وہی سمجھانے تو بلایا ہے میں نے آپ کو!" اس نے دیدے گھمائے' پھر بولا۔ "جہاں آپ کی کوٹھی واقع ہے' وہاں سے ہمیں ایک سڑک نکالنا ہے۔"

"وہ کس خوشی میں؟" میں اس کے لہجے سے تپ گیا۔

"اس خوشی میں!" یہ کہہ کر اس نے میز پر رکھی ہوئی ایک فائل کھول کر میرے سامنے رکھ دی۔ "یہ گورنر صاحب کا حکم ہے۔"

میں فائل میں لگے ہوئے کاغذ کو پڑھنے لگا۔

"گزشتہ دنوں گورنر صاحب نے چاٹگام کا دورہ کیا تھا۔" وہ کہتا رہا۔ "گورنر صاحب اس طرف سے بھی گزرے تھے۔ جہاں آپ کی کوٹھی ہے۔ اس جگہ راستہ بہت تنگ ہے۔ انہوں نے موقع ہی پر حکم دیا تھا کہ سڑک کو کشادہ کیا جائے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ....."

"لیکن وہ میری پراپرٹی ہے، سرکاری نہیں۔" میں نے فائل بند کرتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔

"بہت خوب" اس کا لہجہ پھر طنزیہ ہو گیا۔ "آپ کے خیال میں حکومت کو اتنا بھی اختیار نہیں کہ وہ عوام کی فلاح و بہبود کے لیے کوئی قدم اٹھا سکے!"

"مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ آپ لوگ میری مرضی و منشا کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے۔ یہ میرا قانونی حق ہے!" مجھے جانے کیوں اس پر غصہ آئے جا رہا تھا۔

"دیکھیں حکومت سے ٹکر لینا کوئی اچھی بات نہیں!" اس نے گویا دھمکی دی۔ "حکومت آپ کو اس کا معاوضہ دے گی، یوں ہی آپ کی جگہ پر قبضہ نہیں کرے گی۔"

"اور اگر میں معاوضہ لینے پر تیار نہ ہوں تو؟" میں نے اسے گھورا۔

"تو مجبوراً دوسرا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔"

"یعنی آپ زبردستی میری کوٹھی کو مسمار کر دیں گے؟" میرے لہجے میں تلخی آ گئی۔

"یہ تو وقت بتائے گا کہ کیا ہو گا۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ "میرا فرض تھا کہ آپ کو بلا کر یہ بتا دوں کہ اسی مہینے کے اندر اپنی سکونت کا کوئی اور بندوبست کر لیں۔ آپ کے پاس صرف بیس روز ہیں۔ اگر آپ پہلے ہی سے آ جاتے تو ممکن ہے ایک ہفتہ اور مل جاتا۔"

"یہ تو زبردستی ہوئی۔"

"جو بھی سمجھیں آپ! اس سلسلے میں کل تک آپ کو تحریری طور پر حکم مل جائے گا۔" اس نے اپنے سامنے رکھی ہوئی فائل کھولی، پھر بولا۔ "آپ جا سکتے ہیں۔"

"خدا حافظ!" میں ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہاں سنیں!" اس نے گویا مجھے چڑایا۔ "اگر آپ چاہیں تو اس سلسلے میں عدالت کا دروازہ بھی کھٹکھٹا سکتے ہیں، لیکن یہ ذہن میں رکھیے گا کہ حاصل کچھ نہیں ہو گا۔"

"میں خوب جانتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے!" میں نے سخت لہجے میں کہا اور پھر تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

پھر جب میں اس کے کمرے سے نکل رہا تھا تو میری سماعت سے ایک آشنا ہنسی کی آواز

ٹکرائی اور میں چونک اٹھا۔ اسی کے ساتھ میرے اعصاب جھنجھنا اٹھے۔ وہ ہنسی مہ پارہ کی تھی، میری دشمن جاں کی ہنسی! جسے یقیناً میں ہی سننے کا اہل تھا۔

"کہو شیخ یہ کیسی رہی؟" میں نے مہ پارہ کی زہریلی آواز سنی اور پھر دوبارہ اس کی ہنسی کی آواز سنائی دی جو رفتہ رفتہ دور ہوتی چلی گئی۔

تو یہ سارا چکر اس کا چلایا ہوا ہے! چلتے چلتے میں سوچنے لگا۔ اس کا تعلق بھی میرے عمل سے تھا۔ میرے لیے ضروری تھا کہ جس جگہ عمل شروع کیا ہے، وہیں پورے چالیس دن تک بلاناغہ عمل جاری رکھوں۔ عمل کے لیے میں جگہ نہیں بدل سکتا تھا میں نے حساب لگایا۔ ابھی مجھے عمل کرتے ہوئے صرف دس روز ہوئے تھے۔ میرے پاس بیس دن اور تھے، مہلت کے مطابق! گویا دس دن پہلے میری کوٹھی مسمار کر دی جاتی اور میں اس طرح اس جگہ پر عمل جاری رکھنے کی پابندی کو پورا نہ کر پاتا۔

یہ معاملہ پولیس کا نہیں تھا کہ کچھ لے دے کر جان چھوٹ جاتی، میں اسی لیے فکر مند تھا۔ بہرحال ابھی میرے پاس سوچنے کے لیے وقت تھا۔

دوسرے دن مجھے بلدیہ کی طرف سے ایک اور تفصیلی خط ملا۔ اس میں کوٹھی کی قیمت ساٹھ ہزار مقرر کی گئی تھی۔ یہ قیمت تحریر کے مطابق اسیسمنٹ کے بعد مقرر کی گئی تھی۔ لکھا تھا کہ میں اٹھائیس فروری تک کوٹھی خالی کر دوں اور اس کا معاوضہ بلدیہ سے وصول کر لوں میں نے کچھ سوچ کر وہ رجسٹری خط سنبھال کر رکھ دیا۔

تین چار دن اور گزر گئے۔ ابھی تک میں کسی نتیجہ تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ ساتویں دن مجھے عدالت کی طرف سے سمن ملے اور میں کھول کر رہ گیا۔ نصیرالدین نے میرے خلاف مقدمہ دائر کیا تھا۔ دو روز بعد مجھے عدالت میں حاضر ہونا تھا۔ وہ وقت میرے سونے کا تھا۔ دن میں سونا میرے لیے بہت ضروری تھا تاکہ رات کو عمل کرتے وقت میرے ذہن پر غنودگی نہ ہو۔ بہرحال قہراً و جبراً مقررہ دن سے پہلے میں نے ایک وکیل کر لیا۔ ایڈووکیٹ چودھری سے میں نے صرف اتنا کہا کہ وہ کسی طرح بھی ایک مہینہ گزار دے۔ اور تاریخیں لیتا رہے، مگر اس کے باوجود مجھے پہلی پیشی پر عدالت پر حاضری دینا ہی پڑی۔ خلاف توقع اگلی تاریخ اسی ماہ میں پڑی جب کہ عموماً ایسا نہیں ہوتا۔ وکیل نے مجھے تسلی دی کہ آپ فکر نہ کریں میں تاریخ بڑھوا لوں گا۔

مجھے نہ تو اس کوٹھی سے کوئی جذباتی لگاؤ تھا کہ وہیں سکونت پر اصرار کرتا اور نہ ہی نصیرالدین نے مجھ پر جتنی رقم کا دعویٰ کیا تھا، اس کی کوئی پروا تھی۔ سارا مسئلہ وقت کا تھا اور

وقت کسی طرح میرے حق میں نہیں تھا۔ اب میرے ذہن میں یہ بات بھی واضح ہوتی جا رہی تھی کہ نصیرالدین کا معاملہ بھی خالی از علت نہیں۔ اس سلسلے میں بھی مہ پارہ کا ہاتھ معلوم ہو رہا تھا۔ وہ چاہے جتنا بے ایمان سہی، مگر اتنی دیدہ دلیری کا ثبوت نہیں دے سکتا تھا کہ جو رقم مجھ پر واجب الادا نہیں تھی۔ اس کے لیے دعویٰ دائر کر دیتا۔

بلدیہ کی طرف سے دی جانے والی مہلت پوری ہونے میں پانچ دن باقی تھے کہ مسلسل سوچتے آخر میں نے ایک راہ نکال ہی لی۔ اس کا دارومدار بلدیہ والوں پر تھا کہ وہ میری تجویز پر اتفاق کرتے یا نہ کرتے۔ بہرحال میں نے آخری کوشش کر لینے میں کوئی حرج نہیں سمجھا اور بلدیہ کے دفتر پہنچ گیا۔

مجھے اس افسر سے ملنے کے لیے پورے ایک گھنٹے انتظار کرنا پڑا جس سے پہلے بھی مل چکا تھا۔ موصوف کسی ضروری میٹنگ میں تھے۔ میں اس عرصے میں کھولتا رہا۔ بہرحال کسی طرح خدا خدا کر کے اس نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور کمرے میں قدم رکھتے ہی گویا میرے تن بدن میں آگ لگا دی۔

"آپ یقیناً کوئی معاوضہ لینے آئیں ہوں گے!" یہ کہہ کر وہ رکے بغیر مزید بولا۔ "جب تک بلدیہ کو قبضہ نہیں مل جائے گا۔" ادائیگی نہیں ہوگی۔"

"میں معاوضہ لینے نہیں آیا! سمجھے آپ!" میں اپنے غصے پر قابو پا کر آگے بڑھا اور پھر اس کے کہے بغیر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"پھر؟.... پھر کیوں آئے ہیں آپ؟.... میرا وقت بہت قیمتی ہے" وہ منہ بنا کر بولا۔

"آپ کے قیمتی وقت کا مجھے پوری طرح احساس ہے، لیکن میں بھی گھر سے فالتو نہیں ہوں، کوئی وجہ ہے جو آیا ہوں۔"

"بیان کریں۔"

"میری کوٹھی خاصی بڑی ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ کو سڑک ہی کشادہ کرنی ہے اور اس لیے پوری کوٹھی مسمار کرنا ضروری نہیں۔" میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"پھر! یہ کوٹھی کا نصف حصہ آپ کے لیے کافی ہو گا۔" "نہیں"۔ اس نے انکار میں سر ہلایا۔

"مگر کیوں؟"

"دراصل یہ بات میرے ذہن میں تھی میں نے اسی لیے اوپر والوں کو ایک تجویز بھیجی تھی جس کی منظوری مل گئی ہے۔ اس کے بعد پوری کوٹھی ہی مسمار کرنا پڑے گی۔"

"آپ تو ایسے بات کر رہے ہیں جیسے وہ میری نہیں آپ کی ملکیت ہو!" مجھے دوبارہ غصہ آ گیا۔

"اگر فی الحال نہیں تو چند دن بعد ہو جائے گی۔" اس کی آواز میں چبھن تھی۔ پھر وہ خود ہی بولا۔ "دراصل علاقہ بہت کنجیسٹڈ ہے وہاں کوئی چھوٹا سا پارک بھی ہونا چاہیے۔ میں نے یہی تجویز اوپر بھیجی تھی کہ وہ جگہ خواہ مخواہ خالی پڑی رہے گی، اس سے تو یہ بہتر ہے کہ وہاں پارک بنا دیا جائے۔ اب سڑک کو کشادہ کرنے کے بعد جو جگہ بچے گی وہاں پارک بنے گا۔"

"کیا یہ تجویز واپس نہیں لی جا سکتی؟" میں نے یہ سوال کرتے ہوئے انتہائی ضبط کا مظاہرہ کیا۔

"آپ یہ کیا بچوں کی سی باتیں کرتے ہیں! سرکاری فیصلے آپ کی مرضی کے تابع نہیں ہوتے! آپ جا سکتے ہیں۔ خواہ مخواہ آپ نے میرا وقت ضائع کیا!"

"مجھے اب عدالت ہی سے رجوع کرنا پڑے گا!" یہ کہہ کر میں کھڑا ہو گیا۔

"ضرور میں نے تو پہلے ہی آپ کو مشورہ دیا تھا، دیر کر دی آپ نے!"

"ہاں یقیناً دیر ہو گئی؟" میں نے کہا اور تیز قدم اٹھاتا ہوا اس کے کمرے سے نکل آیا۔ دراصل وہ کمرا جہاں میں عمل کرتا تھا، کوٹھی کے آخری حصے میں تھا۔ اگر کوٹھی کا نصف بیرونی حصہ مسمار بھی کر دیا جاتا تو فی الحال میں صبر کر لیتا اور وہیں رہتا مگر اس خبیث نے بالا ہی بالا ایک پارک کی منظوری بھی لے لی تھی۔ اور اب یہ راہ بھی میرے لیے بند کر دی تھی۔ معاملہ صرف دس روز کا تھا۔ اگر کسی طرح دس روز گزر جاتے تو پھر مجھے کوئی پروا نہیں تھی۔ چاہے بلدیہ والے پوری کوٹھی مسمار کرتے یا آدھی مجھے کوئی دلچسپی نہ ہوتی۔ اب یہی واحد صورت رہ گئی تھی کہ میں اس سلسلے میں عدالت سے رجوع کرتا۔ مجھے کیس جیتنے ہارنے سے بھی کوئی فائدہ یا نقصان نہیں تھا۔ سارا مسئلہ دس دن کا تھا کہ دس دن بلدیہ کو کس طرح کوٹھی مسمار کرنے سے روکا جائے؟

میں وہاں سے سیدھا کچہری پہنچا۔ ایڈووکیٹ چودھری اپنے دفتر میں نہیں تھا۔ اس کے محرر نے بتایا کہ چودھری صاحب کسی کیس کی پیروی کرنے کسی عدالت میں گئے ہیں۔ مجھے تقریباً پون گھنٹے انتظار کرنا پڑا اور اس عرصے میں بہت بیزار ہوا۔ ان دونوں میری نیند بھی پوری نہیں ہو رہی تھی۔ اس لیے طبیعت میں اور بھی جھنجھلاہٹ پیدا ہو گئی تھی۔

"کہیئے چودھری صاحب، کیسے آنا ہوا؟" ایڈووکیٹ چودھری نے آتے ہی خوش مزاجی سے پوچھا پوچھا۔ "کیس کی تاریخ تو پرسوں ہے" وہ غالباً یہ سمجھا تھا کہ میں نصیرالدین والے

کیس میں اس سے ملنے آیا ہوں۔"

"وہ مسئلہ نہیں چودھری صاحب!" میں بولا۔ "وہ تو مجھے معلوم ہے کہ آپ اس کیس میں نئی تاریخ لے لیں گے۔"

"پھر؟" وہ اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگا۔ "کیا کوئی نیا چکّر ہے؟"

"ہاں۔" میں نے کہا اور پھر از اول تا آخر اسے ساری بات بتادی۔

"ہوں!" وہ کچھ سوچنے لگا پھر ذرا دیر بعد بولا۔ اس سلسلے میں بلدیہ کی طرف سے آپ کو جو خط ملے ہیں' وہ لائے ہیں اپنے ساتھ؟"

"نہیں' اس وقت تو نہیں لایا۔" میں نے جواب دیا "دراصل اس وقت میں بلدیہ کے دفتر ہی سے آ رہا تھا۔" پھر میں نے آج وہاں جانے کی وجہ بھی بتادی اور بلدیہ والوں کے نئے فیصلے سے بھی آگاہ کردیا کہ وہ وہاں پارک بھی بنانا چاہتے ہیں۔

"بات دراصل یہ ہے شیخ صاحب کہ اس معاملے میں صوبائی حکومت کا ایما بھی شامل ہے۔ اور بہ راہ راست گورنر نے اس سلسلے میں حکم دیا ہے اس لیے....." وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں کہہ دیں چودھری صاحب!" میں نے اسے خاموش دیکھ کر کہا۔ "میں ہر بات سننے کے لیے تیار ہوں۔"

"اگر صرف بلدیہ کا معاملہ ہوتا تو کامیابی کے امکانات تھے' اس کیس میں! آپ نے جو صورت حال بتائی ہے' اس میں مشکل ہی ہے کہ ہم کیس جیت سکیں۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں آپ کو دم دلاسے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ بہرحال آپ ایسا کریں کہ آج رات کو سات آٹھ کے درمیان گھر وہ کاغذات لے کر آجائیں ممکن ہے کوئی صورت نکل آئے۔"

ٹھیک ہے' میں آجاؤں گا اور آپ کو کوئی نہ کوئی راہ نکالنا ہی پڑے گی!" میں نے زور دے کر کہا۔

"دیکھتے ہیں' اللہ مالک ہے۔ آپ آئیں تو سہی۔ یہ کہہ کر چودھری اپنے محرر سے کسی کیس کے بارے میں پوچھنے لگا۔

"اچھا میں چلتا ہوں اب!" میں نے اس سے اجازت چاہی۔

"خدا حافظ! اس نے میری طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھادیا۔ بلدیہ کی جانب سے مجھے دو ہی خط ملے تھے' میں رات کو وہ خط لے کر ساڑھے سات بجے کے قریب ایڈووکیٹ چودھری کے گھر پہنچ گیا۔

"میں نے آپ کی کوٹھی دیکھی ہے۔" ایڈووکیٹ چودھری ایک خط پر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ "انہوں نے ساٹھ ہزار روپے بہ طور معاوضہ بہت کم لگائے ہیں۔ اسیسمنٹ صحیح نہیں ہوا۔"

"مجھے رقم سے کوئی دلچسپی نہیں چودھری صاحب!" میں نے صاف گوئی سے کہا۔ "اگر یہ رقم ساٹھ ہزار کی بجائے آٹھ ہزار بھی ہوتی تو میرے لیے کوئی فرق نہ پڑتا۔ میں تو دراصل یہ چاہتا ہوں کوٹھی پر بلدیہ کا قبضہ نہ ہو۔

یہ تو مشکل ہے شیخ صاحب! میں آپ کو جھوٹی تسلیاں دینا نہیں چاہتا' اور یوں بھی اب وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ آپ کو اس سلسلے میں پہلے ہی مجھ سے مشورہ کرلینا چاہیے تھا۔" اس نے انکار میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"کیا یہ بھی ممکن نہیں کہ صرف چند دن معاملہ ٹل جائے؟" میں نے پوچھا۔

"میں سمجھا نہیں' چند دن سے آپ کی کیا مراد ہے؟ اس نے وضاحت چاہی۔

"میرا مطلب یہ ہے کہ دس مارچ تک کوٹھی کو مسمار نہ کیا جائے۔" میں نے عمل کی مدت کو ذہن میں رکھتے ہوئے جواب دیا۔

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے' آپ نے نصیرالدّین والے کیس میں بھی شاید اسی تاریخ کا ذکر کیا تھا اور کہا تھا کہ اگلی تاریخ بہرحال دس مارچ کے بعد پڑنی چاہیے۔ کیا دس مارچ کی کوئی خاص اہمیت ہے آپ کی نظر میں؟ کہیں کسی نجومی وجومی نے تو آپ کو یہ تاریخ نہیں بتادی؟" وہ مسکرا کر بولا۔

"ایسی کوئی بات نہیں چودھری صاحب!" میں نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔ "میں نجومیوں کے چکّر میں نہیں پڑتا۔ میں نے دانستہ ایک جھوٹ بولا۔ "دراصل دس مارچ کو میں ایک کاروباری معاہدہ کرنے والا ہوں جس کے بعد مجھے بڑی رقم مل جائے گی۔ ظاہر ہے کہ جب ہاتھ میں پیسا ہوتا ہے تو پھر مسئلہ' مسئلہ نہیں ہوتا۔ آدمی جو چاہے کرسکتا ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" اس نے میری تائید کی۔

"ہاں تو پھر میرا سوال.... یعنی دس مارچ تک ممکن ہے کہ بلدیہ کو کوئی قدم اٹھانے سے روکا جاسکے؟"

"میں اپنی گفتگو کے آغاز میں ایک بات کہی تھی جس پر آپ نے زیادہ توجہ نہیں دی۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"کیا؟"

"یہ کہ اسسیمنٹ صحیح نہیں ہوا۔" اس نے جواب میں کہا۔ "اس بنیاد پر وقت کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ کو رقم سے کوئی دلچسپی ہے یا نہیں' اسے بہرحال جواز بنایا جا سکتا ہے کہ صحیح قیمت مقرر نہیں کی گئی۔ اگر آپ کہیں تو کیس تیار کرتا ہوں۔"

"اس طرح کیا آپ کو امید ہے کہ مطلوبہ مہلت مل جائے گی۔" میں نے دریافت کیا۔

"کیوں نہیں۔" وہ بولا۔ "پہلا کام تو ہم یہ کریں گے کہ اس سلسلے میں عدالت سے اسٹے آرڈر لے لیں گے۔ اس کے بعد اسسیمنٹ کی درخواست دیں گے۔ اسسیمنٹ میں بہرحال اتنا وقت تو گزر ہی جائے گا۔"

"یعنی یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا؟"

"وقت سے پہلے کیا کہا جا سکتا ہے! ظاہر ہے کہ قیاس ہی ممکن ہے۔"

اگر انہوں نے دس مارچ سے پہلے ری سسیمنٹ کی کارروائی مکمل کر لی تو؟"

"آپ تو ناحق گھبرا رہے ہیں شیخ صاحب!" وہ ہنسا۔ "ارے بھائی' کوئی ضروری تو نہیں کہ ہم اس اسسیمنٹ کو قبول ہی کر لیں۔ اس پر بھی تو اعتراض داخل کیا جا سکتا ہے! یہ عدالتی معاملات ہیں وقت کو کس طرح ٹالا جاتا ہے' اس کے چھپتر طریقے ہم لوگوں کے پاس ہیں۔ نتائج کیا نکلتے ہیں کیا نہیں' اس سے تو بہرحال آپ کو کوئی دلچسپی نہیں' صرف وقت ٹالنے ہی کا تو معاملہ ہے۔ وہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ یہی تو ہو گا نا کہ ہماری درخواست خارج ہو جائے گی' ہم کیس ہار جائیں گے جس کے لیے آپ پہلے سے تیار ہیں پھر فکر کی کیا بات ہے!"

"تو پھر ٹھیک ہے چودھری صاحب' آپ کیس تیار کریں۔" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔

"پھر آج ہی رات مجھے تیاری کرنا پڑے گی۔ یہ کہہ کر اس نے اپنی میز کی دراز کھولی اور وکالت نامہ نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔ "اس پر دستخط کر دیں۔"

میں نے وکالت نامے پر دستخط کر دیے اور پھر اس کی فیس بھی ادا کر دی۔ وہ مہنگا وکیل ضرور تھا' مگر میں اس سے پوری طرح مطمئن تھا۔ اس نے بہرحال اس وقت میرے ذہن پر سے ایک بہت بڑا بوجھ ہلکا کر دیا تھا۔

"آپ صبح ساڑھے نو بجے کچہری آ جائیے گا۔ اس نے چلتے وقت مجھ سے کہا۔

"بہتر ہے۔" میں نے جواباً" اس کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور اٹھ

کھڑا ہوا۔

دوسرے دن بہ مجبوری مجھے پھر نیند کی قربانی دینی پڑی اور میں وقت پر کچہری پہنچ گیا حالانکہ میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ پھر جب ایڈووکیٹ چودھری نے اسی روز عدالت سے اس اسٹے آرڈر حاصل کر لیا تو مجھے سکون ہوا۔ اب بلدیہ فوری طور پر میری کوٹھی کو مسمار نہیں کر سکتی تھی۔ چودھری نے اسسیمنٹ کی درخواست بھی اسی دن دے دی تھی اور اس بنیاد پر اسٹے آرڈر ملا تھا۔

جزوی طور پر مہ پارہ کا یہ حربہ ناکام ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں میرا دل کچھ مطمئن سا نہیں تھا۔ ہر لمحے مجھے یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ خدا جانے کب کیا ہو جائے! اسی فکر نے میری صحت پر بھی برا اثر ڈالا تھا۔ میں تو پہلے ہی سے زیر علاج تھا اور دواؤں کے بل پر چل رہا تھا' ان واقعات نے اور مجھے توڑ کے رکھ دیا۔

دوسرے دن صبح جب ڈاکٹر امتیاز میرے گردن کے زخم کی ڈریسنگ کرنے آیا تو میں نے اس سے اپنا چیک اپ بھی کرایا اور شکایت کی۔ "پہلے کی نسبت میں اب کافی جسمانی کمزوری محسوس کرنے لگا ہوں ڈاکٹر۔"

"مجھے تو یہی حیرت ہے شیخ صاحب کہ آپ چلتے پھرتے کیسے ہیں!" ڈاکٹر امتیاز بولا۔ "آپ کا مرض آخری مراحل میں ہے اور آپ کو آرام کی شدید ضرورت ہے۔"

"بس ان دنوں یہی ممکن نہیں ڈاکٹر!" میں پژمردگی سے مسکراتے ہوئے بولا۔

"اگر آپ برا نہ مانیں تو میں کہوں گا کہ راتوں کو جاگنا اور عبادت کرنا چھوڑ دیں۔ آپ کی صحت اس کی اجازت نہیں دیتی۔"

"صرف چند دن کی بات ہے ڈاکٹر!" میرے منہ سے جانے کیسے یہ بات نکل گئی۔

ڈاکٹر امتیاز اس بات کا اور ہی مطلب سمجھا اور مجھے تسلی دینے لگا۔ "ایسی کوئی بات نہیں شیخ صاحب! زندگی اور موت اللہ کے اختیار میں ہے۔ رپورٹس کے مطابق تو آپ موجودہ حالت بھی قابل یقین ہے آپ کو بستر سے ہلنا بھی نہیں چاہیے' مگر آپ خدا کے فضل سے چلتے پھرتے ہیں اور بہ ظاہر صحت مند بھی نظر آتے ہیں۔"

میں اس کی بات پر صرف مسکرا کر رہ گیا۔ مجھے مسکراتے دیکھ کر لمحے بھر کو اس کے چہرے پر حیرت نظر آئی' پھر وہ بھی خواہ مخواہ مسکرانے لگا۔ ظاہر ہے کہ اسے یہ بات کس طرح معلوم ہو سکتی تھی کہ میں چند دن کی بات کیوں کہی ہے!

عمل کرتے ہوئے اب تک چھبیس دن گزر چکے تھے اور یہ ستائیسویں شب کا ذکر ہے

کہ میں صبح ہونے سے قبل اپنے کمرے سے نکل کر حسب معمول چوراہے پر روٹی رکھنے جارہا تھا۔ اب تک میرا عمل تمام شرائط کے ساتھ پوری طرح جاری تھا۔ صدر دروازے تک پہنچنے کے لیے ابھی میں ایک راہداری سے گزر رہا تھا کہ مجھے معاً اپنی دائیں جانب کچھ آہٹیں سی محسوس ہوئیں اور پھر پھنکار سی سنائی دی۔ بے اختیار میری نگاہ اس پر اٹھ گئی اور میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا میرے قدم غیرارادی طور پر خود بہ خود رک گئے تھے۔ اس طرف میری ایک ہندو بنگالی ملازمہ کا کمرا تھا۔ اس کمرے میں مجھے خفیف سی روشنی دکھائی دی جو کچھ غیر فطری سی تھی۔ وہ نہ بلب کی روشنی معلوم ہو رہی تھی نہ کسی چراغ کی کمرے کی ایک کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور ایک بڑا سا سانپ اس کھڑکی کے راستے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ میرے ذہن میں یہ خیال آنا فطری امر تھا کہ میری بنگالی ملازمہ سریتا کی زندگی خطرے میں ہے۔ سانپ کمرے میں داخل ہو کر اسے ڈس لیتا۔ فوری طور پر میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ سریتا کو اس خطرے سے آگاہ کر دوں، مگر دوسرے ہی لمحے جیسے مجھے ہوش آ گیا۔ مجھے عمل کی شرائط کے مطابق چوراہے پر روٹی رکھ کر واپس آنے تک کسی سے کلام نہیں کرنا تھا۔ اگر میں دانستہ یا نادانستہ ایسا کر گزرتا تو عمل باطل ہو جاتا۔

مہ پارہ کا ایک اور حربہ! میں نے سوچا اور دل ہی دل میں ہنسا۔ پھر میرے قدم تیزی سے صدر دروازے کی طرف اٹھنے لگے۔ خیریت یہ ہوئی تھی کہ میں اس دوران مڑ کر نہیں دیکھا تھا، صرف چلتے ہوئے رک کر اس طرح نگاہ اٹھائی تھی۔ سریتا کے کمرے میں غیر فطری سی روشنی نظر آنا اور پھر کھڑکی کے راستے سانپ کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھنا، میرے نزدیک یہ سب کچھ فریب نظر تھا۔

کچھ دیر بعد میں اپنی کوٹھی کی طرف لوٹ رہا تھا۔ صبح ہونے میں ابھی ذرا دیر تھی اور ہر طرف سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ میں نے کوٹھی میں قدم رکھا تو مجھے خلاف معمول اپنے اعصاب پر ایک بوجھ سا محسوس ہوا۔ میری واپسی اسی راہداری سے ہونا تھی جس سے گزر کر میں باہر گیا تھا۔ اب میں چوراہے پر اپنے ہمزاد کے لیے روٹی رکھ کر آ چکا تھا اور عمل کی تمام شرائط پوری کر دی تھیں۔ اب کسی بھی فریب نظر یا فریب سماعت یا میرے بولنے سے عمل باطل نہیں ہو سکتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ اس راہداری سے گزرتے ہوئے میں چونک اٹھا۔ سریتا کے کمرے میں اب بھی وہی پراسرار روشنی نظر آ رہی تھی۔ اسی کے ساتھ میں نے یہ محسوس کیا کہ کوئی مدھم اور دبی دبی زبان میں.... کچھ کہہ رہا ہے۔ یہ آواز سو فی صد مردانہ تھی۔ میں رک گیا۔ اب میں بجا طور پر یہ سوچنے میں حق بہ جانب تھا کہ کوٹھی سے جاتے ہوئے میرے نگاہ سے جو منظر گزرا

تھا، وہ فریب نظر ہرگز نہیں تھا۔ کچھ نہ کچھ تھا ضرور! کیا؟ یہی جاننے کے لیے دبے پاؤں اس طرف بڑھا کمرے کا دروازہ بند تھا، مگر کھڑکی اب تک کھلی ہوئی تھی۔ میں دیوار سے لگ کر کھڑکی کے قریب کھڑا ہو گیا۔ کمرے کا اندرونی منظر اب تک میری نظروں سے اوجھل تھا، مگر اندر گونجنے والی سرگوشیاں اب مجھے واضح طور پر سنائی دے رہی تھیں۔

وہ مردانہ آواز میرے ملازمین میں سے کسی کی نہیں تھی وہ آواز میرے لیے قطعی اجنبی تھی۔

"کون شیخ کرامت! میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ تو میرے ساتھ چل! میں کچھ اور سننا نہیں چاہتا!" مجھے مردانہ آواز سنائی دی وہ جو کوئی بھی تھا، یقیناً سریتا سے مخاطب تھا۔

"میں تیری بنتی کرتی ہوں، مجھے یہاں چین سے رہنے دے اور چلا جا!" یہ التجا آمیز آواز سریتا کی تھی۔

"ہاں یہ تو تو نے بتایا ہی نہیں ابھی کہ کہیں اس شیخ کے بچے نے تجھے خراب تو نہیں کر دیا! بول.... جواب دے اگر اس نے ایسا کیا ہے تو ---- تو پھر وہ میرے انتقام سے نہیں بچ سکے گا۔"

"تو... تو... یہاں آ کیسے گیا؟ میرے بند کمرے میں! مجھے... مجھے تو یہی حیرت ہے۔" سریتا کی آواز آئی۔

جواب میں ہلکی سی مردانہ ہنسی کی آواز سنائی دی، پھر کہا گیا۔ "میں یہاں اپنی شکتی کے بل پر آ گیا۔ تو اگر سات پردوں میں ہوتی تو میں تجھ تک پہنچ جاتا۔ تجھے نہیں معلوم سریتا کہ میں نے تیری خاطر کتنے بنوں کی خاک چھانی ہے اور کتنی تپسیا کی ہے۔ جب مجھے یہ گیان پراپت ہوا ہے۔ تو اسی سے سمجھ لے کر مجھ میں کتنی شکتی آ گئی ہے! کیا تو بھول گئی کہ تیری ہی خاطر میں نے شنکر کا خون کر دیا تھا کیوں کہ وہ تجھے چاہنے لگا تھا اور میں اپنے کسی رقیب کو برداشت نہیں کر سکتا چاہے وہ شنکر ہو یا۔"

"مگر میں تو آج بھی شنکر کو چاہتی ہوں اور.... اور تجھ سے نفرت کرتی ہوں خبیث بوڑھے!" سریتا کی آواز میں بلا کی نفرت تھی۔ "ہاں مجھے خبر ہے کہ شنکر کو کسی سانپ نے نہیں، تو نے ڈسا تھا۔ تو نے ہی اس کی جھونپڑی میں زہریلے سانپ کو لا کر چھوڑا تھا۔ چلا جا شمبھو۔ چلا جا یہاں سے ورنہ.... میں تیرا خون کر دوں گی!" اب سریتا کی آواز کچھ تیز ہو گئی تھی۔

"غصہ کرتی ہے تو مجھے تو اور بھی پیاری لگتی ہے" ڈھٹائی سے کہا گیا، پھر ہنسی کی آواز آئی۔

"تو میری بے بسی پر ہنس رہا ہے! اچھا.... میں بتاتی ہوں تجھے!" سرِتا کی آواز میں شدید غصہ تھا۔

پھر میں نے قدموں کی چاپ سنی۔ شاید سرِتا غصّے میں اس اجنبی شمبھو کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اب تک میں بڑے صبر و سکون اور ضبط کے ساتھ سب کچھ سنتا رہا۔ میں یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ آخر معاملہ کیا ہے؟ مگر اب میری قوّت برداشت جواب دیتی جا رہی تھی۔ یہ میرے لیے توہین کی بات تھی کہ کوئی اجنبی اس طرح میرے گھر میں داخل ہو کر میری ایک ملازمہ کو دھمکیاں دے اور ملازمہ بھی وہ جو میری منظور نظر تھی! اس کے علاوہ اس نے خود میرے لیے بھی توہین آمیز الفاظ استعمال کیے تھے۔

اس سے پہلے کہ میں مداخلت کرتا، مجھے سرِتا کی خوف زدہ سی آواز سنائی دی اور اسی وقت میں نے کسی کے زمین پر گرنے کی آواز بھی سنی۔ میں نے تیزی کے ساتھ آگے بڑھ کر کھڑکی سے کمرے کے اندر جھانکا۔ میں نے اپنی زندگی میں بڑے عجیب اور حیرت انگیز منظر دیکھے ہیں، مگر وقتی طور پر مجھے کمرے کے اندرونی منظر نے جیسے اپنے سحر میں گرفتار کر لیا۔ میری پہلی نظر سرِتا پر پڑی۔ وہ فرش پر چت پڑی تھی اور اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے کے قریب ایک بڑا سا سیاہ سانپ پھن کاڑھے جھوم رہا تھا۔ سانپ کی آنکھیں غیر معمولی طور پر بڑی تھیں اور انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے سانپ کی آنکھوں سے روشنی نکل رہی ہو جو براہ راست سرِتا کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اس سرخ روشنی میں سرِتا کا حسین چہرہ بے حد عجیب لگ رہا تھا۔

یہ صرف چند لمحے کا منظر تھا۔ جو میرے ذہن پر جیسے جم کر رہ گیا تھا۔ معاً" میں نے سانپ کو جیسے چونکتے دیکھا اور پھر دوسرے ہی لمحے اس کا رخ کھڑکی کی طرف ہو گیا، بالکل اس طرح جیسے اس نے میری موجودگی کو محسوس کر لیا ہو۔ میرے جسم میں خوف کی ایک لہر سی دوڑ گئی پھر میں نے اس سانپ کو تیزی سے کھڑکی کی طرف آتے دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے اب بھی شعلے سے لپک رہے تھے۔

مجھے اعتراف ہے کہ اس وقت میں گھبرا گیا۔ میں اسی خوف کے زیر اثر انتہائی تیزی کے ساتھ کھڑکی سے ہٹ گیا۔ اب مجھے سانپ کی پھنکار بھی سنائی دے رہی تھی۔ میں بے حواس سا ہو کر راہداری میں بھاگنے لگا۔ پھر میں نے اپنے کمرے میں پہنچ کر ہی سکون کا سانس لیا۔ اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے دروازہ بند کر لیا تھا۔ فوراً" ہی میری نگاہ کھڑکی کی طرف اٹھی تھی جو بند تھی جس دن سے میں نے عمل شروع کیا تھا کھڑکی بند ہی رہتی تھی۔ وہ

یقیناً خوف ہی کا اثر تھا کہ میں یہ بات بھول گیا تھا۔ میرے ملازم ارشاد علی نے مجھے اس طرح بھاگتے ہوئے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر یقیناً کچھ سوچا ہو گا، مگر وہ بولا کچھ نہیں۔ پھر بعد میں بھی اس کی اتنی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ کچھ پوچھتا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے یہ عجیب بات محسوس کی کہ پہلے مجھے اپنے اعصاب پر بوجھ معلوم ہو رہا تھا۔ وہ ختم ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ خوف میں بھی بڑی حد تک کمی آ گئی تھی کچھ دیر کے بعد میرے حواس معمول پر آ گئے اور میں گزرے ہوئے پُراسرار واقعے کے بارے میں سوچنے لگا۔ یہ واقعہ یقیناً فریب نظر نہیں تھا اور نہ اس کا کوئی عقلی جواز ہی ممکن تھا۔ میں نے اپنی ملازمہ سرِتا کے کمرے میں واضح طور پر ایک فرد کی آواز سنی تھی، مگر جب کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو وہاں سرِتا کے سوا مجھے صرف ایک سیاہ سانپ نظر آیا۔ اگر واقعی وہاں کوئی آدمی تھا تو وہ کہاں گیا؟

اسی سوال نے مجھے ایک نئی راہ سجھائی۔ اب تک براہ راست میرے تجربے میں تو کوئی ایسی بات نہیں آئی تھی، ہاں میں نے اس کے متعلق سنا ضرور تھا۔ عموماً" یہ قوّت جنّات کے متعلق مشہور تھی کہ وہ جس کا جسم چاہیں اپنا لیتے ہیں، خصوصاً" جانوروں کا جسم! میں نے سنا تھا کہ جنّات، کتے، بلی اور سانپ کی شکل میں بھی ظاہر ہو جاتے ہیں، لیکن اس کی تصدیق نہیں ہوئی تھی۔ پیش آنے والے واقعے کو میں اسی نہج پر سوچ رہا تھا۔ پہلے میں نے ایک سانپ کو سرِتا کے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا، پھر لوٹ کر آیا تو اس کے کمرے سے مجھے کسی آدمی کی آواز سنائی دی۔ اس کے بعد مجھے وہاں کوئی آدمی نظر نہیں آیا بلکہ وہی سانپ دکھائی دیا۔ اگر اس مفروضے کو درست مان لیا جاتا کہ پُراسرار قوتیں رکھنے والا کوئی شخص، سانپ بن کر وہاں آیا تھا تو کوئی الجھن نہیں رہتی تھی۔ وہ سانپ کی جون میں وہاں آیا اور پھر کمرے میں پہنچ کر دوبارہ اپنے اصل جسم میں ظاہر ہو گیا۔ پھر جب سرِتا غصّے میں اس کی طرف بڑھی تو سرِتا کو خوف زدہ کرنے کے لیے وہ دوبارہ سانپ بن گیا۔ اگر ایسا نہیں تھا تو پھر وہ کون تھا جس کی آواز میں نے سنی تھی؟ اس سے قطع نظر سرِتا کے اور اس کے درمیان جو گفتگو ہوئی تھی، اس سے یہی ظاہر ہوا تھا کہ اس شخص کے پاس کچھ پُراسرار اور غیر معمولی قوتیں ضرور ہیں جس کا اس نے دعویٰ بھی کیا تھا۔

سرِتا کے ماضی کے بارے میں مجھے زیادہ علم نہیں تھا اور نہ میں نے اس کی کبھی ضرورت محسوس کی تھی۔ مجھے صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ بنگال کے کسی گاؤں کی ہے۔ اب سے کئی سال پہلے میرا ملازم خاص ارشاد علی اسے لے کر آیا تھا اور میں نے اسے پسند کر لیا تھا۔

ارشاد علی کو علم تھا کہ میں بدصورت ملازماؤں کو پسند نہیں کرتا اس کے علاوہ وہ اور بہت کچھ بھی جانتا تھا۔ اسے میرے ذوق اور پسند کا پورا اندازہ تھا۔

اب سریتا کی جو کہانی مجھ پر ظاہر ہوئی تھی' وہ مختصراً" یہ تھی کہ وہ کسی نوجوان شنکر سے عشق کرتی تھی جسے ایک بوڑھے شخص شمبھو نے رقابت میں قتل کر دیا تھا۔ سریتا اس بوڑھے سے نفرت کرتی تھی اور یہ نفرت اب بھی برقرار تھی۔ شنکر کے قتل کے بعد مجھ تک وہ کیسے پہنچی اور درمیان میں کتنا عرصہ گزرا' اسے کیا واقعات پیش آئے' کن حالات سے گزرنا پڑا' یہ سب کچھ تاریکی میں تھا۔ درمیانی کڑیاں غائب تھیں۔ ان کڑیوں کو جوڑنے کی صورت صرف یہی تھی کہ میں اس سلسلے میں سریتا سے استفسار کرتا۔ اس استفسار کی ضرورت یوں بھی تھی کہ اس شخص نے سریتا سے ایک ایسی بات بھی پوچھی تھی جو مجھے کھٹک گئی تھی۔ اس کے یہ الفاظ اب میرے کانوں میں گونج رہے تھے کہ کہیں اس شیخ کے بچے نے تجھے خراب تو نہیں کر دیا! اگر اس نے ایسا کیا ہے تو پھر وہ میرے انتقام سے نہیں بچ سکے گا۔ یہ صورت حال بہرحال میرے لیے تشویش ناک تھی۔ پھر میرے لیے یہ بات بھی ایک معما تھی کہ میری موجودگی کو محسوس کر کے وہ وہاں مزید کیوں نہیں ٹھہرا' میری طرف کیوں لپکا؟

بیٹھے بٹھائے خواہ مخواہ میرا ایک دشمن پیدا ہو گیا تھا اور اگر میرے اندازے درست تھے تو وہ دشمن میرے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا' خصوصاً" ایسی صورت میں جب کہ میرا عمل ابھی پورا نہیں ہوا تھا۔ اگر ہمزاد دوبارہ میرے قابو میں آ جاتا تو یقیناً میں اس سے نمٹ سکتا تھا' مجھے اس کی طرف سے خوف زدہ ہونے کی اتنی ضرورت نہیں تھی' مگر فی الحال صورت مختلف تھی۔ اسی دوران میں فجر کا وقت ہو گیا۔ میں نے نماز پڑھی اور پھر ہلکا سا ناشتا کر کے سونے کو لیٹ گیا۔ سریتا سے گفتگو کو میں نے سو کر اٹھنے تک موقوف کر دیا تھا۔ میں ابھی لیٹا ہی تھا کہ ارشاد علی نے ڈاکٹر امتیاز کے آنے کی اطلاع دی۔ وہ میری ہدایت پر صبح ہی صبح آ جاتا تھا تاکہ میری نیند خراب نہ ہو وہ ڈریسنگ کر کے چلا گیا تو مجھے سونے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ رات بھر جاگ کر یوں بھی جلد ہی نیند آ جاتی ہے۔

دوپہر کو سو کر اٹھنے کے بعد حسب معمول میں نے نہایا' لباس تبدیل کیا' نماز پڑھی' کھانا کھایا' پھر کچھ دیر آرام کیا' اس کے بعد ارشاد علی کو بلایا۔ ارشاد علی کیوں کہ رات کے وقت کمرے کے دروازے پر متعین رہتا تھا اس لیے اس نے اپنے معمولات بھی وہی رکھے تھے جو میرے تھے۔ وہ نہایت خدمت گزار اور فرماں بردار تھا اور میں اسے خدمت گزاری کا پورا صلہ بھی دیتا تھا۔ آواز دینے کے بعد وہ فوراً" ہی اندر آ گیا۔

"ذرا سریتا کو بلا کر لاؤ۔" میں نے اسے حکم دیا۔

"جی.... جی.... جناب!" وہ کچھ متعجب سا ہو کر بولا اور پھر مڑ گیا۔ اسے کے تعجب کی وجہ رہی ہو گی کہ میں نے خود ہی پہلے اسے یہ حکم دیا تھا کہ کسی بھی ملازمہ کو میرے کمرے میں داخل نہ ہونے دے۔ اسی سبب میرے کمرے کی صفائی بھی ان دنوں وہی کرتا تھا۔

کچھ دیر بعد ارشاد علی پھر کمرے میں داخل ہوا' مگر اس کے ساتھ سریتا نہیں تھی۔ اس کے کچھ بولنے سے پہلے میں ہی پوچھ بیٹھا۔ "سریتا نہیں آئی؟"

"وہ تیز بخار میں تپ رہی ہے جناب' اور اس قابل نہیں کہ اپنے پیروں پر چل کر یہاں آ سکے۔" اس نے جواب دیا۔

"بخار میں تپ رہی ہے!" میں بڑبڑایا' پھر بولا۔ "اس کے لیے کوئی دوا لے کر آیا؟"

"یہ.... یہ میں نہیں پوچھ سکا جناب!"

"ٹھیک ہے' میں خود اس کے کمرے میں جا کر اسے دیکھتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں' بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

پھر جلد ہی میں' سریتا کے کمرے میں پہنچ گیا۔ اسے واقعی تیز بخار تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر بستر سے اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔

"لیٹی رہو!" میں بولا اور پھر سب سے پہلے اس سے دوا کے بارے میں پوچھا۔

"جی صاحب منگالی تھی' حال کہہ کے" وہ بولی۔

"پی بھی یا نہیں؟" میں نے سوال کیا۔ میرے لہجے میں محبت تھی۔ دراز قد اور نازک سی وہ لڑکی مجھے حقیقتاً بہت پسند تھی۔ اس کا "صاحب جی" کہنا تو مجھے اور بھی اچھا لگتا تھا۔ بڑا بھولپن ہوتا تھا' اس کی آواز میں!

"دو خوراک پی ہے پر ابھی کوئی فرق نہیں پڑا صاحب جی!" اس نے میرے سوال کا جواب دیا۔ شہر میں اتنے دن رہ کر وہ بڑی صاف اردو بولنے لگی تھی۔ اس کی وجہ میری صحبت ہی تھی کیوں کہ میں اسے ٹوکتا رہتا تھا۔

اس وقت کمرے میں میرے اور اس کے سوا کوئی نہیں تھا' پھر بھی میں نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔ جب میں پلٹا تو وہ مجھے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

میں اس بار اسی کے بستر پر بیٹھ گیا اور پھر گفتگو شروع کی "مجھے معلوم ہے سریتا کہ تمہیں بخار کیوں آ گیا ہے! تم یقیناً اس عجیب واقعے سے خوف زدہ ہو گئی ہو جو تمہیں صبح ہونے سے کچھ پہلے پیش آیا تھا۔ مجھے ابھی تک تمہارے چہرے پر خوف نظر آ رہا ہے۔"

خوف!... نہیں تو صاحب جی! میں خوف زدہ نہیں ہوں؟ وہ حیران سی ہو کر بولی۔
"آپ کس واقعے کا ذکر کر رہے ہیں؟ مجھے تو کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔"

"مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ سریتا! مجھے سب معلوم ہو چکا ہے" میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"کیا صاحب جی؟... میں تو کچھ نہیں سمجھی۔" وہ بڑی معصومیت سے بولی۔

"سنو اس نے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "تم میری ہو اور میری ہی رہو گی۔ تمہاری حفاظت کی ذمے داری بھی میری ہے۔ وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

"مگر کون صاحب جی؟" اس کے لہجے میں اب بھی حیرت تھی۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ جھوٹ بولتے ہوئے بھی وہ اتنی معصوم کیوں نظر آ رہی ہے!

"تمہیں یقیناً یہ خبر نہیں ہو گی کہ جب وہ تمہارے کمرے میں تھا تو میں نے اس کی گفتگو سن لی تھی۔"

"کس کی گفتگو صاحب جی؟ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میرے سمجھ میں تو بھگوان کی قسم کچھ بھی نہیں آ رہا۔" وہ زچ سی ہو کر بولی۔

اب مجھے اس پر غصہ آنے لگا۔ "تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہا یا تم سمجھنا نہیں چاہتیں!" میرے لہجے میں ہلکی سی سختی تھی۔

"آپ اس طرح ناراض ہو کر تو بات نہ کریں صاحب جی! آپ بتائیں تو سہی کہ آخر بات کیا ہے! یقیناً آپ کو میری طرف سے کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔ مجھ پر شک ہو گیا ہے آپ کو! یقین کریں صاحب جی، میرے کمرے میں کوئی نہیں تھا۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ "کیا آپ... آپ کو صاحب جی مجھ پر بھروسا نہیں؟ آپ... آپ کے سوا صاحب جی میں نے کسی دوسرے مرد کا منہ نہیں دیکھا۔"

"تم غلط سمجھ رہی ہو سریتا!" میں نے اپنا لہجہ بدل دیا۔ "میں تم پر کوئی الزام نہیں لگا رہا۔ مجھے معلوم ہے کہ تم اس سے نفرت کرتی ہو اور اپنے کانوں سے اس کی وجہ بھی سن چکا ہوں۔ تم اسی لیے اس سے نفرت کرتی ہو، نا کہ اس نے تمہارے محبوب کو قتل کر دیا تھا! یہی بات چھپائی ہے نا؟"

"میرے... محبوب کو... اس نے قتل کر دیا تھا۔" اس کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔ پھر وہ مجھے حیران حیران سی نظروں سے دیکھنے لگی اور اس کے ہونٹ اس طرح کانپنے لگے جیسے کچھ کہنا

چاہتی ہو۔

"ہاں ہاں، کہو کہو! ڈرو مت!" میں نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔

"مگر یہ بات... اس بات کو تو برسوں بیت گئے اور... اور میں نے اس کا ذکر بھی کبھی کسی سے نہیں کیا۔ پھر... پھر..." اس کا انداز اب بھی خود کلامی کا سا تھا۔ "پھر کسی کو صاحب جی کو کیسے یہ بات معلوم ہو گئی" شنکر وہ اسے تو میں... میں نے بھول جانا چاہا تھا، پھر... پھر..."

"اور شمبھو کے بارے میں کیا خیال ہے سریتا؟"

میرا یہ سوال سن کر وہ ایک دم چونک اٹھی۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں اور خود مجھے بھی اس کے اس رویے پر حیرت ہو رہی تھی۔ میں اسے بتا چکا تھا کہ سب کچھ اپنے کانوں سے سن چکا ہوں پھر اس قدر حیرت زدہ ہونے کی وجہ کیا تھی!

"آپ... صاحب جی، شمبھو کو کیسے جانتے ہیں؟" بالآخر اس کے لبوں کو حرکت ہوئی۔

"دیکھو سریتا، تمہیں بتا چکا ہوں کہ تم دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو میں نے سن لی ہے، پھر تم یہ سوال کیوں کر رہی ہو؟" اس کے بعد میں نے تفصیل کے ساتھ وہ سارا واقعہ بیان کر دیا، صرف اس میں ایک ترمیم ضرور کر دی تھی۔ اس کا سبب یہ کہ کوئی بھی مرد، عورت کے سامنے اپنی بزدلی کا اعتراف نہیں کرتا۔ میں سانپ والے معاملے کو گول کر گیا تھا ورنہ وہ مجھ سے پوچھ سکتی تھی کہ میں نے اسے خطرے میں کیوں چھوڑ دیا؟ یا اگر پوچھتی بھی نہیں تو دل میں یہ ضرور آتا کہ میں بزدل ہوں۔ میں نے اس سے صرف گفتگو سن لینے کا اقرار کیا تھا وہ بھی وہاں تک جب اسے شمبھو پر غصہ نہیں آیا تھا میرا مقصد یہ تھا کہ مجھ سے وہ تمام باتیں سن کر اور یہ جاننے کے بعد کہ مجھے سب کچھ معلوم ہو گیا ہے وہ پردہ داری سے کام نہ لے۔ میں نے اسی دوران میں یہ بات محسوس کی کہ وہ میری باتوں کو بڑی دلچسپی اور حیرت سے سن رہی تھی جیسے وہ باتیں اس کے لیے نئی ہوں۔ اگر وہ اداکاری کر رہی تھی تو یقیناً کمال درجے کی اداکاری تھی۔

میں پورا واقعہ بیان کر چکا تو اس نے شدید حیرت کا اظہار کیا اس کے چہرے پر بھی حیرت اور الجھن کے آثار تھے۔

"مجھے تو کچھ خبر نہیں صاحب جی! ہاں یہ ضرور تعجب کی بات ہے کہ میں سوئی تو بستر پر تھی، لیکن جب آنکھ کھلی تو میں زمین پر تھی۔"

"سریتا!" میرے لہجے میں سختی آ گئی۔ "کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں؟ کیا یہ غلط ہے کہ

تم کسی شنکر سے محبت کرتی تھیں؟ اور کیا یہ بھی غلط ہے کہ اسے شمبھو نے قتل کر دیا تھا؟"

"ہیں.... یہی تو مجھے حیرت ہے صاحب جی کہ.... کہ یہ باتیں سچ ہیں، مگر شمبھو.... وہ.... وہ تو رات کو میرے پاس نہیں آیا۔"

سریتا کے لہجے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہی، مگر جو کچھ میں نے دیکھا اور سنا تھا، اسے کیا کرتا! پھر یہ کہ سریتا ان باتوں کی تصدیق بھی کر رہی تھی، ماضی میں اس کے محبوب کو قتل کیا گیا تھا۔ میرا ذہن الجھ کر رہ گیا۔ سریتا کو آخر مجھے جھٹلانے کی ضرورت بھی کیا تھی!

"آپ کو شاید میری بات پر یقین نہیں آیا صاحب جی!" معاً" سریتا بول اٹھی۔ اس کے لہجے سے دکھ کا اظہار ہو رہا تھا۔ "میں نے سوچا تھا آپ کے پاس آ کر صاحب جی کہ.... کہ سب کچھ بھول جاؤں گی۔ بھلا دوں گی سب کچھ، پر شاید.... شاید میرا ماضی مجھے ایک بار پھر.... پھر میرا ماضی.... میری رُوح میں نشتر اتارنا چاہتا ہے صاحب جی!" اس کی آواز بھاری ہو گئی۔

میں اس کے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے چہرے پر وہی معصومیت اور حسن تھا جس کا میں دیوانہ تھا۔

"ٹھیک ہے سریتا!" میں نے طویل سانس لیا۔ "بھول جاؤ ان باتوں کو جو ابھی میں نے تم سے کی ہیں تم آرام کرو، میں چلتا ہوں۔"

"نہیں صاحب جی.... آپ.... ابھی نہ جائیں۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ "مجھے.... مجھے معلوم ہے کہ آپ کو میری بات پر یقین نہیں آیا۔ بھگوان کے بعد اس دھرتی پر آپ.... آپ صاحب جی، مجھے سب سے پیارے ہیں۔ میں آپ کی سوگند کھاتی ہوں صاحب جی کہ شمبھو رات کو میرے کمرے میں نہیں آیا۔" یہ کہتے ہوئے اس کی بڑی بڑی آنکھوں چھلک اٹھیں۔

"میں نے کہا نا سریتا تم سے کہ اس واقعے کو بھول جاؤ!" مجھے اس پر محبت آنے لگی "ممکن ہے بیماری کے سبب اس وقت تمہارا حافظہ کام نہ دے رہا ہو اور تمہیں بعد میں ساری باتیں یاد آ جائیں اس لیے فی الحال اپنے ذہن کو پریشان نہ کرو"

"بھگوان کرے ایسا ہی ہو۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "پھر.... پھر آپ مجھے جھوٹا تو نہیں سمجھیں گے نا صاحب جی!"

"جھوٹا تو میں تمہیں اب بھی نہیں سمجھ رہا۔ ہاں کوئی ایسی بات ضرور ہے جو اس وقت میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔"

"کیا صاحب جی؟" اس نے بڑی محبت سے پوچھا۔

"یہی سمجھ جاتا تو پھر جھگڑا کیا تھا!" میں آہستہ سے اس کی دل جوئی کے لیے ہنسا، پھر بولا "اب تو جانے دو نا!"

"ہاں ایک بات اور بتا دیں صاحب جی!"

"بولو!"

"یہ آپ نے ارشاد علی سے کہا کہ وہ.... وہ مجھے آپ کے کمرے میں نہیں آنے دیتا۔ کیا آپ نے...."

"صرف تمہارے لیے نہیں، سبھی کے لیے میں نے کہا تھا۔"

"مگر کیوں صاحب جی؟ کیا اب.... اب آپ کا جی بھر گیا ہے مجھ سے؟"

"پھر تم اپنی بات کرنے لگیں! میں نے سبھی کے لیے کہا ہے۔"

"اس کی کوئی وجہ تو ہو گی نا صاحب جی!"

"ہاں وجہ ہے۔"

"کیا؟" اس نے اپنی عادت کے مطابق بھولپن سے پوچھا۔

"کچھ دن کی بات اور ہے۔" میں نے اسے تسلی دی۔

"پھر وہی شب و روز ہوں گے جو پہلے تھے۔" ظاہر ہے کہ میں اسے اصل وجہ نہیں بتا سکتا تھا۔

پھر وہ مزید سوالات کرنے لگی کہ میں راتوں کو جاگ جاگ کر کیا اور کیوں پڑھتا ہوں، اس کے بعد مہ پارہ کی لاش کے بارے میں دریافت کرنے لگی جو اس نے بھی اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ وہ کافی دن بعد تنہائی میں مجھ سے ملی تھی اس لیے اس کے ذہن میں جو تجسس تھا، اسے دور کرنا چاہتی تھی۔

"سریتا! فی الحال مجھ سے کوئی سوال نہ کرو، میں تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دے سکوں گا۔" میں نے صاف گوئی سے کہہ دیا، پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

اس بار سریتا نے مجھے نہیں روکا اور میں اس کے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

وہاں سے اپنے کمرے میں آنے کے بعد میں نے دیوان حافظ نکالا اور اس کا مطالعہ کرنے لگا۔ حافظ کا کلام مجھے بہت پسند تھا۔ اسے پڑھ کر طبیعت میں ایک فرحت و تازگی محسوس ہونے لگتی تھی، مگر اس وقت میرا دل اس کے مطالعے میں بھی نہ لگا۔ میرا ذہن ایک بار پھر حالیہ

واقعے کی طرف منتقل ہو گیا اور میں نے دیوان بند کر کے رکھ دیا۔ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور کانوں سے سننے کے باوجود مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ سریتا مجھ سے جھوٹ بول سکتی ہے۔ وہ لڑکی ایسی نہیں تھی' لیکن اس نے سچ بولا تھا تو پھر میں اپنے مشاہدے کو کس طرح جھٹلاتا!

معاً" میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ شمبھو بہرحال پُراسرار قوتوں کا مالک تھا۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ پردہ پوشی کی خاطر اس نے سریتا کے ذہن سے اس واقعے کو کھرچ دیا ہو تاکہ سریتا کے حافظے میں یہ واقعہ ہی موجود نہ ہو اور اس سلسلے میں وہ کسی کی مدد حاصل نہ کر سکے۔ یہ بات میرے علم میں تھی کہ کسی کو ہپناٹائز کر کے اس کے ذہن میں جو بات بٹھا دی جائے' ہوش میں آنے کے بعد وہی بات ذہن میں رہتی ہے۔ کسی معمول کو یہ حکم دیا جا سکتا ہے کہ ہوش میں آنے کے بعد وہ موجودہ واقعے کو بھول جائے گا اور پھر ایسا ہی ہوتا ہے عامل اگر ٹیلی پیتھی بھی ہے تو یہ حکم ذہنی طور پر دیا جا سکتا ہے اور اگر نہیں تو زبانی وہ یہ کام انجام دے سکتا ہے۔ میرے موجودگی میں شمبھو نے سریتا کو کوئی ایسا زبانی حکم نہیں دیا تھا۔ ممکن ہے میرے وہاں سے آنے کے بعد اس نے ایسا کیا ہو یا پھر یہ کہ وہ ٹیلی پیتھی بھی ہو۔ یہ ناممکن بات بہرحال نہیں تھی۔ اگر میرے مفروضیات درست تھے تو اس معاملے میں کوئی پیچ نہیں تھا۔ اس معاملے پر سوچ بچار سے یہ ضرور ہوا کہ میرا ذہن ایک نتیجے تک پہنچ گیا اور اس سے مجھے سکون محسوس ہوا' مگر شمبھو کا معاملہ اپنی جگہ تھا۔ وہ بہرحال میرے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ وہ ایک ایسا مجسم خطرہ تھا جسے اب تک میں نے آنکھوں سے دیکھا بھی نہیں تھا۔

عمل کا ورد کر کے اور آئینہ بینی سے فارغ ہو کر جب میں آئندہ شب اپنے کمرے سے نکلا تو بہت چوکنا تھا۔ میں حسب معمول چوراہے پر روٹی رکھنے جا رہا تھا۔ صدر دروازے تک پہنچنے کے لیے مجھے اسی راہداری سے گزرنا تھا جس میں سریتا کا کمرا تھا میں محتاط انداز میں قدم اٹھاتا ہوا اس راہداری تک پہنچا اور غیر ارادی طور پر میرے نظر کمرے کی طرف اٹھ گئی۔ یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ آج کمرے میں تاریکی تھی۔ ابھی میں چند ہی قدم آگے بڑھا تھا کہ مجھے اپنے پیروں کے قریب سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ وہاں نیم تاریکی تھی۔ راہداری میں کم پاور کا ایک بلب روشن تو ضرور تھا مگر اس جگہ سے کافی فاصلے پر' جہاں میں تھا۔ سرسراہٹ محسوس کرتے ہی میرے اعصاب تن گئے اور میں نے غور سے فرش کا جائزہ لیا۔ دوسرے ہی لمحے میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ مجھے اپنے پیروں کے قریب ایک سانپ نظر آیا اور پھر وہ سانپ تیزی کے ساتھ میرے دونوں پیروں سے لپٹ گیا۔ اب میرے لیے قدم اٹھانا دوبھر

تھا۔ چند ہی لمحوں میں میرا جسم پسینے پسینے ہو گیا۔ سانپ کی گرفت اتنی سخت تھی کہ جیسے میرے پیروں کو کسی نے مضبوط رسی سے باندھ دیا ہو۔ یقیناً وہی سانپ تھا جو میں نے گزشتہ شب دیکھا تھا۔ اس کا رنگ بھی سیاہ تھا اور آنکھیں بھی غیر معمولی طور پر بڑی تھیں۔ اسی کو میں نے سریتا کے کمرے میں بھی دیکھا تھا۔

مجھے نہیں معلوم' کیسے میرے ذہن میں یہ بات آ گئی کہ اس ابتلا سے بچنے کے لیے ہمزاد کے عمل کا ورد کرنا چاہیے! شاید اس کا سبب یہ ہو کہ عموماً" کٹھن لمحات میں ہمزاد ہی کی مجھے یاد آتی تھی اور وہیں ہمیشہ میری مدد کرتا تھا' مگر اس وقت ہمزاد میرے قابو میں نہیں تھا۔ غالباً" اسی لیے میری توجہ ہمزاد کے عمل کی طرف مبذول ہو گئی۔ عمل کے یہ وہی الفاظ تھے جو میں حصار میں بیٹھ کر پڑھتا تھا۔ چوراہے پر روٹی رکھ کر واپس آنے تک بہرحال عمل کا وقت تھا۔ اس دوران میں مجھ پر کوئی سحر اثر انداز نہیں ہو سکتا تھا' شرط صرف یہ تھی کہ میں اپنے ہوش و حواس برقرار رکھتا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ سحر کے سوا کچھ نہیں۔

پھر یوں ہوا کہ ادھر میری زبان سے عمل کے الفاظ ادا ہوئے' ادھر سانپ کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی۔ میں عمل کا ورد کرتا رہا اور چند ہی لمحوں میں میرے دونوں پیر اس کی گرفت سے قطعی آزاد ہو گئے۔ اچانک میری سماعت سے ایک تیز پھنکار ٹکرائی اور پھر میں نے اس سانپ کو تیزی سے ایک جانب رینگتے دیکھا۔

میں وہاں مزید رکے بغیر آگے بڑھ گیا۔ احتیاطاً" اب بھی زیر لب میں عمل کا ورد کر رہا تھا کہ کہیں وہ دوبارہ مجھ پر حملہ نہ کر دے!

روٹی رکھ کر واپس آتے ہی جب میں نے کوٹھی کے گیٹ میں قدم رکھا تو میرے اعصاب ایک تیز نسوانی چیخ سن کر جھنجھنا اٹھے۔ میں تیزی سے عمارت کی طرف دوڑا۔ چیخیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں جیسے کوئی انتہائی کرب کے عالم میں چیخ رہا ہو۔

دوڑتے ہوئے میں نے سمت کا اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ چیخیں کدھر سے آ رہی ہیں چیخنے والی یقیناً سریتا ہی تھی۔ میں نے اس کی آواز پہچان لی تھی۔ خطرے کا احساس ہونے کے باوجود نہ معلوم وہ کون سی قوت تھی جو مجھے دوڑنے پر مجبور کر رہی تھی!

میں دوڑتا ہوا وہاں پہنچا تو سریتا کے کمرے کا دروازہ بند تھا' البتہ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اپنے سانس کو قابو میں رکھتے ہوئے میں نے کھڑکی سے اندر جھانکا۔ وہ منظر اتنا ہی اذیت ناک اور حیران کن تھا کہ چند لمحے کو میں گم صم کھڑا رہ گیا۔

سریتا فرش پر پڑی تھی اور وہی سانپ اسے بار بار ڈس رہا تھا۔ سانپ کا ہدف سریتا کے

رخسار و لب تھے۔ کبھی وہ سریتا کے ہونٹوں پر پھن مارتا کبھی رخساروں کو نشانہ بناتا۔ سریتا کے چہرے کی جلد نیلی پڑ گئی تھی اور وہ مجھے بڑی عجیب نظر آ رہی تھی۔ سانپ کی آنکھوں سے نکلنے والی سرخ روشنی اس کے نیلے چہرے پر مرکوز تھی۔ اب سریتا کی چیخیں دم توڑتی جا رہی تھیں مجھے یقین تھا کہ میرے علاوہ کم از کم ارشاد علی نے وہ چیخیں ضرور سنی ہوں گی۔ پھر وہ اس طرف کیوں نہیں آیا؟ کوئی اور نہیں تو ارشاد علی یقیناً اس وقت بیدار تھا کیوں کہ وہ مجھے ناشتا کرانے کے بعد سوتا تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کروں تو کیا کروں! میری عقل جیسے گم ہو کر رہ گئی تھی۔ پھر معاً یاد آیا کہ ہمزاد کے عمل کے ورد سے میں اسکو ایک مرتبہ زیر کر چکا ہوں اور یہ اب سے کچھ دیر پہلے ہی کی بات تھی جب وہ میرے پیروں سے لپٹ گیا تھا۔ اس وقت میرے ذہن کے کسی گوشے میں یہ بات نہیں تھی کہ اب عمل کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ عمل کے الفاظ میرے زبان پر آ گئے، مگر اس بار کچھ نہ ہوا۔ ہاں میں نے اتنا ضرور محسوس کیا کہ اب وہ سانپ میری طرف متوجہ ہو چکا ہے۔ یہ دیکھ کر خوف کی ایک لہر سی میرے سارے جسم میں دوڑ گئی۔ دوسرے ہی لمحے سانپ کی آنکھوں سے شعلے سے لپکے۔ میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میری آنکھیں گویا اس کی آنکھوں سے ملی ہوئی تھیں۔ مجھے ایک جھٹکا سا لگا اور پھر جیسے میں ساکت ہو گیا۔ سریتا کے کمرے میں جو عجیب سی غیر مانوس روشنی تھی اچانک غائب ہو گئی اور ہر طرف تاریکی پھیل گئی۔

میں نے اپنے اعصاب پر شدید بوجھ محسوس کیا۔ خوف کے سبب میں نے وہاں سے بھاگ جانا چاہا، مگر اپنے جسم کو حرکت نہ دے سکا۔ مجھے علم تھا کہ عموماً خوف کی زیادتی میں بھی ایسا ہوتا ہے، مگر میرے جسم کا حرکت نہ کرنا کسی اور ہی سبب تھا۔ اس کا سبب غالباً سانپ کی آنکھوں سے نکلنے والی وہ سرخ روشنی تھی جو براہِ راست میرے آنکھوں پر پڑی تھی۔ میں اس عالم میں سوچ سکتا تھا، دیکھ اور سن سکتا تھا مگر اپنے جسم کو حرکت دینے سے قاصر تھا۔ میں اس وقت یہ سوچ رہا تھا کہ سریتا یقیناً ختم ہو چکی ہے کیوں کہ کمرے میں اب مکمل سکوت تھا۔

پھر نہ معلوم کتنی دیر میں اس حال میں رہا! میں چونکا اس وقت جب میں نے راہداری میں کسی کے قدموں کی چاپ سنی۔ غیر ارادی طور پر میں نے اس طرف مڑ کر دیکھا اور اس بار میرا جسم حرکت کرنے سے قاصر نہیں تھا، گویا اب میں سحر کے اثر سے آزاد ہو چکا تھا۔

سامنے سے آنے والا ارشاد علی تھا۔ میرا خوف اب خاصا کم ہو چکا تھا اور یوں بھی ایک سے دو ہوں تو زیادہ خوف نہیں رہتا۔

"تم کہاں تھے؟" میں نے ارشاد علی سے سوال کیا۔

"آپ کے کمرے کے دروازے پر جناب!" اس نے جواب دیا، پھر خود ہی بتانے لگا۔

"یہ وقت آپ کے لیے ناشتا بنانے کا ہوتا ہے، میں ناشتا بنانے جا رہا تھا۔"

"تم نے سریتا کی چیخیں سنی تھیں؟" میں نے اس سے دریافت کیا۔

"چیخیں!" وہ حیرت سے بولا۔ "نہیں جناب!"

مجھے اس کا جواب سن کر حیرت ہوئی۔ جب مجھے سریتا کی چیخیں کوٹھی میں داخل ہوتے ہی سنائی دینے لگی تھیں اور جب کہ میں اس کے کمرے سے کافی دور تھا تو پھر ارشاد علی کو کیوں وہ چیخیں سنائی نہیں دی تھیں؟ میں سوچنے لگا۔ مجھے یہ بھی یقین تھا کہ ارشاد علی مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔

"سنو!" معاً کچھ سوچتے ہوئے میں نے ارشاد علی کو مخاطب کیا۔ "تم کھڑکی کے راستے سریتا کے کمرے میں جا کر اندر سے دروازہ کھول دو! اور ہاں کمرے کا بلب بھی روشن کر دینا۔"

"جی.... جی جناب!" اس نے قدرے حیرت سے میری طرف دیکھا اور پھر آگے بڑھا۔ شاید اس کے ذہن میں یہ ہوگا کہ کمرے کا دروزہ دستک دے کر بھی کھلوایا جا سکتا تھا، مگر اسے کیا خبر تھی کہ کمرے کا دروازہ کھولنے والی اب اس دنیا سے رخصت ہو چکی ہے۔

میں ایک طرف ہٹ گیا اور ارشاد علی میری ہدایت پر عمل کرنے لگا۔ وہ کھڑکی کے راستے اندر کود گیا اور پھر چند لمحے بعد ہی کمرے میں روشنی ہو گئی۔ اس کے بعد ارشاد علی اندر سے دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ اس کے چہرے پر حیرت کے آثار تھے۔

میں لپک کر کمرے کے دروازے تک پہنچا، مگر فوری طور پر اندر داخل نہیں ہوا۔ میں نے سریتا کو بہ دستور فرش پر پڑا ہوا دیکھا اور میرا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے کر بھینچ دیا۔ پہلی نظر میں وہ مجھے مردہ ہی نظر آئی تھی، لیکن دوسرے ہی لمحے میں چونک اٹھا تھا۔ میں نے اس کے جسم کو خفیف سی حرکت سے سانس کی آمد و شد کو محسوس کر لیا تھا، گویا ابھی وہ زندہ تھی پھر میری توجہ اس کے چہرے کی طرف ہو گئی تو مجھے اور بھی حیرانی ہوئی۔ اس کے چہرے کا رنگ اب نیلا نہیں تھا۔ میں اس کی طرف بڑھا اور قریب جا کر پھر اس کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے چہرے پر مجھے کوئی نشان بھی نظر نہیں آیا تھا۔ میں نے جھک کر اس کا شانہ ہلایا اور پھر اسے آواز دی۔ ارشاد علی بھی اب میرے قریب آ کر کھڑا ہوا تھا۔ آواز دینے اور جھنجھوڑنے کے باوجود بھی وہ بیدار نہیں ہوئی۔

میں ارشاد علی کی طرف پلٹا اور کہا۔ "تم اسے اٹھا کر بستر پر ڈال دو۔" پھر میں نے مزید

حکم دیا۔ "اس کے بعد تم کمرے کی بتی بجھا کر دروازہ باہر سے بھیڑ کر، میرے لیے ناشتا بنا کے
لے آنا۔ یہ کہہ کر اپنے کمرے میں آ کر میں نے لباس تبدیل کیا اور وضو کے بعد فجر کی نماز
پڑھی۔ پھر ارشاد علی ناشتا لے آیا۔ عموماً" وہ ناشتا دے کر کمرے سے باہر چلا جاتا تھا، مگر اس
وقت ایسا نہیں ہوا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے اس کی طرف نگاہ اٹھائی۔ اس کے چہرے سے تجسس کا اظہار
ہو رہا تھا۔

"سریتا... اسے کیا ہوا جناب؟ وہ... وہ جاگ کیوں نہیں رہی؟ اور آپ نے مجھ سے
اسکی چیخوں کے بارے میں"

"ارشاد علی!" میں نے سختی کے ساتھ اس کی بات کاٹ دی۔ "اپنے کام سے کام رکھو
اور ان باتوں میں اپنا دماغ نہ لڑاؤ! سمجھ گئے!"

"جی... جی جناب، سمجھ... سمجھ گیا" وہ سر ہلانے لگا اور پھر کمرے سے نکل گیا۔

مجھے یہ جان کر یقیناً خوشی ہوئی تھی کہ سریتا زندہ تھی، لیکن ابھی میری فکر اس کی
طرف سے کم نہیں ہوئی تھی۔ آواز دینے اور جھنجھوڑنے کے باوجود اس کا بیدار نہ ہونا میری
سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

میں نے ناشتا کر لیا تو ارشاد علی برتن اٹھا لے گیا۔ اب صبح ہو چکی تھی اور میں ایک بار
پھر سریتا کے کمرے میں جانا چاہتا تھا، مگر اس سے پہلے ڈاکٹر امتیاز آ گیا۔ جب وہ میرے گردن کے
زخم کی ڈریسنگ کر رہا تھا تو کہنے لگا۔ "شیخ صاحب! حیرت ہے کہ اب تک زخم جوں کا توں ہے
ذرا بھی نہیں بھرا۔"

میں اس کی بات کا کیا جواب دیتا، صرف ہوں ہاں کر کے رہ گیا۔

"تقریباً" ایک مہینہ ہو گیا۔ کچھ تو فرق پڑنا چاہیے تھا۔" ڈاکٹر پھر بولا۔

"آپ اپنا کام کیے جائیں، شفا دینا اللہ کے اختیار میں ہے" میں نے بات کو ٹالنے کے
لیے کہا۔ ظاہر ہے کہ میں اس سے یہ تو کہہ نہیں سکتا تھا کہ جب تک عمل پورا نہیں ہو جائے
گا، یہی حال رہے گا، ڈریسنگ تو محض اس حصے کو سن رکھنے کے لیے کرائی جا رہی تھی۔

"ہاں یہ تو ہے" ڈاکٹر امتیاز میری بات کے جواب میں بولا، پھر پوچھا۔ "آپ دوائیں تو
وقت پر رکھا رہے ہیں؟"

"بالکل" میں نے کہا۔ "میں اس معاملے میں کوتاہی نہیں کرتا۔" پھر جانے کیسے میری
زبان پر دل کی بات آ گئی۔ "بس کچھ روز کی بات اور ہے ڈاکٹر صاحب! انشاء اللہ آپ مجھے

صحت یاب دیکھیں گے۔"

"آپ کے یقین اور خود اعتمادی حیرت انگیز ہے شیخ صاحب!" وہ بولا اسی خود اعتمادی
سے آپ نے بیماری کو شکست دے رکھی ہے۔"

"ہاں شاید یہی وجہ ہے۔ میں زندگی سے کبھی مایوس نہیں ہوا۔" میں نے بڑے اعتماد
سے کہا۔

اس دوران میں وہ ڈریسنگ کر چکا تھا۔ ڈریسنگ سے کم از کم یہ فائدہ ضرور تھا کہ میں
انتہائی شدید جسمانی کرب و اذیت سے بچ گیا تھا جو یقیناً میرے لیے ناقابل برداشت تھی۔

ڈاکٹر امتیاز کے جانے کے بعد میں کمرے سے نکلا۔ ہرچند کہ یہ میرے سونے کا وقت
تھا مگر سریتا کی طرف سے میں بہت فکر مند تھا۔ مجھے اس کی طرف سے تسلی ہو جاتی تو پھر سکون
سے سوتا۔

کمرے کا دروازہ مجھے بند نہیں ملا، اس کا مطلب یہی تھا کہ سریتا اب تک اسی حال میں
تھی۔ میں نے اندر داخل ہو کر دیکھا تو وہ اب تک بے سدھ پڑی تھی۔

"سریتا!... سریتا!" میں نے بستر کے قریب پہنچ کر اسے آواز دی۔

"اوں... ہوں!"

اس کی آواز سن کر میرا دل خوشی سے دھڑک اٹھا۔ میں نے تیزی سے جھک کر اسے
جھنجھوڑ دیا۔

"ہوں... ہوں! کیا ہے؟... کیا ہوا؟" وہ آنکھیں کھولتے ہی حیرت سے بولی۔ اس کی
حسین آنکھوں میں سرخ سرخ ڈورے تیر رہے تھے۔ "صاحب جی! آپ... آپ!" وہ ایک دم
اٹھ بیٹھی اور پھر دونوں ہاتھ اٹھا کر بڑی توبہ شکن انگڑائی لی۔ اس کا نازک سا جسم کسی کمان کی
طرح کھینچ گیا تھا اور اس کمان سے نکلے ہوئے تیر میرے سینے میں ترازو ہو گئے تھے۔

میرے جذبات کی دنیا زیر و زبر ہونے لگی۔ میں نے محسوس کیا اگر اس وقت مزید وہاں
ٹھہرا تو شاید خود پر قابو نہیں رکھ سکوں گا اور یہ انتہائی خطرناک بات تھی۔ یہ سوچتے ہی میں پلٹا
اور پھر تیزی کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھا۔

"صاحب جی! کیا ہوا؟" اس نے مجھے آواز دی۔

میں اسے کیا بتاتا کہ کیا ہوا! "کچھ نہیں۔ میں بس تمہیں دیکھنے آیا تھا کہ تمہارا بخار
اترا یا نہیں!" میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر رک کر کہا۔

"تو... تو بیٹھیں نا صاحب جی!" اس کی دل کش آواز مجھے جیسے اپنی طرف کھینچے گی۔

"نہیں، اب میں چلوں گا، میرے سونے کا وقت ہے۔" یہ کہہ کر میں اسے مزید کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر کمرے سے نکل آیا۔

میرے جذبات کا ہیجان اب بھی کم نہیں ہوا تھا۔ رہ رہ کر میری آنکھوں میں وہ منظر گھوم رہا تھا جب اس نے ہاتھ اٹھا کر انگڑائی لی تھی۔ پھر اور بہت سے منظر یاد آنے لگے جو اس کی اور میر خلوتوں کے امین تھے۔ میری حالت ایک ایسے شخص کی تھی جو دریا کنارے پیاسا کھڑا ہوا۔ اپنے کمرے کی طرف تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے مجھے یگانہ چینگیزی کا ایک شعر یاد آنے لگا جو میرے حسب حال تھا۔

بندہ وہ بندہ جو دم نہ مارے
پیاسا کھڑا ہو دریا کنارے

جذباتی ہیجان میں مبتلا ہونے کا بڑا سبب یہ تھا کہ ان دونوں ہمزاد کے عمل کی وجہ سے مدح لب و عارض سے کنارہ کشی کر لی تھی ورنہ اپنی جنوں خیزیاں تو مثال تھیں کون ایسا ماہ رو ہو گیا جو نظر میں چڑھ کر نظر سے چھپ گیا ہو اور میں نے اس کے حضور میں حدیثِ عشق نہ کہی ہو۔ اگر میرا یہ حال نہ ہوتا تو شاید میں ابھی کچھ اور سریتا کے پاس رکتا۔ میں کبھی کبھی اسے از رہ تفنن طبع بنگال کا بولتا جادو بھی کہتا تھا۔ جادو وہ جو سر پر چڑھ کر بولے اور اول اول ایسا ہی ہوا تھا۔ اس جادو سے میں نے اپنی خلوتوں کو بہت آباد کیا تھا، اتنا کہ طبیعت سیراب ہو گئی تھی، مگر پھر یہ آج مجھے کیا ہو گیا تھا؟ میں اپنے کمرے میں بستر پر دراز ہو کر اسی سوال کا جواب تلاش کر رہا تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ تو وہی تھی جو میں ابھی بیان کر چکا ہوں، یعنی بہ وجوہ دانستہ گریز اور دوسری وجہ تشنگی اور اس لمحے کا جادو تھا۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ پڑھی ہوئی کہانیاں اور بار بار سنے ہوئے شعر بھی اچھے لگتے ہیں، اتنے اچھے کہ آدمی جھومنے لگے۔

میں کچھ دیر وہاں اور ٹھہر گیا ہوتا تو یقیناً سریتا سے یہ ضرور پوچھتا کہ کیا آج رات کی بھی کوئی بات اس کے حافظے میں نہیں۔ مگر مجھے کم ہی یقین تھا کہ اسے کچھ یاد ہوتا۔ میں اپنی آنکھوں میں ایک دیکھے ہوئے خواب کی حسرت لیے سو گیا، سریتا ایک دیکھا ہوا خواب ہی تھی اور اس خواب کے رنگ بارہا میرے وجود کو اپنی پناہ میں لے چکے تھے۔

اس روز دوبارہ میں، سریتا سے نہیں ملا۔ ہاں مجھے اس کی طرف سے فکر ضرور تھی کہ آنے والی رات کے دامن میں اس مجبور اور بے بس لڑکی کے لیے جانے کتنے عذاب ہوں۔ مجھے شمبھو سے سخت نفرت محسوس ہو رہی تھی جو اس عذاب کا ذمے دار تھا۔ میرے نزدیک وہ خام کاروں میں سے تھا۔ عشق تو ایثار اور محبت کا گداز ہوتا ہے، اس میں آزار کہاں، اگر شمبھو

کو واقعی سریتا سے عشق ہوتا تو وہ اسے اذیت نہ پہنچاتا، اتنی اذیت کہ سریتا چیخ اٹھتی یقیناً یہ ظلم تھا۔ میری بدقسمتی یہ تھی کہ فی الحال شمبھو کے ظلم سے سریتا کو بچانے کا کوئی راستہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

رات کو کھانا کھا کر عموماً میں ٹہلتا تھا۔ اس رات ٹہلتے ہوئے بھی میں سریتا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ سریتا میرے گھر کی چار دیواری میں تھی، وہ میری پناہ میں تھی۔ اس کی حفاظت میری ذمے داری تھی۔ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ اس سوال کے جواب کی تلاش میں میرے قدم جیسے خود بہ خود سریتا کے کمرے کی طرف اٹھنے لگے۔ ابھی تو مجھے شمبھو کی دشمنی کا واضح سبب بھی معلوم نہیں تھا۔ ممکن ہے کہ مجھے سریتا کے ماضی کا کچھ علم ہو جاتا تو شاید میں کوئی راہ نکال سکتا۔

میں وہاں پہنچا تو اس کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ بتی جل رہی تھی، مگر وہ کمرے میں نہیں تھی۔ میں نے کمرے سے نکل کر اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی تو مجھے ایک ملازم نظر آ گیا۔ وہ باورچی خانے سے نکل رہا تھا۔ میں نے اسے آواز دے کر اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس راہداری سے باورچی خانے کا دروازہ نظر آتا تھا۔ ملازم قریب آ گیا تو میں نے اس سے سریتا کے بارے میں پوچھا۔

"میں نے اسے نہیں دیکھا جناب۔" ملازم نے ادب سے جواب دیا، پھر بولا۔ "شاید رکمنی کے کمرے میں ہو۔" رکمنی بھی میری ایک ملازمہ ہی کا نام تھا۔ میں اپنی ملازماؤں کو ملازمائیں بنا کر نہیں مالکائیں بنا کر رکھتا تھا۔ اسی لیے انہیں الگ الگ کمرے دے رکھے تھے اور حقیقتاً وہ تھیں بھی میرے دل کی مالکائیں۔

"تم اسے دیکھ کر آؤ۔" "میں یہاں اندر کمرے میں اس کا انتظار کر رہا ہوں۔" میں نے ملازم سے کہا اور پھر سریتا کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

جانے کیوں اندر پہنچ کر مجھے وحشت سی ہونے لگی۔ مجھے اعصاب پر ایک بوجھ سا محسوس ہوا، ایسا ہی بوجھ جس کا تجربہ پہلے بھی دو بار ہو چکا تھا۔ میں نے چوکنا انداز میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی، مگر مجھے وہاں کوئی غیر معمولی چیز نظر نہیں آئی۔ ذرا ہی دیر میں طبیعت پر اتنی وحشت سوار ہوئی کہ میرا بیٹھنا دوبھر ہو گیا۔ مجبوراً میں اٹھ کھڑا ہوا۔

ابھی میں دروازے تک پہنچا تھا کہ سریتا تیز تیز قدم اٹھاتی آتی دکھائی دی۔ اس نے دھانی رنگ کی ساڑھی باندھ رکھی تھی۔

"صاحب جی! معاف کرنا، مجھے خبر نہیں تھی کہ آپ....." وہ یہ کہتے ہوئے قریب

آ گئی۔

"کوئی بات نہیں۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "میرے ساتھ آؤ۔" میں یہ کہتا ہوا کمرے سے نکل آیا۔

وہ خاموشی سے میرے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ اپنی تمام ہی ملازماؤں کو میں نے بے تکلفی کے باوجود ایک خاص حد تک رکھا تھا تاکہ وہ اس بے تکلفی کا فائدہ اٹھا کر حد ادب سے تجاوز نہ کر جائیں۔ ہر چند کہ سریتا مجھے بہت عزیز تھی، مگر وہ بھی میرے اور اپنے درمیان ایک فاصلہ قائم رکھتی تھی اور میرے نزدیک یہ فاصلہ بہت ضروری تھا یہی وجہ تھی کہ وہ میرے ساتھ نہیں، پیچھے چل رہی تھی۔ اسے علم تھا کہ میں بے ادبی پسند نہیں کرتا۔ میں اسی کا نہیں سبھی ملازماؤں کا پورا خیال رکھتا تھا اور ان کے ساتھ مساوی سلوک کرتا تھا۔ میں انہیں بہتر سے بہتر خوراک، ہر طرح کا آرام و آسائش اور عمدہ سے عمدہ لباس فراہم کرتا تھا۔ کام کے وقت کے سوا ان کے جسموں پر اچھے سے اچھا لباس ہوتا اور یہاں کام تھا بھی کیا۔ اسی لیے آج تک میری کسی ملازمہ نے مجھ سے نوکری چھوڑ کر جانے کو نہیں کہا تھا۔ ان میں سے کئی کے عزیز رشتے دار بھی ملنے آتے رہتے تھے، مگر کبھی سریتا سے ملنے کوئی نہیں آیا تھا اور نہ میں نے اس سے آج تک اس سلسلے میں کچھ پوچھا تھا۔ میرا رویہ ان کے ساتھ ایسا ہی تھا۔ میں کبھی ان میں سے کسی کے ماضی کو کریدنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ میرے ان کے درمیان جو فاصلہ تھا، اس کی وجہ سے کبھی ان میں بھی یہ ہمت نہیں ہوتی تھی۔

سریتا کے کمرے سے نکل آنے کے بعد اب مجھے اپنے اعصاب پر کوئی بوجھ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میں اسے اپنے کمرے میں لے آیا پھر وہ میرے اشارے پر بیٹھ گئی تو میں نے اسے مخاطب کیا۔ "سریتا! میں نے تم سے آج تک تمہارے ماضی کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا، لیکن اب..... اب مجھے اس کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔"

"وہ..... وہ کیوں صاحب جی؟ کیا کسی نے آپ سے میرے بارے میں کچھ کہا ہے؟"

"نہیں۔" میں بولا، پھر اس کے فکر مند چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے مزید کہا۔ "کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ تم گھبرا جاؤ۔ بس میں تم سے مختصراً پوچھنا چاہتا ہوں۔"

میری بات سن کر اس نے طویل سانس لیا جیسے اس کی فکر کم ہو گئی ہو۔ پھر اس نے کہا۔ "پوچھیں صاحب جی، کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟"

"شمبھو کے بارے میں تم جو کچھ بھی جانتی ہو، مجھے تفصیل کے ساتھ بتا دو۔" میں نے کہا۔

وہ چونک اٹھی، پھر بڑبڑائی۔ "شمبھو....." پھر میری طرف دیکھ کر کہنے لگی۔ "آپ صاحب جی، کل بھی شاید اس کا ذکر کر رہے تھے، آخر مجھے بھی بتائیں کہ بات کیا ہے؟"

"دیکھو سریتا! میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "میں اگر تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں تو یقیناً اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہے جو فی الحال تمہیں بتانا مشکل ہے، تم مجھ سے سوال نہ کرو اور جو میں پوچھ رہا ہوں، اس کا جواب دو۔"

"ٹھیک ہے صاحب جی، اب میں کچھ نہیں پوچھوں گی۔" سریتا نے کہا اور پھر ٹھنڈا سانس بھر کے بولی۔ "مجھے نہیں معلوم صاحب جی کہ شمبھو ہمارے گاؤں میں کہاں سے آیا تھا! میں گاؤں کے چھوٹے سے مندر آتے جاتے اسے دیکھتی تھی۔ اس کی کٹیا، مندر کے قریب ہی تھی، کچی کٹیا۔" سریتا بتانے لگی۔ پھر وہ چند لمحے کو خاموش ہو گئی جیسے بھولی بسری یادوں کو اپنے حافظے میں تازہ کر رہی ہو۔ میں نے اس دوران میں اسے نہیں ٹوکا۔ اس کی نگاہیں بس ایک طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ ذرا دیر کے بعد وہ پھر اپنے ماضی کے اوراق پلٹنے لگی۔ "اس کی کٹیا میں اکثر بڑے جوگی یوگی اور سادھو سنت آیا جایا کرتے تھے۔ ایک بار یہ ہوا کہ میری سب سے چھوٹی بہن بیمار ہو گئی۔ میرے بابا نے بساط بھر اس کا علاج کرایا۔ وہ میری بہن کو شہر لے جاتے تھے، جیسور!! وہاں انہوں نے اسے ہسپتال میں دکھایا۔ اس کی بیماری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ جانے کس نے ایک دفعہ شمبھو کا ذکر کیا کہ اس کے پاس کچھ جڑی بوٹیاں اور دوائیں ہیں۔ وہ خود جنگل میں جا کے جڑی بوٹیاں تلاش کرتا ہے اور پھر ان سے دوائیں بناتا ہے۔ کئی لوگوں کو اس کی دوا سے فائدہ ہو چکا تھا۔ میرے بابا بہت بوڑھے تھے۔ ان سے میری بہن اٹھتی نہیں تھی۔ وہ جیسور بھی جاتے تھے تو میرے کسی بھائی کو ساتھ لے جاتے تھے۔ سو جب انہوں نے شمبھو کی کٹیا پر جانے کا فیصلہ کیا تو بہن کو گود میں لینے کے لیے مجھ سے کہا جو یوں تو آٹھ نو برس کی تھی مگر بیماری نے اسے گھلا دیا تھا۔ میں نے آسانی سے اسے اٹھا لیا کیوں کہ میں جوان تھی۔ شمبھو نے میری بہن کو دیکھا اور پھر دوا بھی دی۔ اسی دوران میں وہ بار بار میری طرف بھی دیکھتا رہا، میرے بابا کی نظر بچا کر! پھر اس نے کہا کہ بچی کو روز لانا پڑے گا۔ اس کے بعد وہ براہ راست مجھ سے مخاطب ہوا "تمہارے بابا، بوڑھے ہیں تم لے آیا کرنا اپنی بہن کو۔ میں ہامی بھرنے کے سوا کیا کرتی۔ تو اس دن سے میں اس کی کٹیا پر اپنی بہن کو لے جانے لگی۔ ایک دن اس نے میری بہن کے ماتھے اور کنپٹیوں پر جانے کیسی دوا لگائی کہ وہ اونگھنے لگی۔ وہ مجھ سے بولا کہ اسے لٹا دو، یہ دوا کا اثر ہے۔ ابھی میں اس کے لیے ایک اور دوا بنا رہا ہوں، وہ لے کر جانا۔ اس کے بعد وہ کوئی دوا کوٹنے لگا۔ پھر دوا کوٹتے کوٹتے ایک دم اٹھا اور اندر سے کٹیا کا دروازہ بند کر دیا۔ اس وقت

تک میری بہن سو چکی تھی۔ پھر.... پھر صاحب جی اس نے مجھ سے ایک ایسی بات کہی کہ میں
نے غصے سے اس کے منہ پر تھوک دیا اور پھر اپنی سوئی ہوئی بہن کو اٹھا کر وہاں سے چلی آئی۔"
یہ کہہ کر وہ ذرا رکی۔
میں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر پوچھ لیا۔ "کیا اس نے تمہیں روکنے کی کوشش نہیں
کی؟"
"ہاں کی تھی اور میری بانہہ بھی پکڑلی تھی، مگر میں نے اسے ایسا دھکا دیا کہ وہ دور
جا کے گرا۔ اس کا سر کسی چیز سے ٹکرا گیا تھا۔ پھر جب تک وہ اٹھتا، میں اس کی کٹیا سے نکل
گئی۔ ہاں میں یہ تو بتانا بھول ہی گئی کہ مجھے شنکر سے پریم تھا۔ ہم دونوں اکثر ندی کنارے ملتے
تھے۔ اس واقعے کے بعد کئی بار اس نے..... شمبھو نے مجھے اور شنکر کو اکیلے میں دیکھا تھا۔ وہ
جانے کدھر سے نکل کر اچانک ہمارے سامنے آجاتا تھا اور ہاں اس واقعے کے بعد میں کبھی
شمبھو کی کٹیا پر نہیں گئی تھی۔" سریتا کہتی رہی۔ "میں نے گھر والوں کو کچھ نہیں بتایا تھا، اور
بتاتی بھی کیسے ایسی شرم کی بات! پھر ایک روز شمبھو مجھے راستے میں مل گیا۔ اس وقت میں اکیلی
تھی۔ اس نے پھر مجھ سے وہی بے حیائی کی باتیں کیں اور کٹیا پر آنے کو کہا۔ میرے منہ میں جو
آیا، اسے سنا دیا۔ یوں بھی وہ بوڑھا تھا اور میرے بابا کی عمر کا تھا۔ جواب میں اس نے مجھے دھمکی
دی اور یہ بھی کہا کہ تو جس سے پریم کرتی ہے، وہ میری بددعا سے جلد ہی مرجائے گا۔ تو میرے
سوا کسی اور کی نہیں ہوسکتی۔ میرا تو خون کھول اٹھا صاحب جی! پھر اس سے پہلے کہ میں اس کا
اور اپنا خون ایک کرلیتی، وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا مندر کی طرف چلا گیا۔ اس دن کے بعد میں
نے شمبھو کو اس کی کٹیا کے باہر سادھوؤں کی طرح آسن جمائے بیٹھے ہوئے تپسیا کرتے دیکھا۔
میں مندر آتے جاتے اسے بھور سے اسی حال میں دیکھتی۔ پھر کچھ ہی دن بعد وہ..... وہ واقعہ
ہوگیا جس کے متعلق سن کر شنکر ہنس پڑا تھا۔ میں نے اس سے کچھ نہیں چھپایا تھا کہ شمبھو کتنا
کمینہ ہے اور اس نے مجھ سے کیا کہا ہے۔ شنکر کو پہلی بار یہ سب کچھ سن کر بہت غصہ آیا تھا
اور وہ اپنی جھونپڑی سے گنڈا سا نکال لایا تھا اور کہا تھا کہ میں ابھی شمبھو کے ٹکڑے کیے دیتا
ہوں، اس نے تجھ سے ایسی بات کہی تو کیسے کہی! بڑی مشکل سے میں نے اسے روکا تھا اور اپنے
پیار کی قسم دے کر وعدہ لیا تھا کہ وہ شمبھو سے نہیں بھڑے گا۔ پھر اس کے بعد شمبھو نے مجھے
یہ دھمکی دی تھی کہ..... کہ میرا شنکر اس کی بددعا سے مرجائے گا۔ شنکر نے یہ سن کر اسے موٹی
سی گالی دی تھی، پھر ہنسنے لگا تھا اور کہا تھا کہ وہ الو کا پٹھا کیا خود کو بھگوان کا اوتار سمجھتا ہے اور پھر
صاحب جی، وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ شنکر کو اس کی جھونپڑی میں سانپ نے ڈس لیا اور.....

اور وہ..... وہ ہمیشہ کے لیے مجھ سے بچھڑ گیا، مگر نہیں..... نہیں صاحب جی، مجھے یقین ہے کہ
شمبھو ہی نے اس کی جھونپڑی میں زہریلے سانپ کو چھوڑا ہوگا۔ یہ صدمہ میرے لیے اتنا
شدید ثابت ہوا کہ سچ مچ میں اپنے حواس کھو بیٹھی۔ پھر میں کب اور کس طرح اس پاگل پن
میں اپنے گاؤں سے نکل کر دربدر بھٹکتی رہی، مجھے کچھ یاد نہیں۔ میں کہاں گئی، کس کے پاس
رہی اور مجھ پر کیا بیتی مجھے کچھ ہوش نہ تھا۔ پھر میرے حواس واپس آئے تو میں نے خود کو ڈھاکہ
میں دیکھا۔ اسی سے مجھے معلوم ہوا کہ میں اسے سفر کے دوران میں ایک ٹرین کے ڈبے میں ملی
تھی اور یہ واقعہ پچھلے برس کا تھا۔ وہ بوڑھا بہت شریف تھا۔ اس نے مجھے اپنی بیٹی بنا لیا تھا اور
ہسپتال میں میرا علاج بھی کرایا تھا۔ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں صاحب جی! وہ غریب
ضرور تھا، پر اس کا دل امیر تھا۔ اس نے میری بپتا سنی تو اسے بڑا دکھ ہوا۔ اس نے پیسا پیسا جوڑ
کر کرائے کا بندوبست کیا اور..... اور پھر مجھے لے کر میرے گاؤں پہنچا تاکہ میرے گھر والوں
کے حوالے کردے، مگر..... مگر صاحب جی!....." اس کی آواز بھرا گئی۔
میں نے کچھ دیر اس کے بولنے کا انتظار کیا اور اس کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا۔ اس کی
پلکوں کے گوشے بھیگ گئے تھے جب وہ خاموش ہی رہی تو مجبوراً میں نے اسے ٹوکا۔
"صاحب..... صاحب جی! وہ..... وہ میرا گاؤں نہیں تھا۔" یہ کہہ کر وہ سسک اٹھی۔
"وہ تمہارا گاؤں نہیں تھا۔" میں حیرت سے بولا۔
"ہاں صاحب جی!" وہ اپنی ساری کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے کہنے لگی۔ "وہ..... وہ
جو میرا گاؤں تھا نا صاحب جی..... وہ تو پچھلے سال باڑھ میں بہہ گیا تھا اور..... اور اسی کے ساتھ
میرا گھر، میرے بابا، بھائی، ماں اور بہن سبھی کچھ بہہ گیا تھا۔ ان میں سے کسی کی لاش بھی نہیں
ملی تھی۔ اب تو وہ گاؤں میرے لیے بالکل نیا اور اجنبی تھا۔ وہاں اب اور ہی لوگ رہنے لگے
تھے، اور ہی گھر تھے وہاں کچھ بھی تو نہیں تھا وہاں! پھر اس بوڑھے نے اگر میرے سر پر باپ بن
کر ہاتھ نہ رکھا ہوتا تو شاید..... شاید صاحب جی، میں..... میں پھر پاگل ہوجاتی۔"
"تو پھر تم اپنے اس محسن کے ساتھ ڈھاکہ واپس آگئیں؟" میں نے پوچھا۔
"ہاں۔" اس نے اقرار میں سر ہلایا۔
"تمہیں یاد ہے کہ جب تم اپنے گاؤں پہنچی تھیں تو کیا وہاں شمبھو تھا؟" میں نے اپنی
دانست میں ایک اہم سوال کیا۔
"میں اپنوں کی تلاش میں وہاں گئی تھی صاحب جی، دشمنوں کی تلاش میں نہیں۔"
اس نے جواب دیا اور اس کا جواب قطعی درست تھا۔

"پھر بھی ممکن ہے کہ آتے جاتے اس پر تمہاری نظر پڑی ہو۔" میں نے کہا۔ "گاؤں کی آبادی ہی کتنی ہوتی ہے۔"

"نہیں، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔" وہ بولی۔ "اگر شمبھو وہاں رہا بھی ہو گا تو میں نے اسے نہیں دیکھا۔ جہاں تک میرا خیال ہے، وہ پاپی بھی باڑھ میں بہہ گیا ہو گا۔"

میں، سریتا کو کیسے بتاتا کہ وہ پاپی باڑھ میں نہیں بہا بلکہ ابھی زندہ تھا۔ سریتا کی اس بات سے یہ بھی ظاہر ہو گیا تھا کہ گزشتہ شب کا ہول ناک واقعہ بھی اس کے ذہن میں محفوظ نہیں ہے، مگر اس سلسلے میں کچھ دریافت کرنے سے پہلے مجھے ایک اور بات یاد آ گئی کہ ابھی اس کی داستان حیات کا آخری باب باقی ہے۔ یہی سوچ کر میں نے کہا۔ "تم اپنے محسن کے ساتھ ڈھاکہ میں تھیں تو پھر چاٹگام کب اور کیسے آ گئیں؟"

"رحیم بابا کے ساتھ ہی میں چاٹگام آئی تھی۔" اس نے بتایا۔ "ڈھاکہ میں بابا بہت پریشان تھا۔ کبھی اسے کوئی کام مل جاتا اور کبھی چھوٹ جاتا۔ اس کے کسی دوست نے اسے چاٹگام جانے کا مشورہ دیا کہ وہاں گودی میں خاصا کام ہے۔ بابا مجھے ساتھ لے کر کچھ دن کے بعد چاٹگام آ گیا وہ بوڑھا تھا اور اس سے زیادہ بوجھ نہیں اٹھتا تھا، مگر اپنے اور میرے پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے اسے بوجھ اٹھانا پڑتا تھا۔ میں اس سے بہت ضد کرتی کہ مجھے بھی وہ محنت مزدوری کرنے دے، مگر وہ نہ مانتا اور کہتا کہ جب تک باپ زندہ ہے اور اس کی بوڑھی ہڈیوں میں بوجھ اٹھانے کا دم ہے، بیٹی کو کام نہیں کرنے دے گا۔ رحیم بابا نے واقعی باپ بن کر دکھا دیا اور...... اور پھر...... پھر وہ خون تھوک تھوک کر مر گیا، میں ایک بار پھر بھری دنیا میں اکیلی رہ گئی صاحب جی، پھر میں اپنا پیٹ بھرنے کے لیے مچھلیاں بیچنے لگی۔ گودی کے قریب ہی بابا نے جھونپڑی ڈال لی تھی۔ اور ہم وہیں رہتے تھے۔ وہاں اور بھی جھونپڑیاں تھیں۔ تازہ مچھلیاں خریدنے لوگ انہی جھونپڑیوں کے قریب چھوٹے سے بازار میں آتے تھے۔ یہیں پہلی بار میری ملاقات ارشاد علی سے ہوئی اور...... اور پھر وہ مجھے یہاں لے آیا۔"

سریتا کی داستان کا آخری باب ختم ہو گیا تو میں نے طویل سانس لیا۔ ارشاد علی واقعی جوہر شناس تھا۔ مجھے یاد ہے کہ پہلی بار سریتا کو میلے کچیلے کپڑوں میں دیکھنے کے باوجود بھی میں نے پسند کر لیا تھا کیوں کہ لعل تو گدڑی میں بھی نہیں چھپتے۔ ہاں مجھے اس کے جسم سے مچھلیوں کی بو ضرور آئی تھی۔ میں نے ارشاد علی کو حکم دیا تھا کہ اسے نہانے کے لیے خوشبودار صابن دے اور اچھے کپڑوں کا بندوبست کرے۔ پھر جب خوب نہا دھو کر اور نئی ساری باندھ کر میرے پاس آئی تھی تو میں اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔ میری زمانہ شناس آنکھوں نے اسے دیکھتے ہی

بھانپ لیا تھا کہ وہ ابھی خراب نہیں کی گئی۔ ارشاد علی نے مجھے اس کے بارے میں صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ مچھلیاں بیچتی ہے۔ وہ لڑکیاں جو محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ بھرتی ہیں عموماً خراب نہیں ہوتیں ورنہ انہیں محنت مزدوری کی ضرورت ہی کیا ہے۔ مجھے علم تھا کہ ایسی لڑکیاں بہت جلد رام نہیں ہوتی انہیں بہت احتیاط، محبت اور توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کا دل محبت سے جیتا جاسکتا ہے، کسی اور طرح نہیں۔ پھر میں نے ایسا ہی کیا تھا، جلد بازی اور بے صبرا پن نہیں دکھایا تھا۔ میں نے اسے ایک گھر دیا تھا، آسائش دی تھی، عزت اور محبت دی تھی۔ ایک محروم لڑکی کو اور کیا چاہیے بھی کیا وہ اسی لیے جلد ہی مجھ پر جان چھڑکنے لگی تھی اور اب اس کی جان کو شدید خطرہ لاحق تھا۔ اس کا ماضی اسے ایک بار پھر اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ خدا جانے شمبھو کیسے زندہ رہ گیا تھا اور کس طرح اسے یہ خبر ہو گئی تھی کہ سریتا کہاں ہے؟ اب سے پہلے اسے سریتا کے بارے میں کچھ خبر کیوں نہیں ہوئی؟ یہ سوالات میرے لیے تشنہ جواب تھے۔ میں اس وقت سریتا کی داستان حیات سن کر انہی سوالوں میں الجھا ہوا تھا۔

"آپ کیا سوچنے لگے صاحب جی؟" سریتا مجھے خاموش دیکھ کر کچھ دیر بعد بولی۔

"میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، پھر کہا۔ "سریتا کل رات تم سکون سے تو سوئی تھیں؟" میں نے براہ راست وہ سوال نہیں کیا جو میرا مقصد تھا۔

"ہاں صاحب جی۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ "اب میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے، بڑے مزے کی نیند آئی تھی اور پھر میں صبح دیر سے اٹھی تھی۔ ہاں ایک بات۔" وہ رکی، پھر کہنے لگی۔ "صاحب جی! آپ کی ہدایت ہے ناکہ کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے سویا کرو، میں نے کیا تو ایسا ہی تھا، دروازہ بند کر کے ہی سوئی تھی، مگر جب اٹھی تو چٹخنی کھلی ہوئی تھی۔"

"تم رات کو چٹخنی لگانا بھول گئی ہو گی۔" میں نے دانستہ کہا حالانکہ میرے ہی کہنے پر ارشاد علی نے کھڑکی کے ذریعے اندر کود کر اس کے دروازے کی چٹخنی کھولی تھی۔ ذرا توقف کے بعد میں نے مزید کہا۔ "اور سنو سریتا، تم کھڑکی بند کر کے نہیں سوتیں؟" بات میں نے بے سبب نہیں کی تھی۔ سانپ کو میں نے کھڑکی کے ذریعے اندر کود کر اس کے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔

"مجھے گھٹن سی لگتی ہے صاحب جی! جب تک ہوا کا گزر نہ ہو، مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

"مگر کمرے میں روشن دان بھی تو ہے۔" میں بولا۔

"ہاں یہ تو میں بھول ہی گئی۔" اس نے بڑے بھولپن سے چونک کر کہا۔ "آپ کہتے

ہیں تو ہیں کھڑکی بھی بند کرلیا....."

"بالکل۔" میں نے زور دے کر کہا' پھر بولا۔ "اور اگر تم رکمنی کو بھی اپنے کمرے میں سلالیا کرو تو اور بھی اچھا ہے۔"

رکمنی کو سلالیا کروں۔" وہ حیرت سے بولی۔ "مگر کس لیے صاحب جی۔"

"اس لیے کہ ان دنوں تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ بیماری میں کسی نہ کسی کا ساتھ رہنا ضروری ہوتا ہے۔" میں نے گویا اسے سمجھایا۔

"لیکن اب تو میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے صاحب جی۔"

"ٹھیک ہے طبیعت۔" میں محبت آمیز لہجے میں ہنس کر بولا۔ چہرہ پیلا پڑ رہا ہے اور کہہ رہی ہو کہ بالکل ٹھیک ہے طبیعت"

"آپ تو بس یوں ہی ذرا ذرا بات کی فکر کرنے لگ جاتے ہیں۔ صاحب جی! خیر آپ کہتے ہیں تو بھلا میں آپ کا حکم کیسے ٹال سکتی ہوں۔" وہ مسکرانے لگی۔ اس کے چہرے پر محبت کا نور پھیل گیا تھا اور وہ مجھے بڑے نچھاور ہونے کے انداز میں دیکھنے لگی تھی۔

"اے شیخ! خطرہ! کسی نے میرے اندر جیسے سرگوشی کی۔ اس سریتا کا میرے پاس مزید رکنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میں جو جاننا چاہتا تھا' جان چکا تھا اس لیے فوراً بول اٹھا۔ "اچھا اب تم جاؤ' آرام کرو۔"

اس نے چلتے چلتے مجھے بڑی قاتل نظروں سے دیکھا' مگر میں نے اس کی طرف سے نگاہ پھیرلی۔ وہ بہرحال ایک بھرپور اور جوان لڑکی تھی۔ اس کے دل میں بھی کچھ خواہشیں تھیں۔ جنہیں میں بخوبی سمجھتا تھا' لیکن ان دنوں تو خود میری خواہشیں مصلوب تھیں۔ میں صبر کے علاوہ اور کیا کرتا۔

میری کوٹھی میں ملازماؤں کے علاوہ ملازم بھی تھے اسی لیے پوری احتیاط سے کام لیتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ میں نے اپنی تمام ملازماؤں کو سختی سے تاکید کی ہوئی تھی کہ وہ سونے سے پہلے اپنے کمروں کے دروازے اندر سے بند کرلیا کریں۔ ہرچند کہ میں نے مرد ملازمین کو خوب چھان پھٹک کر ملازم رکھا تھا اور ان میں سے اکثر بوڑھے تھے' مگر پھر بھی احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ میں چوکنا رہوں۔

سریتا سے میں نے بالواسطہ جو سوال کیا تھا کہ وہ سکون سے سوئی یا نہیں' اس کا مقصد یہی تھا کہ اگر اسے گزشتہ شب کا واقعہ یاد ہو تو بیان کردے۔ اس کا جواب اثبات میں تھا' اس کا یہی مطلب تھا کہ اسے بھی معلوم نہیں' کہ اس کے ساتھ کیا گزری ہے' اس سلسلے میں اسے

کچھ بتا کر میں پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اسی لیے ارشاد علی کو بھی ہدایت کردی تھی کہ گزشتہ شب کے واقعے کے متعلق سریتا کو نہ بتایا جائے۔

اب میرا عمل پورا ہونے میں صرف ہفتہ بھر رہ گیا تھا' گویا بس اب پلکوں کی سوئیاں اکھاڑنا رہ گئی تھیں۔ مہ پارہ کا آخری حربہ بھی میں نے ناکام بنادیا تھا کہ بلدیہ میری کوٹھی کو مسمار کرادے۔ وہ تاریخ گزر چکی تھی اور اب ری اسیسمنٹ ہو رہا تھا۔ ایڈووکیٹ چودھری نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ دس مارچ سے پہلے کوئی کارروائی نہیں ہونے دے گا۔ اس کے علاوہ نصیرالدین کے کیس کی بھی نئی تاریخ مل گئی تھی جو دس مارچ کے بعد ہی کی تھی' گویا نصیرالدین کی طرف سے اب مجھے فکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے اگر کوئی فکر تھی تو وہ بس شمبھو کی طرف سے تھی جسے ابھی میں نے دیکھا بھی نہیں تھا۔ اس ایک ہفتے کے دوران میں وہ میرے لیے کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا کرسکتا تھا۔ اس کے علاوہ مہ پارہ کی طرف سے بھی کسی نئے حملے کا خطرہ بہرحال تھا۔ میری دانست میں وہ اتنی جلدی شکست قبول کرنے والی نہیں تھی۔ مجھے اس پر حیرت تھی کہ اس کی طرف سے خاموشی کیوں ہے! مہ پارہ کی قوت و طاقت کا مجھے پورا اندازہ تھا۔ آدمی کو اگر اپنے دشمن کی قوت کا اندازہ ہو تو وہ اس سے بچنے کی کوئی نہ کوئی راہ نکال ہی لیتا ہے' مگر جس کے بارے میں کچھ علم ہی نہ ہو' اس کے حربوں سے بچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ شمبھو کے معاملے میں میرے ساتھ ایسا ہی تھا۔ اس رات عمل کا وقت شروع ہونے سے پہلے مجھے اسی کی طرف سے فکر لاحق رہی کہ آج رات جانے کیا نیا ہنگامہ برپا ہو۔

صبح ہونے سے پہلے جب میں صدر دروازے تک جانے والی راہداری سے گزر رہا تھا تو پوری طرح چوکنا تھا میرے حکم پر اب راہداری میں زیادہ پاور کا بلب لگادیا گیا تھا اور وہاں نیم تاریکی نہیں تھی۔ آگے بڑھتے ہوئے میری نگاہ راہداری کے فرش پر تھی کیوں کہ گزشتہ شب یہیں وہ سانپ میرے پیروں سے لپٹ گیا تھا۔ دور تک راہداری روشن اور فرش صاف تھا۔ یہ دیکھ کر میرے دل کو تسلی ہوئی پھر جب میں' سریتا کے کمرے کے قریب سے گزرا تو پھر نظر کھڑکی پر پڑی۔ کھڑکی آج بند تھی' مگر کمرے کے اندر سے کسی کے ہنسنے کی آواز آرہی تھی اور کھڑکی میں لگے ہوئے شیشوں سے خفیف سی روشنی بھی جھلک رہی تھی۔ ہنسی کی وہ آواز مردانہ تھی جسے سن کر میں کانپ اٹھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ شمبھو آج بھی کھڑکی بند ہونے کے باوجود کسی طرح کمرے کے اندر پہنچ گیا تھا' میرے قدم جیسے آپ ہی آپ رک گئے۔ ہنسی کی آواز آنا بند ہو چکی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے اب کچھ کہا جارہا ہو۔ کھڑکی اور دروازہ بند ہونے کی وجہ سے آواز دھیمی تھی۔ میں نے کھڑکی کے قریب ہو کر اس سے کان لگادیا۔ اب مجھے وہ

مردانہ آواز مدہم ہونے کے باموجود صاف سنائی دے رہی تھی۔

"..... سمجھ رہی ہوگی کہ کھڑکی بند ہو جائے گی تو میں یہاں نہیں آسکوں گا۔ اب میں یہ جھگڑا ہی ختم کروں گا۔ میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ اب تجھے اپنے ساتھ لے جانے کی بجائے اس کوٹھی پر قبضہ کرلوں گا۔ میں تیرے بغیر نہیں رہ سکتا۔" مردانہ آواز سنائی دے رہی تھی اور میں نے اس آواز کو پہچان لیا تھا یہ شمبھو ہی کی منحوس آواز تھی۔ "کل تک میں یہاں سے سب کو بھگادوں گا پھر تو ہوگی یہاں اور میں۔"

"تو کمینہ ہے..... ذلیل ہے تو۔" معاً" سریتا کی تیز آواز سنائی دی۔

"پھر باز نہیں آئی تو۔ بھول گئی کل کی سزا! پھر چیخے گی، کسی ذبح ہوتی بکری کی طرح!"

"ہاں میں باز نہیں آؤں گی۔ بھگوان کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دے شمبھو۔ یہاں تو مجھے چین سے رہنے دے۔"

"چین سے تو میرے ساتھ ہی رہے گی! آخر تجھے مجھ سے اتنی نفرت کیوں ہے؟"

"اس لیے کہ تو اسی قابل ہے۔"

"دیکھ اگر میں چاہوں تو تجھے اپنی شکتی کے بل پر خود سے محبت کرنے پر مجبور کرسکتا ہوں۔ تو میرے پیچھے کسی پالتو کتیا کی طرح دم ہلاتی پھرے گی، مگر میں مٹی کے ڈھیر کو گلے لگانا نہیں چاہتا۔ اس میں کوئی مزہ نہیں۔ مجھے تو اسی حال میں چاہیے 'جیتی جاگتی اور..... اور....."

پھر وہ خبیث ایسی باتیں کرنے لگا جنہیں ضبط تحریر میں لانا کم از کم میرے لیے ممکن نہیں۔

مجھے یقین تھا کہ سریتا نے آج رات رکمنی کو بھی اپنے کمرے میں سلایا ہوگا۔ میں نے اسے یہی ہدایت کی تھی۔ پھر وہ کہاں گئی؟ اور اگر رکمنی بھی کمرے ہی میں موجود تھی تو بیدار کیوں نہیں ہوئی؟ میری ساری احتیاط اور دور اندیشی بیکار ثابت ہوئی تھی۔ کمرے کا دروازہ اور کھڑکی بند ہونے کے باوجود شمبھو اندر پہنچ گیا تھا۔ اسی وقت مجھے روشن دان کا خیال آیا اور میں اپنی عقل پر ماتم کر کے رہ گیا۔ کبھی کبھی سامنے کی چیزوں پر آدمی دھیان نہیں دیتا۔ شاید اس بھول کی لاشعوری وجہ یہ رہی ہو کہ میں، شمبھو کو بہرحال ایک آدمی ہی سمجھ رہا تھا۔ اگر شمبھو واقعی جون بدلنے پر قادر تھا تو پھر اس کے لیے یہ مشکل نہیں تھا کہ روشن دان کے ذریعے سانپ بن کر اندر پہنچ جاتا۔ یہی سوچتے ہوئے میری نگاہ کمرے کے دروازے پر پڑی۔ دروازے کے کواڑوں کے نیچے بھی اتنی جگہ تھی کہ کوئی سانپ اندر جاسکتا تھا۔

ہر حال میں مجھے صبح ہونے اور سورج نکلنے سے پہلے اپنے ہمزاد کے لیے چوراہے پر

ِ ی رکھ کر واپس آنا تھا یہ سوچ کر میں آگے بڑھ گیا۔ سریتا کے کمرے میں جو کچھ ہو رہا تھا، اس ہر حال میرا کوئی بس نہیں تھا۔ میں اسے فی الحال شمبھو کے شر سے بچانے کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ہاں مجھے شمبھو کی اس بات نے ضرور فکر مند کر دیا تھا کہ کل تک میری کوٹھی پر اس کا قبضہ ہو جائے گا اور وہ یہاں سے سب کو بھگا دے گا۔ ظاہر ہے کہ میں بھی ان "سب" میں شامل تھا۔ کم از کم عمل پورا ہونے تک تو میرا اس کوٹھی میں قیام انتہائی ضروری تھا۔ اسی کی خاطر تو میں سب کچھ برداشت کر رہا تھا۔

میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا چوراہے کی طرف جا رہا تھا کہ معاً" چونک اٹھا۔ پیچھے سے کسی نے چھوٹا سا کوئی پتھر مارا تھا۔ جو میری پشت پر لگا تھا۔ فطری طور پر ایسے مواقع پر آدمی ایک دم مڑ کر پیچھے دیکھتا ہے۔ میرے دل میں بھی لمحہ بھر کو یہی خواہش ابھری، مگر میں نے فوراً ہی خود پر قابو پالیا۔ میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔ مجھے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا تھا۔ میں رکے بغیر چلتا رہا۔ دوسرا پتھر میرے سر پر آکر لگا اور میری آنکھوں کے آگے ستارے سے ناچ گئے، مگر میں اسے بھی برداشت کر گیا یہ سنگ زنی کون کر رہا تھا، کون نہیں، اس سے مجھے کچھ غرض نہیں تھی۔ میرے لیے تو وہ سنگ زنی' بارش گل تھی کہ اسی سے گزرنے کے بعد مجھے میری منزل ملتی۔ چوراہے تک پہنچتے پہنچتے کئی بار میرے منہ سے کراہیں نکل گئیں کیوں کہ مجھ پر مسلسل پتھر برستے رہے تھے، مگر میں بھی اپنی دھن کا پکا تھا۔ میرے لیے یہ تجربات نئے نہیں تھے۔ میں برسوں پہلے ان سے گزر چکا تھا۔ ہمزاد کو قابو میں کرنا کوئی ہنسی کھیل نہیں، یہ جان جوکھوں کا کام ہے اور مجھے یہ بات اچھی طرح معلوم تھی۔

چوراہے پر روٹی رکھنے کے بعد میں واپس ہوا تو مجھے اپنے عقب میں بڑی خوف ناک آوازیں سنائی دیں جیسے بھوکے درندے مجھ پر حملہ کرنے والے ہوں۔ بڑے سے بڑے دل گردے والا یہ خوف ناک آوازیں سن لیتا تو اس کا پتا پانی ہو جاتا اور وہ دہشت کے مارے وہیں ڈھیر ہو جاتا، مگر میں آگے بڑھتا رہا اور بالآخر اپنی کوٹھی کے گیٹ میں داخل ہو گیا جہاں دوسرے عذاب میرے منتظر تھے۔ جیسے ہی میں نے آگے بڑھنا چاہا، کسی نادیدہ قوت نے مجھے پیچھے دھکیل دیا۔ میرا سر بڑی زور سے کوٹھی کے گیٹ کے ساتھ ٹکرایا اور پھر میں گر پڑا۔ اسی وقت مجھے ایک تیز پھنکار سنائی دی۔ میں نے اٹھتے ہوئے اپنے بالکل سامنے شعلے سے لپکتے دیکھے، یوں جیسے وہ رقص کر رہے ہوں۔ وہ شعلے میری راہ میں حائل تھے۔ میں نے ذرا ہٹ کر اور ان شعلوں سے بچ کر گزر جانا چاہا، مگر کامیاب نہ ہوا۔ وہ اپنی جگہ سے حرکت کر کے پھر میرے سامنے آگئے تھے۔ مجھے فوراً شمبھو کا خیال آیا جس نے سریتا سے کہا تھا کہ کل تک سب کو

کوٹھی سے بھگا دے گا یقیناً اس نے اپنی شیطانی کارروائی ابھی سے شروع کر دی تھی۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ یقیناً اب تک سر پر پیر رکھ کر وہاں سے بھاگ چکا ہوتا مگر میں اتنی جلدی شکست قبول کرنے والوں میں سے نہیں تھا۔ میں خود متعدد حیرت انگیز اور پُراسرار واقعات سے گزر چکا تھا' پھر بھلا کیسے جی ہار بیٹھتا۔ معاً" میرے ذہن میں کوٹھی کے عقبی دروازے کا خیال آیا۔ میں اس طرف سے بھی کوٹھی کے اندر داخل ہو سکتا تھا۔ یوں بھی میرا کمرہ کوٹھی کے عقبی حصے ہی میں تھا۔ میں بہ آسانی وہاں سے اپنے کمرے تک پہنچ سکتا تھا۔ اس میں صرف ایک قباحت تھی کہ عقبی دروازہ اندر سے کھولتا کون؟ میں عقبی چھوٹا پھاٹک تو عبور کر کے کسی طرح اندر پہنچ سکتا تھا۔ مگر عمارت کا عقبی دروازہ کسی بھی طرح نہیں کھول سکتا تھا جس میں اندر سے تالا پڑا رہتا تھا اور اس تالے کی چابی ارشاد علی کے پاس رہتی تھی۔ ممکن ہے کہ وہاں پہنچ کر کوئی راہ نکل آئے' یہ سوچ کر میں مڑا اور کوٹھی کے گیٹ سے باہر نکل گیا۔ پھر میں ایک لمبا چکر کاٹ کر کوٹھی کی عقبی سمت پہنچا۔ وہاں گہری تاریکی اور سناٹا تھا۔ میں نے کچھ دیر سن گن لی اور اسی وقت مجھے ایک تیز نسوانی چیخ سنائی دی۔ اسی کے بعد "بچاؤ بچاؤ" کی تیز آوازیں آئیں۔ اس چیخ اور تیز آواز نے میرے اعصاب کو جھنجوڑ دیا کیوں کہ وہ آواز میرے لیے نئی نہیں تھی۔ یہ مہ پارہ کی آواز تھی' مگر مجھے حیرت اس پر تھی کہ آخر اس کا مقصد کیا ہے۔ میں نے سوچا کہ جتنی جلدی اپنی کوٹھی کے اندر پہنچ جاؤں میرے حق میں بہتر ہے۔ یہ سوچتے ہوئے میں تیزی کے ساتھ کوٹھی کے عقبی گیٹ پر چڑھنے لگا۔ اسی لمحے مجھے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر میں ابھی گیٹ کے اوپر پہنچا تھا اور اندر نہیں کود سکا تھا کہ کسی نے میرا پیر پکڑ کر مجھے گھسیٹ لیا۔ اس کے بعد ہی میرے سر پر بھاری ڈنڈے کی ضرب پڑی اور سب کچھ تاریکی میں ڈوب گیا۔ ہوش کھونے سے پہلے میں نے اس شخص کی ایک جھلک دیکھ لی تھی جس نے مجھے پر "طبع آزمائی" کی تھی۔ وہ پولیس والا تھا جو یقیناً رات کے وقت اس طرف گشت پر رہا ہو گا۔ اسے مہ پارہ کی چیخ ہی نے اس طرف دوڑ کر آنے پر مجبور کیا ہو گا' گویا اس کا چیخنا بے سبب نہیں تھا۔

میرے جسم پر صرف ایک کپڑا تھا۔ میں عمل کے دوران میں صرف ایک انگوچھا باندھ لیتا تھا اور پھر جب چوراہے پر روٹی رکھ کر آجاتا تھا تو لباس تبدیلی کرتا تھا۔ اس حالت میں اور رات کے وقت کسی کوٹھی کے عقبی پھاٹک پر چڑھنے والا سپاہی کی نظر میں کوئی چور ہی ہو سکتا تھا۔ اس نے میرے ساتھ اسی لیے ایسا سلوک کیا تھا۔

ہوش آنے کے بعد میں کچھ دیر سمجھ ہی نہ سکا کہ کہاں ہوں۔ مجھے سامنے ہی ایک

دروازہ نظر آرہا تھا۔ جس میں موٹی موٹی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ دروازہ بند تھا۔ پھر میرے حواس ذرا بجا ہوئے تو مجھے اندازہ ہوا کہ میں تھانے میں ہوں اور مجھے حوالات میں بند کر دیا گیا ہے۔ معاً" میرے سر میں ٹیس سی اٹھی اور بے اختیار میرا ہاتھ وہاں تک پہنچ گیا۔ مجھے ہلکی سی چپچپاہٹ محسوس ہوئی۔ ضرب یقیناً شدید تھی اور اس جگہ بڑا سا ابھار بھی تھا۔ سر کی کھال پھٹ گئی تھی' مگر شاید زیادہ نہیں ورنہ خون بہہ رہا ہوتا۔

نہ وہ تھانہ میرے لیے نیا تھا' نہ تھانے والے۔ ان سے پیچھا چھڑانا میرے لیے زیادہ مشکل نہ ہوتا۔ یہی سوچ کر میں نے حوالات کے سامنے ٹہلتے ہوئے سپاہی کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

"کیا ہے بے؟" سپاہی نے بڑی رعونت سے مجھے جواب دیا۔ غالباً اسے بھی بتا دیا گیا ہو گا کہ میں چور ہوں اور عین موقع پر ایک کوٹھی میں گھستے ہوئے پکڑا گیا ہوں۔

"ملک صاحب نہیں آئے ابھی؟" میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے پولیس والے سے تھانے کے ایس ایچ او کے بارے میں پوچھا۔

"کیوں..... کیا باوا ہیں ملک صاحب تیرے۔ رعب میں لے رہا ہے صاحب کا نام لے کر۔" اس نے سلاخوں کے قریب آکر مجھ پر آنکھیں نکالیں۔

جب آدمی کا وقت بگڑتا ہے تو دو پیسے کا آدمی بھی اس کی بے عزتی کر دیتا ہے' میں نے سوچا اور اس پولیس والے کو بے بسی سے دیکھنے لگا جو سیدھے منہ بات کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ اس کی وجہ غالباً میری ظاہری حالت بھی تھی۔ میرے جسم پر صرف انگوچھے کی بجائے صرف اچھے کپڑے ہوتے تو شاید وہ یوں پیش نہ آتا۔ موجودہ صورت حال میں صبر کرنے کے سواء کوئی چارہ نہیں تھا' سو میں نے صبر کیا۔

کچھ ہی دیر بعد اچھی طرح دن نکل آیا اور تھانے کے صحن میں دھوپ پھیل گئی۔ اس کے ساتھ میری مشکل بھی آسان ہو گئی۔ ایک سپاہی مجھے حوالات سے نکال کر ایس ایچ او کے کمرے سے ملحق نسبتاً" بڑے کمرے میں لے گیا۔ وہاں میری ملاقات اسی سب انسپکٹر سے ہوئی جس نے مجھے نرس مس نادرہ کے معاملے میں گرفتار کیا تھا وہ مجھے دیکھ کر اس طرح پلکیں جھپکانے لگا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ حوالات میں بند کرنے کی بجائے ایک رات کے لیے مجھے گھر جانے کی اجازت دینے کے سلسلے میں وہ بھی مجھ سے رشوت لے چکا تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر آشنائی کے آثار دیکھے تو فوراً اپنا تعارف کرایا۔ "میرا نام شیخ کرامت ہے جناب آپ سے پہلے بھی ملاقات ہو چکی ہے۔"

"ہاں ہاں یاد آرہا ہے مجھے۔" وہ پنسل اپنی کنپٹی پر رکھتے ہوئے بولا۔ "تم وہی ہو نا جو ایک نرس پر مجرمانہ حملہ کرنے کے سلسلے میں....."

"جی..... جی ہاں۔" میں نے جلدی سے سرہلایا' پھر بولا۔ "اور وہ الزام غلط ثابت ہوا تھا۔"

"خیر اس بات کو چھوڑو کہ الزام غلط تھا یا صحیح' فی الحال تو یہ بتاؤ کہ تم کسی کے گھر میں کودنے کی کوشش کیوں کر....."

"کسی کے گھر میں نہیں جناب' اپنے گھر میں۔" میں اس کی بات کاٹ کر بولا۔

"کیا مطلب؟ اس نے تیوریاں چڑھا کر کہا۔"

"جی ہاں' میں اپنی ہی کوٹھی میں داخل ہو رہا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"لیکن گیٹ پر چڑھ کر اور وہ بھی کوٹھی کے پچھلے حصے سے۔" اس نے مجھے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

"اگر آپ کو میری بات پر یقین نہیں تو اس پولیس والے سے بلا کر پوچھ لیں۔ جس نے مجھے ڈنڈا مار کر گرایا تھا کہ یہ واقعہ کہاں پیش آیا۔" میں نے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے دلیل دی۔

"تم نے نہیں دیکھا' اس پولیس والے کو؟"

"بس ایک ہلکی سی جھلک دیکھی تھی' بے ہوش ہوتے ہوتے۔"

"اے ادھر آؤ تم۔" اس نے ذرا فاصلے پر کھڑے ہوئے ایک پولیس والے کو اشارہ کیا۔

پولیس والا قریب آگیا تو میں نے اس کے چہرے پر کچھ گھبراہٹ سی دیکھی۔

"انہیں تم نے کہاں اور کس حالت میں پکڑا تھا؟" سب انسپکٹر نے ذرا سخت لہجے میں پوچھا۔ "جھوٹ بالکل نہیں' سچ سچ بتانا۔"

"میں گشت پر تھا جناب عالی کہ مجھے ایک عورت کی چیخ سنائی دی۔ وہ بچاؤ۔ بچاؤ کی آوازیں لگا رہی تھی جیسے جناب عالی کوئی اس کے ساتھ....."

زیادہ منظر کشی کی ضرورت نہیں۔" سب انسپکٹر نے اسے ڈانٹ دیا۔ "سیدھے سیدھے الفاظ میں وقوعہ بیان کرو۔"

"جی جناب عالی۔" اس نے سعادت مندی سے سرہلایا' پھر وہی سب کچھ بیان کر دیا جو مجھ پر گزری تھی۔ اس کے ساتھ اس نے میری کوٹھی کا محل وقوع بھی بیان کر دیا تھا۔

"جگہ تو وہی معلوم ہوتی ہے' میں گیا ہوں وہاں۔" سب انسپکٹر سرہلا کر کہنے لگا' پھر غالباً کچھ سوچتے ہوئے اس نے سرہلایا۔ "ٹھیک ہے' میں خود اس معاملے کی تفتیش کروں گا۔" یہ کہتے ہوئے وہ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا' پھر اس سپاہی کو اشارہ کیا۔ "تم بھی اس جگہ کی نشان دہی کرنے میرے ساتھ چلو گے۔"

"جی جناب عالی۔" سپاہی فوراً بولا۔

سب انسپکٹر نے مجھے بھی اپنے پیچھے چلنے کا اشارہ کیا اور آگے بڑھا۔

میں اس سب انسپکٹر اور سپاہی کے ساتھ تھانے سے نکل آیا۔ میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ سب انسپکٹر اس معاملے میں کیوں اتنی فرض شناسی' کا ثبوت دے رہا تھا اور عموماً پولیس والے یہ رویہ اختیار نہیں کرتے۔ میری کوٹھی وہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ جلد ہی ہم وہاں پہنچ گئے اور سپاہی نے میرے بیان کی تصدیق کر دی۔ اس وقت ہم کوٹھی کے عقبی گیٹ کے پاس کھڑے ہوئے تھے۔

"اچھا تم تھانے پہنچو میں آتا ہوں۔ ابھی۔" سب انسپکٹر نے سپاہی سے کہا۔

"بہتر جناب عالی۔" سپاہی اٹینشن ہو کر واپسی کے لیے مڑ گیا۔

سپاہی کے جاتے ہی سب انسپکٹر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "یہ تم نے ان دنوں چکر کیا چلا رکھا ہے کبھی اطلاع ملتی ہے کہ تمہاری کوٹھی میں کسی لڑکی کی لاش پڑی ہے' کبھی کوئی لڑکی تھانے میں آکر رپورٹ درج کراتی ہے کہ تم نے اس پر مجرمانہ حملہ کیا ہے اور کبھی تمہاری کوٹھی سے بچاؤ بچاؤ کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ سپاہی کا بیان ہے کہ اس نے بھی کسی لڑکی ہی کی چیخ سنی تھی اور اس طرف دوڑا تھا۔" وہ مجھے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ "ہر معاملے میں کوئی نہ کوئی لڑکی ضرور ملوث ہے۔ آخر کوئی تو وجہ ہوگی اس کی۔"

"میرا خیال ہے کہ ہمارا یہاں کھڑے رہ کر باتیں کرنا کچھ مناسب نہیں ہے لوگ اس گلی میں آجا رہے ہیں۔" میں نے اس کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا اور اسی وقت مجھے شبو کا خیال آگیا کہ وہ اب بھی کوٹھی میں ہو گا یا نہیں۔ یہ خیال آتے ہی میں کچھ فکر مند سا ہو گیا۔

"زیادہ وقت نہیں ہے میرے پاس' مگر تم سے ابھی کچھ ضروری بات کرنا ہے اس لیے چلو۔" سب انسپکٹر میری بات سن کر معنی خیز لہجے میں بولا۔

"مجبوراً میں اسے ساتھ لیے چکر کاٹ کر کوٹھی کے بیرونی گیٹ پر پہنچ گیا اور اندر نظر پڑتے ہی چکرا کر رہ گیا۔ عمارت اور گیٹ کے درمیان جو سرسبز و شاداب درخت تھے' وہ جھلس

کر رہ گئے تھے۔ ہر طرف ویرانی ہی ویرانی نظر آرہی تھی۔

اس بات کو اس سب انسپکٹر نے بھی محسوس کر لیا اور بولا۔ "ابھی کچھ دن پہلے ہی تو میں یہاں آیا تھا' اس وقت تو یہاں بڑی ہریالی تھی' اب تو تمہاری کوٹھی آسیب زدہ سی معلوم ہو رہی ہے کیا ہوا؟"

میں اس کی بات کا جواب دیئے بغیر آگے بڑھا اور پھاٹک کھولنا چاہا جسے میں کھلا ہوا چھوڑ گیا تھا۔ پھاٹک نہیں کھلا۔ کسی نے اسے اندر سے بند کر دیا تھا۔ پھاٹک کے ساتھ ہی گھنٹی کا بٹن تھا میں نے اس پر انگلی رکھ دی۔ گھنٹی بجنے کی آواز باہر تک سنائی دی۔ بہ ظاہر ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کوٹھی میں کوئی نہ ہو۔ میں پھاٹک کی آہنی جالیوں سے اندر جھانکنے لگا۔ عمارت کا صدر دروازہ اب تک بند تھا ایک بار پھر میں نے بٹن پر انگلی کا دباؤ بڑھا دیا اور دیر تک انگلی نہ ہٹائی۔

"کیا تمہارے ملازم گدھے گھوڑے بیچ کر سو رہے ہیں۔" سب انسپکٹر نے قدرے ناگوار لہجے میں کہا۔

"سمجھ میں نہیں آتا' کیا بات ہے؟" میں انجان بن گیا۔

لان کی گھاس' پیڑ پودے سبھی اندر جھلسے اور مرجھائے ہوئے نظر آرہے تھے' ایک ویرانی سی ویرانی تھی میں وقفے وقفے سے گھنٹی بجا رہا تھا۔

"آخر میں کب تک یہاں تمہارے ساتھ احمقوں کی طرح کھڑا رہوں۔" سب انسپکٹر سے صبر نہ ہو سکا۔

اسی وقت دائیں جانب مجھے قدموں کی چاپ سنائی دی۔

اور میں نے اس طرف دیکھا۔ ارشاد علی تقریباً دوڑتا ہوا ہماری طرف آرہا تھا۔

"کہاں مر گئے تھے؟" میں اسے دیکھتے ہی چیخا۔ اور تم کہاں سے آرہے ہو۔؟" وہ قریب آکر اب اپنے سانس درست کر رہا تھا۔

"جج..... جناب میں..... میں اندر ہی تھا۔" اس نے ہانپتے ہوئے جواب دیا۔

"اندر تھے کوٹھی میں؟" میری بجائے سب انسپکٹر نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"جی ہاں..... میں پچھلی..... پچھلے دروازے سے گھنٹی کی آواز سن کر آیا ہوں۔"

سب انسپکٹر اسے اس طرح دیکھنے لگا جیسے ارشاد علی کی دماغی صحت پر اسے شبہ ہو۔ "دی ہو تم بھی" سب انسپکٹر ناگواری سے بولا "اتنا لمبا چکر کاٹ کر تو آگئے اور سیدھے آکر....."

"چلیئے آیئے آپ۔" میں نے سب انسپکٹر کی بات کاٹ کر اس سے کہا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے ورنہ ارشاد علی اتنا احمق نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر یقیناً بلاسبب ہوائیاں نہیں اڑ رہی تھیں۔

"کہاں چلیئے؟" سب انسپکٹر حیرت اور خفگی سے بولا۔

"اب تو مجبوراً پچھلی طرف سے ہی جانا پڑے گا کیوں کہ اس سے حماقت سرزد ہو گئی ہے۔" میں نے بات بنائی۔ "آپ کو یوں بھی جلدی ہے۔"

"عجیب پاگلوں سے پالا پڑا ہے۔" سب انسپکٹر بڑبڑاتا ہوا میرے ساتھ ہو لیا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ مجھ سے اب تک کیوں چپکا ہوا ہے یقیناً وہ مجھے "چھیلے" بغیر ٹلنے والا نہیں تھا۔ یہ شخص اس نے اپنی اہمیت جتانے کے لیے کہا تھا کہ میرے پاس وقت کم ہے۔

کچھ دیر بعد ہی میں' سب انسپکٹر کو ساتھ لیے عقبی پھاٹک سے اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس طرف بھی پیڑ لگے ہوئے تھے' مگر یہاں کا منظر مختلف تھا۔ ہر طرف ہریالی تھی۔ یہ بھی میرے لیے حیرت انگیز امر تھا۔ عقبی دروازے سے میں اندر داخل ہوا تو ارشاد علی نے مجھے اشارہ کیا۔ وہ غالباً مجھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ سب انسپکٹر نے بھی اسے اشارہ کرتے ہوئے شاید دیکھ لیا تھا اسی لیے مشتبہ سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں اس کی پروا کیئے بغیر ارشاد علی کو لے کر ادھر ایک طرف ہو گیا۔

"ہاں کہو' کیا بات ہے؟" میں نے آہستہ سے کہا۔

"ادھر..... انہیں ادھر ڈرائنگ روم کی طرف نہ لے جایئے گا۔" اس نے سرگوشی کی۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے سبب پوچھے بغیر سر ہلایا اور پھر سب انسپکٹر کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "آیئے جناب' ادھر..... اس طرف آجایئے۔" میں اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔

سب انسپکٹر منہ بناتا ہوا میرے ساتھ کمرے میں آگیا ارشاد علی کو میں نے باہر ہی رہنے کا اشارہ کر دیا تھا۔ سب انسپکٹر کو کرسی پر بٹھا کر میں سیدھا باتھ روم میں گھس گیا تاکہ لباس تو کم از کم تبدیل کر ہی لوں۔ مجھے سب انسپکٹر کے سامنے صرف انگوچھا باندھے ہوئے بڑی خجالت محسوس ہو رہی تھی۔ پھر جب میں لباس تبدیل کر کے باتھ روم سے نکلا تو بڑی حد تک اپنے منتشر حواس پر قابو پا چکا تھا۔

"جی اب فرمائیں۔" میں اس کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"فرمانا کیا ہے۔ میں تمہیں دراصل یہ بتانا چاہتا تھا کہ یہ معاملہ اتنی آسانی سے ختم

نہیں ہوگا۔" اس کے چہرے میں عیّاری جھلک رہی تھی۔

"کون سا معاملہ؟" مجھے اس پر غصّہ آنے لگا۔ وہ مجھ سے رقم اینٹھنے کے لیے ذرا سی بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کر رہا تھا۔

"یہی اور کون سا معاملہ؟" وہ بولا۔ اب تم اتنے بھولے بھی نہیں ہو کہ میری بات نہ سمجھ سکو۔ اس ہوا میں نہ رہنا کہ تم اب تھانے میں نہیں ہو۔ میری رعایت کا غلط مطلب نہ لو۔" اس نے آنکھیں بدل لیں۔ "میں تمہیں پھر حوالات کی ہوا کھلا سکتا ہوں۔"

"مگر کس جرم میں؟" میرے لہجے میں تیزی آگئی۔ "کیا اپنے ہی گھر میں داخل ہونا بھی جرم ہے؟"

"یہ تو تمہارا بیان ہے نا۔" وہ طنزیہ انداز میں ہنسا۔ "جائے وقوعہ بدل بھی سکتی ہے اور ابھی میری تفتیش جاری ہے' ایک گھر ادھر یا ایک گھر ادھر اب آیا کچھ سمجھ شریف میں کہ نہیں۔" اس کا لہجہ بہ دستور طنزیہ رہا۔ "پھر تم اس لڑکی کو کیوں بھول رہے ہو جس کی چیخیں سن کر سپاہی موقع پر پہنچا تھا۔ اچھا یہ سب بھی چھوڑو کیا میں تمہیں رات کے وقت مشتبہ حالت میں آوارہ گردی کے جرم میں اندر نہیں کر سکتا۔"

میں چند لمحے خاموش رہا۔ فی الحال اس سے الجھنا بے سود ہی تھا۔ وہ کچھ لیے دیئے بغیر ٹلنے والا ہرگز نہیں تھا۔ اس نے مجھ پر ظاہر کر دیا تھا کہ وہ کس کس طرح مجھے پھانس سکتا ہے اور چکر دے سکتا ہے۔ اس سے مصلحت ہی میں بہتری تھی بعد میں اس سے اچھی طرح نمٹا جا سکتا تھا۔ پولیس والوں نے مجھے جو چرکے دیئے تھے' میں بھولا نہیں تھا۔ وقت آنے پر میں ایک ایک حساب چکانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

"آپ تو ناحق بگڑنے لگے جناب۔" میں نے ایک دم اپنا رویہ اور لہجہ بدل لیا۔ "میں تو آپ لوگوں کا دیرینہ خادم ہوں۔" یہ میں ہی جانتا ہوں کہ ان الفاظ کو ادا کرنے کے لیے میں نے خود پر کتنا جبر کیا تھا۔

"کیوں نکل گئے سب کس بل۔" اس نے گویا چڑایا۔

"اجی ہم غریبوں کے کیا کس بل خادم ہیں آپ کے۔" میں نے عاجزانہ انداز اختیار کر لیا۔

"اب آئے نہ گھاٹ پر۔" وہ مسکرایا اور پھر مطلب کی بات پر آگیا۔

"وہ مطلب کی بات۔" مجھے دو ہزار روپے میں پڑی۔ اس سے کم پر وہ راضی نہیں ہوا تھا۔

سب انسپکٹر کے جاتے ہی میں نے ارشاد علی کو بلا لیا۔ وہ اب تک وحشت زدہ سا نظر آ رہا تھا۔ میں نے اسے مخاطب کیا۔ "کیا بات ہے ارشاد علی' تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟" میں نے بظاہر اطمینان سے سوال کیا حالانکہ میرے اندر ایک ہیجان برپا تھا۔

○○......○......○○

"سمجھ میں نہیں آتا صاحب کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے! میری تو عقل حیران ہے۔" وہ تقریباً" روہانسے لہجے میں بولا۔

"پھر ارشاد علی تفصیل کے ساتھ مجھے واقعات بتانے لگا جو میری عدم موجودگی میں پیش آئے تھے۔ میرے جانے کے کچھ دیر بعد ارشاد علی نے بڑی خوفناک آوازیں سنی تھیں جیسے کوٹھی میں درندے گھس آئے ہوں۔ وہ بڑے دل گردے کا آدمی تھا۔ مگر ان آوازوں نے اسے خوف زدہ کر دیا اور وہ گھبرا کر میرے کمرے میں بند ہو گیا۔ وہ آوازیں آنا بند ہوئیں تو کچھ ہی دیر بعد کمرے کے دروازے کو کسی نے پیٹنا شروع کر دیا۔ ارشاد علی نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا اور دیکھا کہ میرے سارے مرد ملازمین باہر کھڑے تھے۔ انہوں نے ارشاد علی کو بتایا کہ وہ کوٹھی چھوڑ کر جا رہے ہیں کیوں کہ اب کسی حال میں وہاں نہیں رہ سکتے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ انہیں اس بڑے کمرے میں سانپ نظر آیا تھا جہاں ان میں سے تین افراد کا قیام تھا۔ وہ بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگے تھے۔ بقیہ دو نے بھی سانپ ہی کا ذکر کیا۔ انہوں نے بھی خوف ناک آوزیں سنی تھیں جن کی وجہ سے ان کی آنکھ کھلی تھی۔ ارشاد علی نے انہیں اس وقت تک کے لیے روکنا چاہا جب تک میں واپس نہ آ جاؤں، مگر کوئی نہ مانا۔ وہ سبھی انتہائی خوف زدہ تھے۔ ارشاد علی نے خاص طور پر اس بات کا ذکر کیا کہ ان کے ساتھ میری کوئی ملازمہ نہیں تھی۔ وہ سب چلے گئے تو ارشاد علی کو ملازماؤں کی فکر ہوئی کہ آخر وہ کیوں بیدار نہ ہوئیں۔ پھر یہ کہ اسے میری بھی فکر تھی کیوں کہ میں اس وقت تک لوٹ آتا تھا۔ وہ بری ہمت کر کے میرے کمرے سے نکلا۔ اس وقت تک صبح کے آثار نمودار ہونے لگے تھے تاریکی کی نسبت آجالے میں آدمی کو اتنا خوف محسوس نہیں ہوتا۔ ارشاد علی کے ہمت پکڑنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ اس نے سوچا کہ جب تک میں لوٹوں اس وقت تک وہ کم از کم میرے لیے ناشتا ہی تیار کر لے اور ملازماؤں کی خیر خبر بھی لے لے۔ اسی غرض سے وہ آگے بڑھا اور ڈرتے

جھجکتے اس نے پہلے رکمنی کے کمرے کا رخ کیا جو وہاں سے نسبتاً" قریب تھا۔ اس نے ابھی برآمدے میں قدم رکھا ہی تھا کہ جیسے کسی نادیدہ قوت نے اسے پیچھے دھکیل دیا۔ اسی کے ساتھ اسے برآمدے کے فرش سے لے کر چھت تک ایک شعلہ سا رقص کرتا نظر آیا۔ یہ منظر دیکھ کر اس پر اتنی دہشت بیٹھی کہ کچھ دیر اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکا پھر اسے جتنی آیتیں یاد تھیں۔ یکے بعد دیگرے پڑھنے لگا۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ اس کا خوف کچھ کم ہو گیا اور وہ زمین سے اٹھ کر دوبارہ میرے کمرے کی طرف آ گیا۔ وہ برآمدہ گویا بقیہ عمارت اور اس حصّے کے درمیان حد فاصل تھا جہاں میرا کمرہ تھا اور میرے ہی کمرے سے ملحق ارشاد علی کا کمرا تھا۔ وہ حصّہ گویا عمارت سے کٹ کر رہ گیا تھا۔ کچھ دیر گزری تھی کہ ارشاد علی نے گھنٹی کی آواز سنی۔ ہمت کر کے میرے کمرے سے نکلا اور عقبی دروازے سے باہر آ گیا۔ اب دن نکل آیا تھا۔ گھنٹی پھر بجی جو اسے باہر آنے کے باوجود سنائی دے رہی تھی۔ بہرحال وہ عقبی پھاٹک کھول کر کوٹھی کے بیرونی گیٹ تک پہنچا اور وہاں ڈاکٹر امتیاز کو دیکھا جو میری ڈریسنگ کرنے آیا تھا۔

ارشاد علی نے ڈاکٹر امتیاز کو بتایا کہ میں کوٹھی میں نہیں ہوں۔ پھر اس نے احتیاط" ڈاکٹر سے اس کے گھر کا پتا لکھوایا۔ ڈاکٹر واپس چلا گیا اور چلتے ہوئے کہہ گیا کہ جب میں آ جاؤں تو اسے بلوا لیا جائے۔ اسی وقت ارشاد علی کی نظر کوٹھی کی طرف اٹھی اور اسے وہی منظر نظر آیا جو اس نے دیکھا تھا۔ اس کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ اس طرف سے اندر داخل ہونے کی کوشش کرتا۔ ڈاکٹر امتیاز نے بھی اس پر حیرت ظاہر کی تھی اور کوئی تسلی بخش جواب نہ پا کر الجھا الجھا سا واپس چلا گیا تھا۔ اس کے بعد ارشاد علی دوبارہ عقبی سمت سے کوٹھی میں آ گیا تھا۔ اسے بڑی بے چینی سے میرا انتظار تھا۔

اس سے تمام واقعات سننے کے بعد میں نے کہا۔ "دیکھو ارشاد علی، اس میں کوئی لحاظ یا مروت والی بات نہیں۔ اگر تم بھی مجھے ان حالات میں دوسروں کی طرح چھوڑ کر جانا چاہتے ہو تو جا سکتے ہو، میں ہرگز برا نہیں مانوں گا۔"

"یہ..... آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب! میں..... میں آپ کو چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں! جہاں آپ..... وہیں میں۔" اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "موت زندگی اللہ کے ہاتھ ہے۔ اگر اس طرح لکھی ہے تو کون روک سکتا ہے! ویسے میں..... میں کچھ کچھ سمجھ رہا ہوں جناب کہ یہ کہ جب سے آپ نے وظیفہ شروع کیا ہے، یہ..... یہ مصیبتیں آ رہی ہیں۔"

"تم ٹھیک سمجھ رہے ہو ارشاد علی!" میں نے اسے اعتماد میں لینے کے لیے کہا۔ اسے کسی نہ کسی طرح مطمئن کرنا ضروری تھا ورنہ اس کے بغیر مجھے بڑی پریشانی ہو جاتی۔ یوں تو میں

نے اسے آزمانے کے لیے کہہ دیا تھا کہ اگر وہ بھی جانا چاہے تو جا سکتا ہے' مگر دل سے میں
چاہتا تھا۔ میں نے اسے مزید مطمئن کرنے کی غرض سے کہا۔ "وظیفہ پورا ہونے میں بس
روزہ رہ گئے ہیں ارشاد علی' اس کے بعد سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔"

"مگر جناب میں نے سنا ہے کہ کبھی کبھی وظیفہ الٹا بھی ہو جاتا ہے' کہیں ایسا ہی تو
ہے جو یہ سارا چکر شروع ہو گیا ہے!"

نہیں' ایسی کوئی بات نہیں۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "تم فکر نہ کرو! اور ابھی تو چند
باقی ہیں۔ وظیفہ پورا ہونے کے بعد ہی تو معلوم ہو گا کہ وظیفہ الٹا ہو گیا یا....."

"خدا نہ کرے جناب کہ ایسا ہو۔" وہ بول اٹھا۔

"خیر اب تم کوٹھی کے اس حصے میں جانے کی کوشش نہ کرنا!" میں نے کہا' پھر
سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "ایسا کرو کہ عارضی طور پر اپنے کمرے کے سامنے کھانے پکا
بندوبست کر لو۔ میں تمہیں پیسے دیئے دیتا ہوں' جس جس چیز کی ضرورت سمجھو لے آؤ۔"

"مگر جناب سب..... سبھی سامان لانا پڑے گا۔ سب کچھ تو باورچی خانے میں تھا
بھاڑے اور....."

"تم اس کی فکر نہ کرو۔" میں نے الماری کھولی اور اس میں سے بڑے نوٹوں
آخری گڈی نکال لی۔ اس میں سے میں نے سب انسپکٹر کی "خدمت" کی تھی۔ "لو یہ
اپنے پاس رکھ لو' جو بچیں واپس دے دینا۔" میں نے پلٹ کر اس کی طرف نوٹوں کی گڈی
بڑھائی۔

"یہ تو بہت ہیں جناب!" اس نے نوٹوں کی گڈی لیتے ہوئے کہا۔

"سامان بھی تو بہت لانا ہے تمہیں۔" میں نے مسکرا کر اس کی شانہ تھپکا۔ "اطمینان
سے اپنے کمرے میں جا کر سامان کی فہرست بنا لو اور جتنی جلد ممکن ہو سامان خرید کر لے آ
جاؤ۔ آمد و رفت کے لیے ہم وقتی طور پر عقبی دروازہ ہی استعمال کریں گے۔ ہاں سنو' اگر
ہو تو ڈاکٹر امتیاز کی طرف بھی ہوتے آنا اور انہیں بتا دینا کہ وہ پیچھے سے آئیں اور گیٹ بھی
جانا باہر سے!"

"ٹھیک ہے جناب!" اس نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ "میں ڈاکٹر صاحب سے
دوں گا کہ آپ آ گئے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ میرے کمرے سے نکل گیا۔

اس ہنگامہ آرائی کی وجہ سے فجر کی نماز قضا ہو گئی تھی۔ میں نے وضو کر کے پہلے
پڑھی۔ پھر بستر پر دراز ہو کر گزرے ہوئے واقعات کے بارے میں سوچنے لگا۔ ارشاد علی

میں نے جیسے تیسے مطمئن کر دیا تھا مگر خود میرے دل کو اطمینان نہیں ہوا تھا۔ شمبھو کے کہے
ہوئے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے جو اس نے سریتا سے کہے تھے۔ مجھے یہ سمجھنے میں
کوئی قباحت نہیں ہوئی تھی کہ اس نے صرف میرے مرد ملازمین کو خوف زدہ کر کے کوٹھی
سے کیوں بھگا دیا تھا اور ملازمائیں کیوں فرار نہیں ہوئی تھیں! یقیناً ان میں سے ہر ایک حسن کا
شاہکار تھی اور شمبھو ان کے درمیان راجا اندر بن کر رہنا چاہتا ہو گا۔ اس نے اسی لیے
ملازماؤں کو خوف زدہ کر کے بھگانے کی ضرورت نہیں سمجھی ہو گی۔ اس نے سریتا سے جو کچھ کہا
تھا تقریباً" سچ کر دکھایا تھا' لیکن میرے لیے الجھن کا سبب ایک اور بات تھی۔ آخر اس نے
کوٹھی کے اس حصے کو کیوں نظر انداز کر دیا تھا۔ جہاں میرا قیام تھا؟

یقیناً اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور تھی جو میرے سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ رات بھر
جاگنے کی وجہ سے ذہن پر بھی بوجھ تھا اس لیے کچھ سوچنا لاحاصل ہی تھا۔ میں کسی نتیجے تک نہ
پہنچ سکا۔ اب مجھے ارشاد علی کا انتظار تھا کہ وہ آ جائے تو میں سو جاؤں۔ مجھے بھی ناشتہ بھی کرنا تھا
اور زخم کی ڈریسنگ بھی کرانا تھی۔

ارشاد علی کی واپسی تک میں نے اپنے ذہن کو آزاد چھوڑ دیا۔ ذہن میں کوئی خیال آیا
بھی تو اسے دانستہ جھٹک دیا۔ فی الحال ذہنی سکون کے لیے یہ بہت ضروری تھا۔ ذہن میں
خیالات کا ہجوم ہو اور بہ ظاہر کوئی راہ بھی نظر نہ آئے تو خواہ مخواہ دماغ پر زور ڈالنے سے سوائے
پریشانی کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

میری توقع سے کچھ پہلے ہی ارشاد علی لوٹ آیا۔ وہ سارا ضروری سامان لے آیا تھا۔
ناشتا کرتے ہوئے مجھے ڈاکٹر امتیاز کا خیال آیا تو میرے استفسار پر ارشاد علی نے بتایا۔ "میں ان
سے آنے کے لیے کہہ آیا ہوں جناب!" اب ارشاد علی کے چہرے کی وحشت بڑی حد تک کم
ہو چکی تھی۔

"گھر مل گیا تھا ان کا" آسانی سے؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ پتہ لکھوانے کے علاوہ میں نے ان سے زبانی بھی پوچھ لیا تھا جناب! فریسکو
ہوٹل سے کچھ پہلے اسی طرف ایک گلی.....!"

وہ مجھے پورا پتہ سمجھانے لگا تو میں بات کاٹ کر بولا۔ "کچھ پوچھ تو نہیں رہے تھے ہو'
میرے بارے میں؟"

"نہیں جناب!"

"کہہ دیا تھا ان سے پچھلی طرف سے آئیں؟"

"جی۔"

"اچھا اب چائے اور بنا لاؤ، پھر تم بھی ناشتہ کر لینا" اس دوران میں شاید ڈاکٹر بھی آ جائے۔" میں نے ناشتے کے برتن سرکاتے ہوئے پانی پینے کے لیے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"جی بہتر ہے۔" ارشاد علی نے برتن اٹھائے اور پھر کمرے سے نکل گیا۔

پھر کچھ دیر بعد جب میں چائے پی رہا تھا تو ڈاکٹر امتیاز آ گیا۔ میں نے مسکرا کر اس کا استقبال کیا۔ "آیئے ڈاکٹر صاحب! معاف کیجیے گا، آج آپ کو دو مرتبہ زحمت کرنا پڑی۔"

"کوئی بات نہیں شیخ صاحب!" وہ خوش اخلاقی سے بولا اور کرسی پر بیٹھ گیا، پھر ڈریسنگ کے لیے اپنا بیگ کھولنے لگا، ڈرایسنگ کا سامان نکال کر قریبی میز پر رکھتے ہوئے وہ پھر بول اٹھا۔ "شیخ صاحب مجھے کوئی حق تو نہیں پہنچتا کہ آپ کے ذاتی معاملات میں مداخلت کروں، لیکن پھر بھی کوٹھی کی حالت دیکھ کر حیرت......"

"ارے وہ!" میں ایک دم ہنس پڑا۔ "وہ کوئی خاص نہیں۔" میں اس بات کو ہنسی سے اڑا دینا چاہتا تھا کیوں کہ میرے پاس کوئی مناسب جواب نہیں تھا۔ "بس کچھ دن کی بات ہے، سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔" پھر میں موضوع گفتگو بدلنے کی خاطر بولا۔ "ڈاکٹر صاحب ایک بات پوچھنا تھی آپ سے۔"

"ہاں کہیں۔" وہ میری گردن سے پٹی کھولنے لگا۔

"پہلے آپ ڈریسنگ کر لیں، پھر عرض کروں گا۔" میں نے خوب صورتی سے بات ٹال دی اس لیے کہ حقیقتاً مجھے اس سے کچھ بھی نہیں پوچھنا تھا۔ میں تو اصل معاملے کی طرف سے اس کی توجہ ہٹانا چاہتا تھا۔ وہی کیا، اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو اس کے دل میں یقیناً تجسس پیدا ہوتا۔

ڈاکٹر امتیاز خاموشی سے ڈریسنگ کرتا رہا۔ ڈریسنگ کرنے کے بعد اس نے سامان سمیٹتے ہوئے کہا۔ آپ کچھ پوچھنا چاہتے تھے مجھ سے!"

"ہاں..... کوئی بات تو تھی، ذہن ہی سے نکل گئی۔" میں آہستہ سے ہنس دیا۔ "خیر پھر سہی۔" پھر میں نے اسے مزید کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا۔ "کچھ دن آپ کو پچھلے گیٹ ہی سے آنا پڑے گا۔ سارے ملازمین کو بھی میں نے جواب دے دیا ہے اس لیے کہ میرا زیادہ تر وقت عبادت میں گزرتا ہے۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے، زیادہ بھیڑ بھاڑ ایسے میں ٹھیک نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے میں نے خود کو کوٹھی کے اسی حصے تک محدود کر لیا ہے۔"

معلوم نہیں کہ ڈاکٹر امتیاز میری بات سے مطمئن ہوا یا نہیں، بہرحال وہ مزید پوچھ گچھ

کیے بغیر ٹل گیا۔ ممکن ہے، وہ یہ سمجھا ہو کہ میں اسے کچھ بتانا نہیں چاہتا یا اس کے ذہن میں کوئی اور بات آئی ہو، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ مجھے تو بس چند دن مزید اس کی ضرورت تھی، جب تک میرا عمل پوار نہ ہو جاتا۔ عمل پورا ہونے میں بس اب آٹھ دن رہ گئے تھے اور تم جانتے ہو شمیم نوید کہ ان آٹھ دن کی میری زندگی میں کتنی اہمیت ہے! میں نے تمہیں جب اپنی داستان حیات سنانا شروع کی تھی تو میرے مرنے میں صرف آٹھ رہ گئے تھے۔ میرا ہمزاد مجھے بتا چکا تھا کہ میری زندگی اب ختم ہونے والی ہے۔ سو سال کی مدت پوری ہو رہی تھی جس کے لیے میں نے ہمزاد کو قابو میں کیا تھا، لیکن خلاف توقع صورت حال بدل گئی ورنہ آج میں تمہیں اپنی زندگی کی داستان کا دوسرا باب نہ سنا رہا ہوتا۔ مستقبل میں کس کے لیے کیا ہے، کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ غیب کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں۔ ہاں ہم اپنی عقل کے مطابق قیاس ضرور کرتے ہیں۔ یہ قیاس کبھی درست ثابت ہو جاتا ہے اور کبھی غلط۔ سو میں نے بھی قیاس کیا تھا کہ اب کھیل ختم ہو گیا، بساط الٹ گئی، اب چل چلاؤ ہے، مگر ابھی خاکب دان وجود میں کوئی چنگاری باقی تھی۔ ابھی بہت سے موسم دیکھنا تھے، بہت الم اٹھانا تھے، بہت سے خواب آنکھوں میں سمونا تھے۔ ہرچند کہ مجھے تھکن نہیں تھی، مگر کار ہستی اتنا آسان بھی نہ تھا۔

میں یہ سب کچھ تم سے اس لیے کہہ رہا ہوں کہ مجھے علم ہے، تم میرے الم سمجھتے ہو، تمہیں میری زندگی کے ایک ایک لمحے کا حساب معلوم ہے۔ میں تمہیں ایمان داری اور سچائی کے ساتھ سبھی کچھ بتا چکا ہوں۔ میں نے تم سے کچھ نہیں چھپایا اور مجھے یقین ہے کہ اگر تم نے کبھی میری داستان حیات رقوم کی تو تم بھی کچھ نہیں چھپاؤ گے۔ میرا خبث، میرا کھوٹ، میرا جھوٹ، میری منافقت تم سبھی کچھ لکھ دو گے کہ آدمی بہرحال آدمی ہوتا ہے، فرشتہ نہیں، میں کسی دوسرے پر حکم لگانے کا مجاز نہیں، لیکن اپنی حد تک یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ جھوٹ نفرت، انتقام اور جتنے بھی منفی جذبات ہیں، میری زندگی کا حصہ رہے ہیں۔ اسے تم میرا اعترف بھی کہہ سکتے ہو، ایک سچے آدمی کا اعتراف! شاید آدمی مرتے وقت جھوٹ نہیں بولتا اور یہی کیفیت میری بھی ہے۔ اب پھر وہی آٹھ دن باقی ہیں جن کے بعد کچھ طے نہیں، کیا ہو! ہاں جینے کی تمنا اب بھی ہے اور شاید زندگی کے اخری لمحے تک میرے دل میں یہ تمنا باقی رہے۔

ہاں تو میں تمہیں یہ بتا رہا تھا کہ ان آٹھ دنوں میں مجھ پر کیا گزری! تمہیں شاید میری گزشتہ زندگی کی روشنی میں یہ یقین نہ آئے کہ اس عرصے میں ایک نئے ہی شیخ کرامت نے جنم لیا۔ وہ شیخ کرامت گیا جس نے سو سال کے لیے ہمزاد کو قابو میں کیا تھا تاکہ عیش و نشاط کے ساتھ زندگی بسر کر سکے۔ میں تمہیں تفصیل کے ساتھ بتاتا ہوں کہ اس دوران میں مجھے کیا

واقعات پیش آئے اور میرے اندر اتنا بڑا انقلاب کیسے آ گیا!

عمل کے دوران میں دن کے وقت میرا سونا ضروری تھا تاکہ رات کو نیند کا غلبہ نہ ہو اس لیے اس روز بھی ذہن سے تمام خیالات جھٹک کر میں سو گیا۔ ڈاکٹر امتیاز کے جاتے ہی میں نے اندر سے دروازہ بند کر لیا تھا اور ارشاد علی بھی میرے کہنے پر اپنے کمرے میں سونے چلا گیا تھا۔ وہ بھی میری طرح رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔

معلوم نہیں میں کتنی دیر سویا ہوں کہ ایک تیز چیخ نے میرے اعصاب کو جھنجوڑ دیا۔ میری آنکھ کھل گئی، مگر میں بستر پر ہی لیٹا رہا۔ فوری طور پر میری سمجھ میں کچھ نہ آ سکا تھا کہ کیا ہوا اور وہ چیخ کس کی تھی! میری نگاہ دروازے کی طرف اٹھی تو دیکھا، اندر سے چٹخنی بہ دستور لگی ہوئی تھی۔ چیخ پھر سنائی دی اور اس بار میں سمجھ گیا کہ چیخنے والا کون ہے! یقیناً ارشاد علی ہی چیخ رہا تھا اور اس میں بھی کوئی شک نہیں تھا کہ وہ کسی مصیبت میں پھنس گیا ہے۔ وہ میرا وفادار ملازم تھا۔ میرے سارے ملازمین مجھے چھوڑ گئے تھے، مگر وہ نہیں گیا تھا۔ یہ خیال آتے ہی کہ ارشاد علی کسی مشکل میں گرفتار ہے، میں ایک دم بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اب میں تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

پھر میں نے جیسے ہی چٹخنی گرا کر دروازہ کھولا، ٹھٹک کر رک گیا۔ دروازے کے بالکل سامنے ایک سانپ پھن کاڑھے لہرا رہا تھا۔ یہ سانپ نہیں بلا ہے! کسی نے جیسے میرے اندر سرگوشی کی۔ اسی کے ساتھ خود بہ خود میرے ذہن میں وہ آیات آنے لگیں جو ردِ بلا کے لیے پڑھی جاتی ہیں۔ میں بہ آواز بلند وہ آیات پڑھنے لگا۔ میری نگاہ، سانپ پر جمی ہوئی تھی جو کسی بھی لمحے مجھ پر حملہ کر سکتا تھا۔ چند ہی لمحے بعد خلاف توقع میں نے سانپ کو کچھ مضطرب سا محسوس کیا۔ اس کا لہرانا بند ہو چکا تھا اور اب اس کا پھن آہستہ آہستہ زمین کی طرف جھکتا جا رہا تھا۔ میں نے "قل اعوذ برب الناس" کا ورد اور تیز کر دیا۔ اس وقت میری تمام تر توجہ کا مرکز سانپ تھا اور ارشاد علی کو جیسے بھی بھول ہی گیا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے سانپ کا پھن زمین پر آ رہا۔ یوں جیسے اس پر غشی سی طاری ہو۔ پھر میں نے اسے ایک دم بل کھاتے دیکھا۔ اس کے بعد وہ جیسے تڑپ کر تیزی سے رینگتا ہوا برآمدے کی طرف چلا گیا۔

سانپ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تو معاً مجھے ارشاد علی کا خیال آیا۔ میری نگاہ اس کے کمرے کی طرف اٹھی۔ کمرے کا دروازہ قدرے کھلا ہوا تھا۔ میں اس طرف لپکا۔ ارشاد علی کو میں نے کمرے کے فرش پر بے ہوش پڑا ہوا دیکھا۔ میں نے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تو کافی دیر کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں۔ وہ پھر چیخنے والا تھا کہ میں نے اسے جھنجوڑ دیا۔

"ہوش میں ارشاد آؤ علی!" میں تیز آواز میں بولا۔

"آ..... آپ تو..... زندہ ہیں..... جناب!" وہ ہکلایا۔

"اٹھو!..... اٹھ کر بیٹھو!" میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے اٹھنے کے لیے سہارا دیا۔ اس کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔

میرے سہارا دینے سے وہ کانپتا ہوا اٹھا اور پھر اپنے بستر پر آ گیا۔

"لیٹ جاؤ اور اپنے ذہن سے ہر خوف کو جھٹک دو!" یہ کہہ کر میں قریب رکھی ہوئی صراحی کی طرف بڑھا۔

پانی پینے کے بعد ارشاد علی کے حواس قدرے درست ہوئے۔

"ہاں اب کہو، کیا بات تھی؟ تم ایک دم کیوں چیخنے لگے تھے؟" میں نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھنے لگا تو میں نے اسے دوبارہ لٹا دیا۔ "لیٹے رہو اور جو میں پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دو۔"

"میں..... میں جناب شاید کوئی خواب دیکھ رہا تھا، بڑا بھیانک خواب!..... پھر میری آنکھ کھل گئی تھی۔ خواب میں، میں نے ایک سانپ کو دیکھا تھا جس نے آپ..... آپ کو ڈس لیا تھا اور..... اور آپ کا جسم نیلا پڑ گیا تھا۔" ارشاد علی بتانے لگا۔ "پھر ایک دم آپ مجھے پکارنے لگے تھے۔ اس سے میری آنکھ کھلی تھی۔ آنکھ کھلنے کے بعد بھی مجھے آپ کے پکارنے کی آواز سنائی دی تو میں سمجھا کہ یہ کوئی خواب نہیں، حقیقت ہے۔ میں دروازہ کھول کر جیسے ہی باہر نکلا تو میری نظر اس سانپ پر پڑی۔ وہی سانپ میں نے خواب میں دیکھا تھا۔ سانپ مجھے دیکھتے ہی میری طرف لپکا اور میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ میں پلٹ کر بھاگا اور گھبراہٹ میں گر پڑا۔ سانپ اب میرے قریب آ چکا تھا۔ اسے اپنے قریب دیکھ کر میرے منہ سے پھر چیخ نکل گئی اور..... اور پھر مجھے کچھ یاد نہیں۔ شاید..... شاید میں دہشت کی وجہ سے بے ہوش ہو گیا تھا۔ پھر جب مجھے دوبارہ ہوش آیا تو میں نے آپ کو اپنے پاس دیکھا۔" ارشاد علی یہ کہہ کر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

جو واقعہ پیش آیا تھا، اسے سمجھنا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ شمبھو کے سوا یہ کسی اور کی حرکت نہیں ہو سکتی تھی۔ یقیناً اب وہ کوٹھی کے اس حصے پر بھی قبضہ کرنا چاہتا تھا، اس کا مقصد یہی ہو سکتا تھا کہ میں بھی کوٹھی چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔ اس نے ابتداء کر دی تھی۔

یہ مسئلہ میرا تھا، غریب ارشاد علی کا نہیں۔ گیہوں کے ساتھ خواہ مخواہ گھن بھی پس رہا تھا۔ اگر اسے کچھ ہو جاتا تو میرے ضمیر پر بوجھ سا رہتا۔ وہ میرا ایک وفادار ملازم ہی تھا۔ اب تک وہ ہر طرح سے میرا ساتھ دیتا آ رہا تھا۔ شمبھو سے بعید نہیں کہ اگر مجھ پر بس نہیں چل رہا تو اسے کوئی نقصان پہنچا

دے۔ میں نے سوچا اور پھر ارشاد علی کو سمجھانے لگا۔ اس بار میں خلوص دل سے یہ چاہتا تھا کہ وہ چلا جائے۔ اس پر کچھ تو میرے سمجھانے کا اثر ہوا' کچھ وہ خود ہی خوف زدہ تھا۔ نتیجہ یہ کہ وہ مان گیا۔

"بس چند دن کی بات ہے ارشاد علی!" میں نے اسے تسلّی دی۔ "یہ آٹھ دن کہیں گزار لو پھر آجانا۔"

وہ اس وقت میرے کہنے پر اپنا مختصر سا سامان باندھ رہا تھا۔ اس نے آبدیدہ ہو کر میری طرف دیکھا' مگر کچھ بولا نہیں۔ اس کے پاس اخراجات کے لیے جو رقم رہتی تھی' چلتے وقت میری طرف بڑھانے لگا۔

"رکھ لو' اسے اپنے پاس ہی رکھ لو' میں تمہیں ہمیشہ کے لیے جدا نہیں کر رہا جو تم رقم واپس کر رہے ہو۔" میں نے اس کا شانہ تھپکا۔

اس مرتبہ بھی ارشاد علی نے کچھ نہیں کہا۔ کچھ کہنے کے لیے ہمیشہ لفظوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس نے لفظوں کا سہارا لیے بغیر بھی مجھ سے بہت کچھ کہہ دیا تھا۔ میں اسے اس لیے بھی عقبی دروازے تک چھوڑنے آیا تھا کہ اندر سے کوٹھی کا پھاٹک بند کر لوں۔

"خدا حافظ جناب!" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور گیٹ سے باہر نکل گیا۔

"خدا حافظ!" میں نے جواب دیا اور اندر سے گیٹ بند کرنے لگا۔

اپنے کمرے کی طرف واپسی میں مجھے وہ زمانہ یاد آ رہا تھا جب میں بدایوں کی آبائی حویلی میں تنہا رہا کرتا تھا۔ وہ کھنڈر ایسی حویلی میرا مسکن تھی' جہاں میں اپنی گذر اوقات کے لیے محلے کے بچوں کو پڑھاتا تھا۔ اس وقت میں اکیلا ہی سب کچھ کرتا تھا۔ وہی زمانہ شاید پھر لوٹ آیا تھا۔ میں یہی سب کچھ سوچتا ہوا اپنے کمرے تک پہنچ گیا۔

برسوں میں نے ہنگامہ خیز زندگی گزاری تھی اور آج پہلی بار خود کو تنہا محسوس کر رہا تھا' میں خود اپنے گھر میں رہ کر اجنبی بن گیا تھا' ظہر کا وقت ہو رہا تھا اس لیے میں نے وضو کیا اور پھر مصلّٰی بچھا کر بیٹھ گیا۔ جب وقت ہو گیا تو میں نے نماز پڑھی اور پھر میرے ہاتھ دعا کے لیے اٹھ گئے۔ میں نے انتہائی مشکل اور سنگین حالات میں کبھی حوصلہ نہیں ہارا۔ میری آنکھوں میں آنسو نہیں آئے۔ اس وقت بھی ایسا نہیں تھا کہ میں نے ہمت ہار دی ہو' مگر اس کے باوجود جانے کیوں دعا مانگتے ہوئے مجھ پر رقّت سی طاری ہو گئی۔ پہلی بار مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں واقعی اپنے خدا کے حضور گڑگڑا رہا ہوں۔ یہ کیفیت مجھ پر بہت دیر تک طاری رہی۔ اس کیفیت کے دوران میں مجھ یہ احساس ہی نہ ہو سکا کہ کب میں نے دعا ختم کی' کب مصلے سے اٹھا اور کب بستر پر جا کے لیٹ گیا! جب میں اپنے حواس میں آیا تو میرا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

اس وقت میرے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں اور میرا وجود اس میں کسی تنکے کی طرح گردش کر رہا تھا۔ میرے اندر ٹوٹ پھوٹ ہو رہی تھی' سب کچھ بدل رہا تھا تند و تیز خیالوں کی لہریں مجھے اپنے ساتھ بہائے لیے جا رہی تھیں۔ یہ خود احتسابی کے لمحے تھے۔ میں فرد حساب ماہ و سال پڑھ رہا تھا اور میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں آپ ہی آپ بڑبڑا رہا تھا۔ "روز قیامت میرا اعمال نامہ' میرے دائیں ہاتھ میں نہیں' بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا..... ہاں ایسا ہی ہو گا کیوں کہ..... کہ میں نے اپنے اندر چھپے ہوئے شیطان کو آزاد چھوڑ دیا تھا۔ میں اسی قابل ہوں کہ مجھے جہنم میں جھونک دیا جائے' ہاں..... ہاں میں..... میں ایسا ہی ہوں۔"

جانے کب تک میں بڑبڑاتا رہا' اپنی گزری ہوئی زندگی کے ایک ایک لمحے کا حساب کرتا رہا اور خود پر ملامت کرتا رہا۔ خدا نے مجھے اپنی رحمت سے نوازا تھا۔ مجھے ایک غیر معمولی قوت عطا کی تھی' مگر میں اسے خیر کی جستجو میں صرف نہیں کیا بلکہ مجسّم شر بن گیا۔

کیا میں اب بھی ایسا ہی نہیں کر رہا؟ خود کو دھوکا نہیں دے رہا؟ میری نمازیں منافقت نہیں ہیں؟ کیا میں اس طرح وقتی طور پر اپنی غرض کا خاطر شرافت و عبادت کا لبادہ نہیں اوڑھ لیا؟ کیا میرا مقصد وہی نہیں جو پہلے تھا؟ کیا میں گناہ سے باز آ جاؤں گا؟ کیا میں دوبارہ اپنے ہمزاد کو اسی لیے قابو میں نہیں کرنا چاہتا کہ جہنم کماؤں؟ عیش و نشاط کی محفلیں سجاؤں؟ مجھ پر سوالوں نے جیسے یورش کر دی۔ ان سب سوالوں کے جواب اثبات میں تھے۔

پھر یوں ہوا کہ سینے کی دکھن کم ہونے لگی' آنکھوں کی جلن میں ٹھنڈک سی اترنے لگی' جلتے سلگتے ہوئے جذبوں پر نئے احساسات کی شبنم برسنے لگی۔ میرا جذباتی ہیجان ایک راہ پا کر سکوں آشنا ہونے لگا۔ میں فیصلہ کر چکا تھا کہ ایسا نہیں ہو گا جو ہو چکا ہے۔ میں اب خود کو دھوکا نہیں دوں گا' منافقت چھوڑ دوں گا۔ میرا ظاہر اور باطن ایک ہو گا۔ اگر میں جی گیا تو اب اپنی زندگی کا رخ بدل دوں گا۔ یقیناً اسی فیصلے نے مجھے قلبی سکون فراہم کیا تھا۔ درد دل پر اب مجھے نئی دستکیں سنائی دے رہی تھیں۔ کوئی میرے اندر سرگوشیاں سی کر رہا تھا کہ اے شیخ کرامت! یہ تمہارا نیا جنم ہے اور اس میں بھی تمہیں بڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑے گا۔ تمہارے امتحان کا اصل وقت اب شروع ہوا ہے۔ مجھے اب ہر آزمائش' ہر امتحان قبول تھا' سو میں یہ سرگوشیاں سنتا رہا اور مسکراتا رہا اور اسی حالت میں میری آنکھ لگ گئی۔

جب میں بیدار ہوا تو عصر کا وقت نہیں نکلا تھا۔ اب مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی کیوں کہ صبح کا ناشتا کیے ہوئے تھا۔ پہلے میں نے نماز پڑھی اور پھر پیٹ کی آگ بجھانے کے

لے کمرے سے نکلا۔ اب مجھے کھانے کے لیے خود ہی کچھ نہ کچھ پکانا تھا۔ ارشاد علی کو بہرحال اتنا موقع نہیں مل سکا تھا کہ وہ کھانا پکا کر جاتا۔

اپنے کمرے سے نکلتے ہی مجھے تعفن و بدبو کا سا احساس ہوا۔ ارشاد علی نے میرے کہنے پر اپنے کمرے کے سامنے والی مختصر سی جگہ میں کھانے پکانے کا بندوبست کر لیا تھا۔ میں اس طرف بڑھا تو بدبو اور بڑھ گئی۔ قریب پہنچا تو میں نے دیکھا کہ وہاں ہر طرف غلاظت پھیلی ہوئی تھی اور سارا سامان تتر بتر پڑا تھا۔ میرا جی متلانے لگا۔ اسی وقت مجھے اپنے عقب سے ایک زہریلا قہقہہ سنائی دیا اور میں اچھل پڑا۔ مڑ کر دیکھا تو مجھے دور برآمدے میں ایک عجیب الخلقت شخص کھڑا نظر آیا۔ اس کی داڑھی بے حد بڑھی ہوئی تھی اور سر کے بال جٹاؤں کی شکل میں شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ جسم کی رنگت سیاہ تھی اور وہ گیروے رنگ کا ایک کپڑا اپنے اوپر لپیٹے ہوئے تھا جو اس کے استخوانی جسم کو چھپانے کے لیے ناکافی تھا۔ اس کے سارے وجود میں اس کی بڑی بڑی سرخ آنکھیں سب سے نمایاں تھیں ۔۔۔ جیسے بس آنکھوں میں زندگی اور حرارت ہو۔ چہرے پر سیاہ کھال جیسے منڈھی ہوئی تھی۔ اسے ایک نظر دیکھ کر مجھے جھرجھری سی آ گئی اس نے یقیناً میری بے بسی پر قہقہہ لگایا تھا مجھے یہ سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ وہ کون ہو سکتا ہے! وہ ایک بار پھر زور سے ہنسا اور پھر مجھے مخاطب کیا۔ اس کی آواز نے میرے یقین کی تصدیق کر دی۔ وہ شمبھو ہی تھا، وہی شمبھو اب تک میں نے جس کی آواز ہی آواز سنی تھی۔ آج پہلی بار وہ اپنے اصل وجود میں میرے سامنے آیا تھا۔ وہ مجھ سے کہہ رہا تھا۔ "شیخ اگر تو زندہ رہنا چاہتا ہے تو چلا جا یہاں سے! میں تیرا یہ قصور بھی معاف کرنے کو تیار ہوں کہ تو نے میری محبوبہ کو خراب کر دیا۔"

اس کا آخری جملہ میرے احساس پر جیسے بجلی بن کر گرا۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ وہ سرتا پر فتح پا چکا ہے یا پھر سرتا نے اسے سب کچھ بتا دیا ہے۔ میں طیش کے عالم میں اس کی طرف لپکا۔

"رک جا! وہیں رک جا!" مجھے اس کی آواز سنائی دی۔ "اپنی موت کو آواز نہ دے اور مجھ سے ٹکرانے کی کوشش نہ کر!"

میں نے اس کی آواز سنی تو ضرور، مگر رکا نہیں۔ مجھ پر تو اس وقت ایک جنون سا طاری ہو گیا تھا۔ برآمدے تک پہنچتے ہی جیسے کسی نادیدہ ہاتھ نے مجھے پیچھے دھکیل دیا حالانکہ شمبھو مجھ سے دور کھڑا تھا۔ میں سنبھلتے سنبھلتے بھی اپنے جسم کا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور فرش پر گر پڑا۔ اسی وقت میں نے اپنے اور شمبھو کے درمیان ایک رقصاں شعلہ دیکھا۔

"اٹھ! پھر کوشش کر!" اس نے مجھے چڑایا۔

میں نے غصے کے باوجود اپنے حواس کو بے قابو نہیں ہونے دیا کیوں کہ میں اس کا مقصد سمجھ گیا تھا۔ گرنے کی وجہ سے میری کہنی میں ہلکی سی ضرب آئی تھی۔ میں اسے سہلاتا ہوا فرش سے اٹھا، مگر آگے نہیں بڑھا۔

"کیوں، ہمت جواب دے گئی؟" اس نے میرے زخموں پر نمک چھڑکا۔ میں خاموشی سے اسے گھورتا رہا تو وہ پھر بولا "اگر میں چاہتا تو تجھے اسی وقت جلا کر خاک بھی کر سکتا تھا، مگر ایسا نہیں کیا۔"

"بکواس کرتا ہے تو!" میں بالآخر پھٹ پڑا۔ "اگر یہ تیرے بس میں ہوتا تو کبھی کا تو ایسا کر چکا ہوتا اے بڑبولے؟"

"پوچھ.... پوچھ کہ میں نے ایسا کیوں نہیں کیا؟" وہ بولا۔

مجھے تجھ سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں، سمجھ گیا!" میں نے غصے میں کہا۔

"نہیں پوچھتا تو تجھے خود بتاتا ہوں کہ سرتا نے مجھ سے وچن لیا ہے، میں تجھے قتل نہ کروں۔ اگر تجھے میری بات پر یقین نہیں تو میں اسے یہاں بلاتا ہوں۔" یہ کہہ اس نے بلند آواز میں سرتا کو پکارا۔

چند ہی لمحے بعد میں سرتا کو اس کے قریب کھڑے ہوئے دیکھا اور میری روح میں جیسے کوئی نشتر سا اتر گیا۔ وہ جو کبھی میری تھی، میرے دشمن کے پہلو میں کھڑی تھی اور میں بے بس تھا۔ اسے اپنے دشمن کی گرفت سے آزاد نہیں کرا سکتا تھا۔ میں اسے تحفظ نہیں دے سکتا تھا۔ اس کی سیاہ دراز زلفیں شانوں پر بکھری ہوئی تھیں، دھانی رنگ کی ساری جگہ جگہ سے مسلی ہوئی تھی، آنکھوں کا کاجل پھیلا ہوا تھا، ہونٹوں کی سرخی اڑی اڑی تھی، عارضوں کی شادابی بجھی بجھی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی سوگواری تھی اور آنکھوں میں جیسے رتجگے کی تھکن تھی۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور یہ جھکی ہوئی نظریں مجھ سے بہت کچھ کہہ رہی تھیں، وہ جو میں سننا نہیں چاہتا تھا!

"نہیں!" میں ایک دم چیخ اٹھا۔

میں اس وقت وہ منظر دیکھ کر شاید ایک بار پھر اپنے حواس گنوا بیٹھا تھا۔

"میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا...... زندہ نہیں چھوڑوں گا شمبھو!" میں آپے سے باہر ہو کر چیختا ہوا اس کی طرف دوڑا۔ میں اس لمحے جیسے سب کچھ بھول بیٹھا تھا۔ مجھے یہ ہوش نہیں رہا تھا کہ میرے اور اس کے درمیان ایک شعلہ رقصاں ہے۔

مجھے صرف اتنا ہی یاد ہے کہ میرا وجود جیسے شعلوں میں گھر گیا تھا۔ پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا کہ کیا ہوا! ہوش کھونے سے پہلے میں نے سریتا کی آواز ضرور سنی تھی۔ "یہ تو نے کیا کیا شمبھو.... کیا کیا؟ تو نے تو مجھے وچن دیا تھا کہ....." اس سے زیادہ میں کچھ نہیں سن سکا تھا۔

"اَللہُ اَکبَر..... اَللہُ اَکبَر.....!" یہ وہ الفاظ تھے جو مجھے عالم بے ہوشی سے ہوش کی دنیا تک کھینچ لائے۔ کسی قریبی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہو رہی تھی۔

میں کچھ دیر سمجھ ہی نہ سکا کہ کہاں اور کس حال میں ہوں! بے ہوشی کے بعد جب آدمی ہوش میں آتا ہے، تو عموماً" ایسی ہی کیفیت سے دو چار ہوتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ میرے حواس معمول پر آ گئے اور مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔ میں شعلوں میں گھر گیا تھا۔ یہ خیال آتے ہی مجھے اپنے جسم میں سوزش اور جلن کا احساس ہوا، مگر یہ احساس لحاتی تھا۔ جسمانی طور پر مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ سریتا مجھے شعلوں میں گھرا ہوا دیکھ کر یقیناً یہ سمجھ بیٹھی ہو گی کہ شمبھو مجھے ہلاک کر دینا چاہتا تھا، مگر یہ اس کے سحر کا حصہ تھا۔ اس کا مشاہدہ میں پہلے بھی کر چکا تھا۔ سریتا کو بھی اس نے وقتی طور شدید اذیت دی تھی، یہاں تک کہ سریتا کا جسم نیلا پڑ گیا تھا۔ بہ ظاہر مجھے ایسا ہی لگا تھا کہ وہ بچ نہیں سکے گی، لیکن بعد میں سحر کا اثر ختم ہوتے ہی وہ معمول پر آ گئی تھی۔ میرے ساتھ بھی اس نے ایسا ہی کیا تھا۔

میں ابھی تک برآمدے کے قریب زمین پڑا ہوا تھا اور شعلے برآمدے میں بہ دستور موجود تھے، مگر وہاں نہ اب شمبھو تھا اور نہ سریتا نظر آ رہی تھی۔ ہر طرف نیم تاریکی اور سناٹا تھا جیسے میرے سوا کوٹھی میں کوئی نہ ہو۔

حَیَّ عَلَی الصَّلوٰۃ.... حَیَّ عَلَی الصَّلوٰۃ..... حَیَّ عَلَی الفَلَاح..... حَیَّ عَلَی الفَلَاح..... اَللہُ اَکبَر..... اَللہُ اَکبَر....." میں موذن کی آواز سن رہا تھا۔

آؤ نماز کی طرف.... آؤ نماز کی طرف..... کامیابی کی جانب آؤ..... کامیابی کی جانب آؤ.....

اللہ بہت بڑا ہے...... اللہ بہت بڑا ہے......

موذن کیا کہہ رہا ہے اور کس کی طرف بلا رہا ہے، میں خوب سمجھ رہا تھا۔ وہ جن کے لیے لفظ صرف لفظ ہوتے ہیں اور جو لفظوں کے معنی پر غور نہیں کرتے، ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا، لیکن وہ جو آگہی کی منزلوں سے گزرتے ہوں ان پر بہت کچھ گزر جاتی ہے۔ اس سے قطع نظر آدمی کے اندر کی کیفیت بھی اس ضمن میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ سارا قصہ قبولیت کا ہے ورنہ تو دن میں پانچ بار موذن یہی صدا لگاتا ہے، پھر اتنا اثر کیوں نہیں ہوتا؟ اثر پزیری کا تعلق آدمی کے باطن سے ہے جو اسے آدمی کے انسان کی سطح تک لے جاتی ہے۔ میں بھی شاید انہیں مراحل سے گزر رہا تھا اس

لیے مجھ پر یہ صدا اثر انداز ہوئی اور میں فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر میرے قدم جیسے خود بہ خود اپنے کمرے کی طرف اٹھنے لگے۔

ابھی مکمل طور پر تاریکی نہیں پھیلی تھی، اس کا مطلب یہی تھا کہ مغرب کا وقت ہوا ہے اور مجھ پر زیادہ دیر بے ہوشی طاری نہیں رہی۔ کمرے میں آ کر روشنی کر دی کیوں کہ باہر کی نسبت وہاں اندھیرا تھا۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ کمرے کی کھڑکیاں بند رہتی تھیں اور ان پر پردے پڑے ہوئے تھے۔

نماز پڑھ کر میرے دل کو قدرے سکون تو مل گیا، مگر جب بستر پر دراز ہوا تو پھر وحشت سی ہونے لگی۔ میرے ہی گھر کے در و دیوار میرے لیے آشنا ہونے کے باوجود اجنبی بن گئے تھے۔ اب یہ گھر جیسا اور جس حال میں بھی تھا، اسے میرا گھر نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ہاں یہ میرا گھر نہیں رہا تھا، یہ شمبھو کا گھر تھا۔ اب سے پہلے مجھے ان در و دیوار سے کبھی اتنی وحشت نہیں ہوئی تھی حالانکہ میں یہاں ایک عرصے سے رہ رہا تھا۔ بار بار میری آنکھوں میں سریتا کا چہرہ گھوم رہا تھا اور سماعت میں اس کی آواز گونج رہی تھی۔ "صاحب جی! صاحب جی!....." اور سریتا ہی کیا، دوسری بھی تو تھیں۔ ان پر بھی جانے کیا گزری ہو گی! ان کا قصور یہی تو تھا کہ انہوں نے ہر طرح میری خدمت کی تھی۔ ان پر توڑے جانے والے ممکنہ ستم کا ذمے دار بھی میں خود ہی کو سمجھ رہا تھا۔ وہ میری ہی وجہ سے شمبھو کے چنگل میں پھنس گئی تھیں جو میرے خیال میں اذیت پسند تھا، ذہنی طور پر ایک بیمار شخص! ایسا شخص جو کسی کو اذیت پہنچا کر خوش ہو۔ سریتا کے معاملے میں یہ تماشا خود میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ جو کچھ میں نے دیکھا، وہ بھی میرے لیے انتہائی تکلیف دہ تھا اور جو نہیں دیکھا، اسے سوچ کر بھی میرے دل میں نشتر سے ٹوٹ رہے تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے مجھے سریتا جس حال میں نظر آئی تھی، اسے شاید میں ایک شعر کے حوالے سے زیادہ بہتر طور پر بیان کر سکا ہوں۔

یہ کھُلے کھُلے سے گیسو یہ اڑی اڑی سی رنگت
تری صبح کہہ رہی ہے تری رات کا فسانہ

جن حالات سے میں گزر رہا تھا، ان میں مایوسی کی جذبات کا غالب آ جانا کوئی بعید از قیاس بات نہیں۔ مجھ پر بھی اسی سبب مایوسی غالب آنے لگی۔ میں سوچنے لگا کہ یہ جینا تو کوئی جینا نہ ہوا۔ اس سے تو موت بہتر تھی۔ یوں اپنی ہی نظر میں گرتا تو نہ پڑتا، سینے سے دھواں تو نہ اٹھتا، دل میں کرچیاں تو نہ بکھرتیں، کوئی اس طرح تو میری بے بسی پر قہقہے نہ لگاتا۔ جینے کی آرزو بہت رسوا کرتی ہے، بہت ظلم ڈھاتی ہے۔ شاید میں نے غلط کیا کہ زیادہ جینے کے لیے اپنے ہمزاد کو دوبارہ تسخیر رہا ہوں۔

لمحے قطرہ قطرہ دجلہ وقت کا حصّہ بنتے رہے اور میری روح اس کی بے رحم موجوں میں ڈوبتی

ابھرتی رہی۔ ہر چند کے یہ ساعتیں گنتی کی تھیں، مگر دکھ کی ایک ساعت بھی ایک جگ معلوم ہوتی ہے گویا۔

آنکھ سے پھر ایک آنسو ٹپکا اور پھر ایک جگ بیت گیا۔

انہی اداسی کے لمحات میں نہ جانے کیسے مجھے یہ خیال آ گیا کہ کہیں یہ بھی میرے دشمن کے سحر کا اثر نہ ہو جو میں زندگی سے اس قدر گریز کر رہا ہوں! پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا، پھر آج یہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟ وہاں میرے سوا اور تھا ہی کون جس سے میں سوال کرتا اور جو میرے الم سن کر ان کا تجزیہ کرتا یا میری ڈھارس بندھاتا سو میں خود ہی سوالی تھا اور خود ہی جواب دہ! میں نے یہی سوچا کہ بہرحال یہ ممکن نہیں ہے، اگر واقعی ایسا ہی ہے تو پھر اس کا تدارک کیا ہو؟ اس کا حل یہی تھا کہ میں مایوسی سے بچنے کی شعوری کوشش کرتا اور اپنے اوپر مایوسی کے جذبات کو غالب نہ آنے دیتا۔ پھر میں اسی اضطراب کے عالم میں بستر سے اٹھ گیا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اب میں زیر لب کہہ رہا تھا۔ "نہیں! یہ نہیں ہو سکتا۔ میں موت کو شکست دے دوں گا..... میں اتنی آسانی سے نہیں مروں گا!"

میں نے نفسیات کی کتابوں میں پڑھا تھا کہ اس طرح کی خود ترغیبی بہتر نتائج مرتب کرتی ہے۔ میں اسی پر عمل کر رہا تھا۔ اس کا یہ اثر تو ہوا کہ شدید مایوسی کے جذبات بڑی حد تک ختم ہو گئے، مگر طبیعت کی وحشت کم نہ ہوئی۔ بہ قول غالب۔

در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

جب در و دیوار کی یہ حالت ہو تو آدمی کا یہی جی چاہے گا کہ کہیں دور کھلی فضا میں سانس لے۔ عمل رات کے بارہ بجے سے شروع ہونا تھا اور اس میں ابھی بہت دیر تھی۔ پھر یہ کہ عمل کے لیے اتنی خلوت نشینی بھی ضروری نہیں تھی جتنی میں نے خود پر مسلط کر رکھی تھی۔ میں گھر سے نکل کر کہیں کھلی فضا میں تنہا بیٹھ سکتا تھا۔ نتیجتہ" میں نے لباس تبدیل کیا اور گلے میں ایک بڑا سا رومال اس طرح ڈال لیا کہ ڈریسنگ نظر نہ آئے۔ اپنے کمرے کو مقفل کر کے میں باہر نکلا تو بدبو کا احساس ہوا۔ میں نے باہر کی بتی جلا دی اور دانستہ برآمدے کی طرف نہیں دیکھا۔ برابر والا کمرا ارشاد علی کا تھا جس کے سامنے غلاظت اب بھی یقیناً" اسی خبیث شبھو کی تھی جس کے سبب اب تک میں صبح سے بھوکا تھا۔ اس حصے میں باہر بھی ایک باتھ روم تھا۔ میں وہاں سے بالٹی میں پانی بھر کے لایا اور اس غلاظت کو موری میں بہا دیا۔ پھر میں عقبی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

عقبی دروازے سے باہر آ کے میں نے اس میں بھی تالا ڈال دیا۔ اس کے بعد میں نے پھاٹک کی راہ لی۔ عمارت سے باہر آ کر مجھے ذرا سکون کا احساس ہوا اور میں نے کھلی فضا میں

گہرے گہرے سانس لیے۔ عقبی پھاٹک کا ذیلی دروازہ کھول کر میں باہر آیا اور پھر اسے بند کر دیا۔ اب میں اپنی کوٹھی کی پچھلی گلی میں تھا۔ اس گلی سے نکل کر میں سڑک پر آ گیا۔ زندگی پورے زور و شور کے ساتھ اپنے ہونے کا ثبوت دے رہی تھی۔

جلد ہی مجھے ایک اوسط درجے کا ہوٹل نظر آ گیا اور پہلے میں نے پیٹ کی آگ بجھانے کا فیصلہ کیا۔ اگر میں گھر سے نہ نکلتا تو شاید آج رات بھوکا ہی سونا پڑتا۔ ظاہر ہے کہ ہوٹل میں پرہیزی کھانا تو کیا ملتا، بس جیسے تیسے چائے، بسکٹ اور ڈبل روٹی وغیرہ پر گزارہ کر لیا۔

چاٹگام بڑا پر فضا اور ہرا بھرا شہر ہے۔ سمندر کے کنارے آباد یہ شہر مجھے اچھا لگتا تھا اسی لیے وہاں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ہوٹل سے نکل کر ٹہلتا ہوا میں ایک پارک تک پہنچ گیا۔ یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ وہاں زیادہ لوگ نہیں اور نہ ہی روشنیوں کا ہجوم تھا۔ کافی کافی فاصلے سے بجلی کے کھمبے لگے ہوئے تھے۔ مجھے کسی ایسے گوشے کی تلاش تھی جہاں آس پاس کوئی نہ ہو اور میں کھلی فضا میں تنہا بیٹھ سکوں مجھے اس تلاش میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہاں تک نہ زیادہ روشنی پہنچ رہی تھی اور نہ کوئی نظر آ رہا تھا۔ سرسبز و شاداب گھاس پر میں، رومال بچھائے بغیر بیٹھ گیا۔ میرے عقب میں گھنے پیڑوں کا سلسلہ تھا۔

وہاں بیٹھ کر مجھے فرحت و تازگی محسوس ہوئی۔ طبیعت کی وحشت اب تقریباً" ختم ہو چکی تھی۔ گھر سے نکلنے کا نسخہ کارگر رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ بقیہ جو دن رہ گئے ہیں، میں اس طرح گزاروں گا۔

میرے نزدیک اب صرف پلکوں کی سوئیاں رہ گئی تھیں۔ اپنے چلے کا بڑا حصہ میں نے کسی نہ کسی طرح پورا کر لیا تھا۔ یہاں آنے کے باوجود میرا ذہن حالات کی گرفت سے آزاد نہیں تھا۔ مجھ پر جو کچھ گزر رہا تھا وہ ایسا نہیں تھا کہ آسانی سے بھلا دیا جائے۔

میں اپنے خیالوں میں کھوا ہوا وہاں بیٹھا تھا کہ معاً" مجھے اپنے عقب میں نسوانی سرگوشی کا احساس ہوا، پھر ایک مردانہ آواز سنائی جو مدھم سی تھی۔ کچھ دیر پہلے بھی مجھے کئی بار ایسا شبہ ہوا تھا، مگر اسے اپنا وہم سمجھ کر ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ پھر یہ کہ آدمی جب اپنے ہی خیالوں کا اسیر ہو تو اردگرد سے غافل ہو جاتا ہے۔ میں فطری طور پر اس طرف متوجہ ہو گیا۔ غالباً" ان دونوں کے درمیان کس مسئلے پر بحث ہو رہی تھی اور یہ بحث اب ایسے مرحلے میں داخل ہو چکی تھی کہ احتیاط کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ میں یوں ہی تفریح طبع کی خاطر ان کی سرگوشیاں سننے لگا۔

"ہر وقت بچے بچے! اگر ایسا ہی تھا ثمینہ تو تمہیں میرے ساتھ نہیں آنا چاہئے تھا۔"

"تم یہ کیوں بھول جاتے ہو زاہد کہ میں ایک ماں بھی ہوں۔
تو گویا مرد کا نام زاہد ہے اور عورت کا نام ثمینہ! میں نے سوچا۔
"میں نے اس سے کب انکار کیا ہے! لیکن تمہیں بھی تو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ محض تمہارے عشق میں، میں نے بھی تو اپنا گھر بار چھوڑا ہے۔"
"تو کیا مجھے تم سے عشق نہیں؟" ثمینہ کا لہجہ شکایتی تھا۔ "کیا میں نے قربانی نہیں دی؟ میں اپنے شوہر اور بچّوں کو چھوڑ کر تمہارے ساتھ نہیں آئی؟"
کس کافر کو انکار ہے تمہارے عشق اور تمہارے قربانی سے!" زاہد بولا "میں تو صرف تم سے اتنا کہتا ہوں کہ اپنے ماضی کو بھول جاؤ۔ یہ ڈھاکہ نہیں چاٹگام ہے اور یہاں ہم میاں بیوی کی حیثیت سے رہتے ہیں۔"
"آہستہ بولو۔"
"یہاں میرے اور تمہارے سوا اور ہے کون! اسی لیے تو میں تمہیں یہاں لے کر آیا تھا۔"
"یعنی یہ کہنے کہ میں اپنے بچوں کو بھی بھلا دوں!"
"ایمان داری سے کہو، کیا وہ تمہارے بچے لگتے ہیں؟ کالے کلوتے ..... بالکل تمہارے شوہر پر گئے ہیں۔"
"مگر انہوں نے میری ہی کوکھ سے جنم لیا ہے اور وہ میرا ہی خون ہیں۔"
"ثمینہ! تم بحث کیوں کرنے لگتی ہو؟"
"اور تم ہر بات کو بحث کا نام کیوں دے دیتے ہو؟" ثمینہ بھی ترکی بہ ترکی بولی۔
"دیکھو ان سوال جواب سے کچھ حاصل نہیں۔ اگر تمہیں اپنے کیے پر پچھتاوا ہے تو تم اب بھی لوٹ سکتی ہو۔"
"لوٹ سکتی ہوں..... کیا کہہ رہے ہو تم؟..... اگر لوٹنا ہی ہوتا تو گھر سے باہر قدم کیوں رکھتی، تمہاری بات کیوں مانتی!" ثمینہ کی آواز سے دکھ کا اظہار ہو رہا تھا۔
زندگی کے اسٹیج پر یہ کھیل نیا تھا۔ میں ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سنتا رہا جس سے مجھے بہت سی باتیں معلوم ہوئیں۔ چاٹگام میں ان کا قیام کہاں تھا؟ ڈھاکہ میں وہ لوگ کہاں رہتے تھے؟ عورت اور مرد کی عمروں میں کتنا فرق تھا! اور یہ کہ اس "عشق" کے پس پردہ میں کیا عوامل کار فرما تھے۔
خوب صورت عورتیں چاہے شادی شدہ ہوں یا بچے والی، ناپختہ ذہن رکھنے والے

نوجوانوں کے لیے بڑی کشش رکھتی ہیں۔ زاہد بھی ایک ایسی ہی نوجوان تھا۔ چڑھتی جوانی کے جوش میں وہ زندگی کی تلخ حقیقتوں کو بھول گیا تھا۔ وہ ابھی کنوارا تھا اور اپنی گفتگو سے کسی باعزت خاندان کا فرد معلوم ہوتا تھا۔ ثمینہ کا مسئلہ زاہد سے مختلف تھا، ان معنوں میں کہ وہ شادی شدہ تھی اور تین بچوں کی ماں بھی تھی۔ اس کی شادی کو دس سال کے قریب ہو چکے تھے، اس کا شوہر چڑچڑا، بدمزاج اور بدصورت تھا۔ وہ ان مردوں میں سے تھا جو عورت کو پیر کی جوتی سمجھتے ہیں۔ وہ گھر میں بھی خود کو سرکاری افسر ہی سمجھتا تھا۔ ثمینہ نے اسے ذہنی طور پر کبھی قبول نہیں کیا تھا حالانکہ عام حالات میں عورتیں زندگی سے سمجھوتا کر لیتی ہیں۔ ممکن ہے ثمینہ کی زندگی میں زاہد نہ آتا تو وہ بھی حسن کی دھوپ ڈھل جانے کے بعد ہتھیار ڈال دیتی۔
وہ دونوں ایک دوسرے سے شکوے شکایتیں کر رہے تھے۔ اپنے اپنے ماضی کو دہرا رہے تھے اور شاید انہیں آگے کے لیے کوئی راہ نہیں مل رہی تھی۔ ان کی گفتگو سے مجھ پر یہ بھی ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ اخلاق و شرافت کی حدود سے تجاوز کر چکے ہیں اور اس سلسلے میں کسی ایک کو قصوروار نہیں کہا جا سکتا تھا۔ شادی اس وقت تک ممکن نہیں تھی جب تک ثمینہ کو طلاق نہ ہو جاتی۔ وہ زاہد کی یہ بات ماننے پر آمادہ نہیں تھی کہ بغیر طلاق لیے اس سے دوسری شادی کر لے۔ اس کے علاوہ بچے بھی اس کا ایک بڑا مسئلہ تھے۔ جذباتی ہیجان کا شکار ہو کر وہ اپنے بچوں کو چھوڑ تو آئی تھی، مگر اب اس کی مامتا جاگ گئی تھی۔
دوسروں کے دکھ سکھ سن کر آدمی کچھ دیر کو اپنے رنج و الم بھول جاتا ہے، شاید یہ سوچ کہ دنیا میں ایک وہی دکھی نہیں، کچھ اور لوگ بھی ہیں۔ میرا خیال بھی ایسا ہی تھا ورنہ شاید میں ان دونوں کی گفتگو میں اتنی دلچسپی نہ لیتا۔ ان کا قصہ طول پکڑتا جا رہا تھا۔ دلچسپی کے باوجود میں نے اٹھنے کا فیصلہ کیا کہ مجھ کو پرائی کیا پڑی، اپنی نبیڑ تو! اسی وقت مجھے کھانسی اٹھ آئی۔
"چپ ہو جاؤ، کوئی ہے۔" ثمینہ کی سہمی سہمی سی آواز آئی اور میں نے وقتی طور پر دم سادھ لیا۔ بہرحال مجھ سے ایک اخلاقی جرم سرزد ہوا تھا کہ دانستہ ان کی گفتگو سنی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ان کا شک یقین میں بدلے۔
"ہاں کسی کے کھانسنے کی آواز تو میں نے بھی سنی ہے، مگر....."
"مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔ کہیں شوکت کا ماموں زاد بھائی ارشد نہ ہوا!" ثمینہ نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ شوکت اس کے شوہر کا نام تھا۔
"تمہیں تو بس ہر وقت خوف رہتا ہے۔ یہ پارک ہے، کوئی گذر گیا ہو گا کھانستا ہوا ادھر سے۔" زاہد نے اسے سمجھانا چاہا۔

"نہیں، میں نے قریب ہی سے آواز سنی ہے۔ وہ..... وہ یقیناً ارشد ہو گا اور..... اور اسے شوکت نے خط لکھ دیا ہو گا۔"

"اور ارشد ہمیں تلاش کرتا ہوا یہاں آ گیا ہو گا! یہی نا؟ یہی کہنا چاہتی ہو نا تم؟"

"ہاں..... ہاں یہی۔" ثمینہ جلدی سے بولی۔

"پاگل ہو تم! خدا بچائے عورتوں سے پر کا کوا بنا لیتی ہیں۔"

"دیکھ لو اٹھ کر تو تمہارا کچھ بگڑ جائے گا! ارشد بھی تو یہیں چاٹگام میں رہتا ہے نا!"

"پھر وہی ارشد!"

"اچھا تو پھر گھر چلو۔ میں اب مزید یہاں نہیں بیٹھ سکتی۔" ثمینہ نے فیصلہ سنا دیا۔

"ہم یہاں جھک مارنے نہیں آئے تھے، کوئی فیصلہ کرنے آئے تھے! وہاں گھر میں تمہیں یہ خوف کھائے جاتا ہے کہ کوئی پڑوسی نہ سن لے، دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں تمہیں آج کوئی نہ کوئی فیصلہ کرنا ہی پڑے گا! مجھ سے شادی کرنے پر راضی ہو یا نہیں؟"

"اچھا ٹھیک ہے!..... مگر اتنی بات تو مان لو میری کہ.... کہ اٹھ کر دیکھ لو۔" ثمینہ نے ملتجی لہجے میں کہا۔ "اور ہاں ادھر..... ادھر سے آواز آئی تھی، مگر تم..... تم ادھر سے جاؤ، گھوم کر تاکہ ارشد ہی ہو تو.... تو تم پر اس کا نظر...."

"اتنی عقل مجھ میں بھی ہے!" زاہد ناگواری سے بولا۔ "گھوم کر ہی جاؤں گا۔ ویسے تمہارے اطمینان کے لیے دیکھے لیتا ہوں ورنہ مجھے یقین ہے، ہو گا کوئی نہیں۔" اسی کے ساتھ مجھے قدموں کی دور ہوتی چاپ سنائی دی۔

یہ موقع غنیمت تھا کہ میں خاموشی کے ساتھ وہاں سے اٹھ جاتا۔ میں بہت احتیاط سے کھڑا ہو گیا اور پھر دبے قدموں آگے بڑھنے لگا تاکہ وہ عورت خوف زدہ ہو کر چیخ نہ اٹھے۔ ابھی میں چند ہی قدم چلا ہوں گا کہ عقب سے اسی عورت کے چلانے کی آواز سنائی۔ "ٹھہرو!..... ٹھہر جاؤ! مجھے اکیلا چھوڑ کر نہ جاؤ!"

میں یہی سمجھا کہ وہ مجھے نہیں اپنے نوجوان عاشق کو پکار رہی ہے۔ شاید وہ نیم تاریکی اور تنہائی میں ڈر گئی ہو گی۔ میں نے اپنی رفتار اور بڑھا دی۔ گھاس کا وہ قطعہ میں جلد سے جلد عبور کر کے روشنی میں پہنچ جانا چاہتا تھا۔

"میں کہتی ہوں رک جاؤ ورنہ میں شور مچا دوں گی!" اس بار اس کی آواز مجھے اور نزدیک معلوم ہوئی۔ "تم مجھے یہاں چھوڑ کر نہیں بھاگ سکتے!" اسی کے ساتھ قدموں کی چاپ بھی سنائی دی۔

وہ اتنی زور زور سے چیخ رہی تھی کہ لوگ، پارک کے کونوں کھدوں سے نکل کر اس طرف دوڑنے لگے۔

میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ رات کے وقت کوئی عورت اس طرح پارک میں چیخنے لگے تو ظاہر سی بات ہے، کیا صورت حال پیش ہو آ سکتی ہے۔ معلوم نہیں اس کا عاشق نامراد کہاں مر گیا تھا اور وہ کم بخت کیوں بولا گئی تھی! بہر حال میرے حق میں یہ بہتر نہیں تھا۔ لوگ مجھی پر شک کرتے اور مجھی کو تختہ مشق بنانے کی کوشش کرتے کیوں کہ وہاں میرے اور اس عورت کے سوا کوئی نہیں تھا۔

پارک میں ایک ہنگامہ سا ہو گیا تھا۔ سامنے سے بھی لوگ بھاگے چلے آ رہے تھے اور ادھر اُدھر سے بھی میرے لیے کوئی راہ مفر نہیں، یہ سوچ کر میں رک گیا۔ ایسے میں بھاگ اٹھنا خود کو مشتبہ بنانے کے مترادف تھا۔ رکتے ہی میں نے مڑ کر دیکھا۔ ایک دراز قد عورت میرے بالکل قریب پہنچ چکی تھی۔ وہ ساری باندھے ہوئے تھی اور واقعی قابل دید تھی۔ اسے دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ تین بچوں کی ماں ہو گی، مگر یہ وقت اس کے حسن کی نیرنگیوں کے جائزے کا نہ تھا۔ میں نے اس لیے بھی اسے مڑ کر دیکھا تھا کہ اگر وہ کسی غلط فہمی کا شکار ہے تو اس کی غلط فہمی دور ہو جائے۔

"دماغ درست ہے تمہارا؟" مجھے اس پر غصہ آ گیا اور جھٹکا دے کر اپنا بازو چھڑانے لگا۔ مگر اس کی گرفت سخت تھی۔ میں اپنا بازو چھڑانے میں کامیاب نہیں ہوا۔ وہ یقیناً ہنگامے سے خوف زدہ ہو گئی تھی اور اب شاید مجھے اپنا آلہ کار بنانا چاہتی تھی۔

اسی دوران میں لوگ ہم دونوں تک پہنچ چکے تھے۔

"چھوڑو میرا بازو!" میں نے لوگوں کی پروا نہ کرتے ہوئے سخت لہجے میں اس سے کہا۔ میں کسی طرح کی گھبراہٹ کا مظاہرہ کر کے لوگوں کی نظر میں مجرم ثابت ہونا نہیں چاہتا تھا۔

"اے! یہ عورت کیوں چیخ رہی تھی؟ کیا کر رہے تھے تم یہاں؟" ایک شخص نے براہ راست مجھے انتہائی ناشائستہ لہجے میں مخاطب کیا۔

"مجھے کیا خبر کیوں چیخ رہی تھی!" میں نے بھی ناگواری سے جواب دیا۔

"یہ ویسے ہی تمہارا بازو پکڑے کھڑی ہے!" کوئی اور سر پھرا بولا۔ "بتاؤ کون ہے یہ تمہاری؟"

"کوئی نہیں۔ میں جانتا ہے! یہ خواہ مخواہ میرے گلے پڑ رہی ہے کیوں کہ اسکا....."

"کوئی نہیں ہوں میں تمہاری!" وہ تقریباً چیخ اٹھی۔ "خواہ مخواہ گلے پڑ رہی ہوں تمہارے! تم..... تم اسی لیے مجھے ڈھاکے سے بھگا کر لائے تھے!"

"بھگا کر لایا تھا!" کئی حیرت زدہ آوازیں ابھریں۔

اب میری قوتِ برداشت جواب دے گئی تھی۔ وہ اپنی گلو خلاصی کے لیے مجھے ہدفِ ملامت بنا رہی تھی۔ پہلے میرے دل میں اس کے لیے ایک ماں ہونے کے ناتے جو ہمدردی کے جذبات پیدا ہو گئے تھے' ان پر افسوس ہوا۔ وہ بہت عیّار عورت تھی۔ میں نے غصے میں یہ خیال بھی نہیں کیا کہ وہ صنفِ نازک ہے' اس کے ساتھ یہ سلوک مناسب نہیں' اسے دھکا دے کر اپنا بازو چھڑا لیا۔

پھر تو جیسے قیامت آ گئی۔ لوگوں کی "غیرت" اور مردانگی بھلا یہ کیسے برداشت کر سکتی ہے کہ ان کے سامنے کسی حسین اور خوب رو عورت کو یوں دھکا دے دیا جائے!

"ابے تو بڑا بے غیرت ہے مردود!"

"ایک تو اس عورت کو بھگا کر لایا ہے' اس پر حرمزدگی دکھا رہا ہے!"

"کوئی عورت اسے معاملے میں جھوٹ بول سکتی ہے' اس کا کمینہ پن معلوم ہوتا ہے!"

ہر طرف سے جیسے مجھ پر آوازوں کے پتھر برسنے لگے اور ادھر اس عورت پر ایک جنونی کیفیت سی طاری ہو گئی' اس نے جھپٹ کر میرا گریبان پکڑ لیا۔ "میں تمہارا اور اپنا خون ایک کو لوں گی' مگر تمہیں بھاگنے نہیں دوں گی۔ تم نے مجھے دنیا کے سامنے منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا!! اور اب ..... اب تم مجھے یہاں بٹھا کر' دھوکا دے کر خاموشی سے بھاگ جانا چاہتے تھے! اسی کے ساتھ اس نے میرے گریبان کو جھٹکا دیا۔

بھیڑ ہی میں سے کسی پولیس کو بلانے کا مشورہ دیا اور میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔

"ٹھہریں! بات سنیں میری۔" میں نے بلند آواز میں کہا۔ "میں بتاتا ہوں آپ لوگوں کو اصل معاملہ کیا ہے!"

"تم کیا بتاؤ گے' میں ہی بتائے دیتی ہوں' اب چھپانا کیا!" میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ بول اٹھی۔

"ہم اسے بھاگنے نہیں دیں گے' اس کا گریبان چھوڑ دو۔" کسی نے اس عورت سے کہا۔ شاید اسے میری حالت پر رحم آ گیا تھا۔

عورت نے مجھے قہر آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے گریبان سے چھوڑ دیا۔ پھر کہنے لگی۔

"اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ چاٹگام چل کر تم سے شادی کر لوں گا۔ ایک مہینہ ہو گیا ٹالتے

ہوئے۔ میں بھی کوئی ایسی ویسی نہیں ہوں' قبر تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑوں گی!" وہ اب مزید جارح ہو گئی تھی اور بے حجاب بھی۔ "میں نے ایسے بہت قصے اخباروں میں پڑھے ہیں ...... میں اس انتظار میں تھی کہ کب یہ میرے ساتھ ایسا چکّر چلائے اور کب میں اسے ذلیل و رسوا کر روں! میں تو اسے خود تھانے تک لے جاؤں گی!"

"شیر کی بچی لگتی ہے' یہ نہیں چھوڑے گی اسے!" کسی نے تبصرہ کیا۔

"جھوٹ بولتی ہے یہ' بکواس کرتی ہے!" میں چیخ اٹھا۔ "میرا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ آج سے پہلے میں نے اسے دیکھا بھی نہیں تھا۔ اس کا نوجوان عاشق اسے چھوڑ کر بھاگ گیا ہے تو یہ میرے پیچھے پڑ گئی ہے۔ میں تو یہاں ....." پھر اس عورت کے بار بار مداخلت کرنے کے باوجود میں نے لوگو کو جیسے تیسے اصل کہانی سنا ہی دی۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ کچھ میرے ہم نوا بھی ہو گئے۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ بھلا ایسی حسین و خوب صورت عورت کو قبول کرنے سے کون کافر منہ پھیرے گا!

"جھوٹا ہے یہ! ...... بہت جھوٹا ہے!" وہ چیخنے لگی۔ اسی کے ساتھ اس نے عورتوں کا وہ مخصوص ہتھیار بھی استعمال کیا جو مردوں کی عقل پر پردہ ڈال دیتا ہے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ پھر اس نے جو کچھ کہا۔ اسے سن کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔' وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔ "پوچھیں اس سے ..... قسم لے کر پوچھیں' کیا اس کا نام شیخ کرامت نہیں ہے؟ ..... یہ کہہ رہا تھا نا ابھی کہ ..... کہ اس نے مجھے آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا! ...... پوچھیں اس سے!"

اب مجھے معاملے کی سنگین نوعیت کا احساس ہوا' میں اب تک غلط خطوط پر سوچتا رہا تھا۔ معاملہ وہ نہیں تھا جو بہ ظاہر نظر آ رہا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اسے میرا نام ہرگز معلوم نہ ہوتا۔

"بول میاں! ٹھیک ہے یہ بات؟" کوئی مجھ سے بولا۔ "تیرا نام یہی ہے نا؟"

اس سے پہلے کہ میں کچھ بولوں' وہ پھر چیخنے لگی۔ "یہ بھی پوچھیں اس سے کہ کیا یہ بدایوں کا رہنے والا نہیں ہے؟ اور یہاں یہ کہاں رہتا ہے' کہاں رکھا ہے مجھے یہ بھی ...."

"بس بس! ہمیں یقین آ گیا کہ یہ فراڈیا ہے! تم اسے تھانے لے چلو' ہم بھی چلتے ہیں ساتھ!" ایک نوجوان نے گویا فیصلہ سنایا۔

"اس کی ضرورت نہیں۔" میں بول اٹھا۔ میرے لہجے میں خجالت کا عنصر تھا۔ "غلطی میری ہی ہے۔" یہ کہہ کر میں' عورت سے مخاطب ہوا۔ "ثمینہ! مجھے معاف کر دو۔ میں تمہیں خدا کا واسطہ دیتا ہوں۔"

"نہیں، میں تمہیں ہرگز معاف نہیں کر سکتی!" وہ اکڑ کر بولی۔ "تم دھوکے باز ہو!"

"جو چاہے سزا دے لو، مجھے ہر سزا منظور ہے، مگر... مگر معاف کر دو مجھے!" میں نے دانستہ اپنی آواز میں رقت پیدا کر لی۔

لوگ بڑی حیرت سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ میرے اور اس کے درمیان جو سرد جنگ جاری تھی، اسے میں ہر حال میں جیتنا چاہتا تھا۔

"یہ دونوں ہی آوارہ لگتے ہیں، لعنت پڑھو ان پر!" کسی ادھیڑ عمر شخص نے زور سے لاحول پڑھی اور وہاں سے چل دیا۔ دو ایک آدمی اس کے ساتھ بکتے جھکتے اور چل دیے، مگر ظاہر ہے کہ نوجوان بھلا کیسے وہاں سے ٹل جاتے! وہ تو اس کہانی کا آخری منظر دیکھنے کے آرزو مند تھے او ضرورت پڑنے پر "ایک مجبور بے بس حسینہ" کی ہر طرح مدد کرنا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ اب اس تماشے سے مزہ بھی لے رہے تھے۔

ثمینہ کی آنکھوں میں اب مجھے کچھ الجھن اور پریشانی کے سے آثار نظر آ رہے تھے اور میں مسلسل اس کی خوشامد کیے جا رہا تھا، یوں جیسے کوئی اپنے روٹھے ہوئے محبوب کو منا رہا ہو۔ ثمینہ کچھ کھوئی کھوئی سی دکھائی دے رہی تھی۔ میری ساری کوشش یہ تھی کہ وہاں موجود افراد کی ہمدردیاں حاصل کر لوں۔

"مان جاؤ، مان جاؤ!" کسی نے ثمینہ کی طرف دیکھ کر ہانک لگائی۔ "مرد بچے کو اتنا نہیں ستاتے۔"

"اس نے بھی تو مجھے ستایا ہے! میں اسے کیسے معاف کر دوں!" وہ پھر بھپرنے لگی، مگر اس بار اس کی "آہ و بکا" کا کچھ زیادہ زیادہ اثر نہیں ہوا۔ "میں اسے نہیں چھوڑوں گی!"

"تو وہ کب تمہیں چھوڑ رہا ہے! راضی تو ہے، اور کیا چاہیے تمہیں؟"

"نہیں، میں اسے پولیس کے حوالے کیے بغیر نہیں رہوں گی۔"

"تم بھی پھنس جاؤ گی۔ وہ تمہیں بھی بند کر دیں گے۔" کسی نے سمجھایا۔ "تم شاید جانتی نہیں پولیس والوں کو!"

"کر دیں بند!" اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا، پھر ذرا توقف سے بولی۔ "تم لوگ بھی میرے ساتھ چلو تھانے۔"

تھانے کا نام سن کر ایک آدھ نوجوان تو راضی ہو گیا، بقیہ بغلیں جھانکنے لگے۔ میں نے اس موقع سے پورا فائدہ اٹھایا۔ "پولیس والے اکثر گواہوں کو بھی حوالات کی سیر کرا دیتے ہیں، یہ خیال رکھنا!" اس کے بعد میں نے ثمینہ سے کہا۔ "بات نہ بڑھاؤ ثمینہ۔ میں کل ہی تم سے

شادی کر لوں گا۔"

میری دھمکی کا اچھا اثر ہوا، کچھ اور لوگ چھٹ گئے۔

"میں لعنت بھیجتی ہوں شادی پر اور تم پر بھی!"

"تم جانو۔" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ "اگر تم تھانے ہی چلنا چاہتی ہو تو چلو، میں تیار ہوں چلنے پر!"

"ہاں چلو!" اس نے میرے بازو کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"میں بھگا نہیں جا رہا جو تم مجھے پکڑ رہی ہو! تم بھی تماشا بنو گی اور میں بھی! تھانے ہی چلنا ہے تو سیدھے سیدھے چلی چلو۔" میں ذرا ہٹتے ہوئے بولا، پھر تماشائیوں سے مخاطب ہوا۔ "تم میں سے جو بھی تھانے چلنا چاہتا ہے، چلے!"

"جھگڑا تم دونوں کا ہے، ہم کیوں جائیں تھانے! ہماری بلا سے جہنم میں جاؤ تم!" یکے بعد دیگرے اسی طرح کے جملے سنائی دیے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بس ایک ہی "شیر دل" نوجوان تھانے تک چلنے پر آمادہ ہوا۔ وہ "شیر دل" بھی ایسا تھا کہ پھونک مارو تو ہوا میں اڑ جائے۔ ایک ہاتھ کا نہیں تھا اور عمر بھی تیئس چوبیس سے زیادہ نہیں ہو گی۔ وہ بڑی میٹھی میٹھی نظروں سے ثمینہ کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا معاملہ بھی ثمینہ کے نوجوان عاشق زاہد سے مختلف نظر نہیں آتا تھا۔ ثمینہ کے ایما پر اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں اس کی حماقت پر دل ہی دل میں ہنس دیا۔ وہ اس طرح ثمینہ کی طرف بار بار نظر اٹھا رہا تھا جیسے اپنی "بہادری" کی داد وصول کرنا چاہتا ہو۔

"چلو! ثمینہ مجھ سے مخاطب تھی اور اس نوجوان سے بھی۔

میں کسی احتجاج کے بغیر ان دونوں کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ویسے بھی اب رات زیادہ ہو چکی تھی، پارک میں اکا دکا آدمی ہی نظر آ رہا تھا۔ کوئی ہمارے طرف متوجہ نہیں ہوا۔ میں یہی چاہتا بھی تھا۔ پارک سے نکل کر ہم سڑک پر آ گئے۔ علاقے کا تھانہ وہاں سے دور تھا، مگر یہ بات غالباً اس نوجوان کو معلوم نہیں تھی۔ وہ اس لیے ثمینہ سے مخاطب ہوا۔ "کدھر چلنا ہے؟..... تھانہ معلوم ہے آپ کو؟"

"ہاں معلوم ہے۔" ثمینہ خلاف توقع بولی اور میں ایک بار پھر چونک اٹھا۔ ثمینہ کے اس جواب نے میرے اس خیال پر مہر تصدیق ثبت کر دی تھی کہ اس وقت وہ کسی کی آلہ کار بنی ہوئی ہے، اور وہ ہستی کون ہو سکتی ہے، یہ مجھے اچھی طرح معلوم تھا پھر ثمینہ نوجوان کی رہنمائی کرنے لگی۔ میں خاموش رہا۔ "اس طرف ..... ادھر..... اس گلی میں!" ثمینہ صحیح

راستے پر لے جارہی تھی۔

ثمینہ اور اس کے عاشق کی گفتگو سے مجھے یہ علم ہو چکا تھا کہ کم از کم ثمینہ کے لیے چاٹگام ایک اجنبی شہر ہے، لیکن اس وقت ایسا قطعی معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ وہ نوجوان بھی اتنا گھامڑ تھا کہ اس نے اس سلسلے میں ثمینہ سے کوئی سوال نہیں کیا۔ میں اس تمام کھیل کا مقصد اچھی طرح سمجھ رہا تھا، اسی کے ساتھ یہ بھی طے کر چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے! اس مصیبت سے کس طرح جان چھڑانا ہے! یہ معاملہ پولیس تک پہنچ جاتا تو میرے لیے بڑی مشکلات پیدا ہو جاتیں۔ نرس نادرہ کے سلسلے میں بھی مجھے اسی سے ملتی جلتی صورت حال پیش آ چکی تھی۔ پولیس سے جان بچانے کے لیے مجھے بڑے پاپڑ بیلنا پڑے تھے۔ پولیس کو بار بار اس معاملے میں ملوث کرنے کا بس ایک ہی مقصد تھا کہ کسی طرح میں کوئی رات حوالات میں گزارنے پر مجبور ہو جاؤں۔ اسی میں میرے دشمن کی فتح تھی۔ یا پھر میں وقت پر عمل نہ کر سکوں۔ اب تک میں اپنی خود اعتمادی اور بیدار مغزی کے سبب اس کے ہر حربے کو ناکام بناتا آرہا تھا۔ میں نے یقیناً گھر سے نکل کر غلطی کی تھی۔ شاید اس کا سبب یہ تھا کہ شمبھو نے میری عقل خبط کر لی تھی اور میں اپنی اصل دشمن مہ پارہ کو بھول گیا تھا۔ اب مجھے یقین آ چکا تھا کہ ثمینہ کے معاملے میں مہ پارہ ہی نے موقع سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اس سلسلے میں وہ عورت قطعی بے قصور تھی، بالکل اسی طرح جیسے نرس نادرہ کا کوئی قصور نہیں تھا۔ جب ثمینہ، مہ پارہ کے سحر سے آزاد ہو جاتی تو خود اسے اپنے کیے پر ندامت ہوتی۔ ثمینہ کے نوجوان عاشق زاہد کو بھی مہ پارہ ہی نے بھٹکا دیا ہو گا۔ معلوم نہیں، اس وقت وہ کہاں اپنی محبوبہ، دل نواز کو تلاش کرتا پھر رہا ہو! یہی سب کچھ سوچتا ہوا میں ان دو اجنبیوں کے ساتھ چلتا رہا جنہیں حقیقتاً مجھ سے کوئی پرخاش نہیں تھی اور نہ ہی انہیں اصل معاملے کا علم تھا۔

تھانہ اب زیادہ دور نہیں رہ گیا تھا اس لیے مجھے جو کچھ کرنا تھا، اب اس میں تاخیر نقصان دہ ہو سکتی تھی۔ اس وقت موقع بھی تھا۔ میری بائیں جانب جو علاقہ تھا، میرا دیکھا بھالا تھا۔ میرے ذہن میں پہلے سے یہی جگہ تھی کہ یہاں تک پہنچ کر میں کوئی داؤ دکھا سکتا ہوں۔ ہم ایک چھوٹی سی سڑک سے گزر رہے تھے جس پر کچھ دور چلنے کے بعد دائیں جانب اس علاقے کا تھانہ تھا۔ میں دانستہ بائیں طرف چل رہا تھا۔ میرے ساتھ وہ نوجوان تھا جو اب تک شاید اپنی دانست میں میرے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا۔ اسی کے ساتھ ثمینہ قدم سے قدم ملا کر چل رہی تھی۔

اچانک چلتے چلتے میں نے جھٹکا دے کر نوجوان سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور پھر اسے ثمینہ کی

طرف دھکیل دیا۔ یقیناً وہ اس افتاد کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا۔ وہ تو شاید یہ سمجھ رہا تھا کہ میں سیدھے سبھائے تھانے جا رہا ہوں اور یہ کہ میں نے ثمینہ کے آگے ہتھیار ڈال دیے ہیں، مگر جب یہ صورت حال پیش آئی تو اس کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی اور یہی حال ثمینہ کا ہوا۔

وقت ضائع کیے بغیر میں بائیں جانب ایک پتلی سی گلی میں گھس کر دوڑنے لگا۔ مجھے اپنے عقب سے ثمینہ کی چیخ و پکار سنائی دے رہی تھی۔

"پکڑو...... پکڑو!...... وہ بھاگا جا رہا ہے!"

"پکڑو پکڑو" کے شور کا لوگوں نے کچھ اور ہی مطلب لیا وہ یقیناً سمجھے ہوں گے یہ کوئی چوری چکاری کا معاملہ ہے۔

میں نے اپنے عقب میں لوگوں کے دوڑنے کی آوازیں سنیں۔ دوڑتے ہوئے وہ "چور چور" کی آوازیں بلند کر رہے تھے۔ یہ صورت حال میرے لیے غیر متوقع نہیں تھی اسی لیے خود میں بھی "چور چور" چیختا ہوا بھاگنے لگا۔ چور عموماً ایسے موقعوں پر یہی کرتے ہیں۔ میں ایک گلی سے دوسری گلی میں اور دوسری سے تیسری میں بھاگ رہا تھا۔ گلیوں میں بھگدڑ سی مچ گئی تھی۔ جو بھی کسی گھر سے نکلتا بس بغیر کچھ پوچھے گچھے احمقوں کی طرح منہ اٹھا کر بھاگنے لگتا۔

ایک گلی میں پہنچ کر میں نے اپنی رفتار ذرا آہستہ کر دی اور اپنے پیچھے دوڑنے والوں کو دانستہ قریب آنے دیا۔ آگے جا کر گلیوں کا ایک تراہا سا تھا۔ میں اب بھی لوگوں کی آواز میں آواز ملائے چیختا ہوا بھاگ رہا تھا۔

پھر میں نے وہی کیا جو ایسے مواقع پر چور کرتے ہیں۔ چور کی تلاش میں قریب آ جانے والوں کے استفسار پر میں نے انہیں ایک طرف دوڑا دیا اور خود دوسری گلی میں مڑ گیا۔ اب میں دوڑنے کی بجائے تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ عموماً لوگ اس طرف متوجہ ہوتے ہیں جدھر شور سنائی دے رہا ہو اس لیے مجھے اطمینان تھا اور یہ اطمینان غلط ثابت نہیں ہوا۔

میں جلد سے جلد گلیوں کے اس جال سے نکل کر ایک سڑک پر پہنچ گیا اور پھر مجھے اپنی کوٹھی تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ مہ پار کا حربہ پورے طور پر ناکام ہو چکا تھا۔ اس وقت رات کے ساڑھے دس بجے رہے تھے اور عمل شروع کرنے میں ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا۔

عقبی پھاٹک کا ذیلی دروازہ کھول کر اپنے حواس کو قابو میں رکھتے ہوئے میں نے احتیاطاً "رونگلا" کی آیات کا ورد شروع کر دیا۔ اپنے کمرے تک پہنچتے ہوئے بہ ظاہر مجھے کوئی تبدیلی

محسوس نہیں ہوئی، سب کچھ جوں کا توں تھا۔ برآمدے کی طرف بھی میری نظر گئی تھی مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ عمارت میں سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ کپڑے تبدیل کر کے میں باہر آ گیا۔ ایک طویل عرصے کے بعد میں نے چولہے کو ہاتھ لگایا تو عجیب سا محسوس ہوا۔ کھانا پکائے مجھے برسوں ہو گئے تھے، لیکن اپنے ہمزاد کے لیے تو مجھے روٹی ڈالنا ہی تھی جو صبح کے وقت میں ایک قریبی چوراہے پر جا کے رکھ آتا تھا۔

روٹی ڈالنے کے بعد احتیاط کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے آٹا، گھی اور دیگر ضروری اشیاء وہاں سے اٹھا کر اپنے کمرے میں رکھ دیں۔ اس خبیث شمبھو سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ مجھے تنگ کرنے کی خاطر مزید کوئی گڑبڑ کر دیتا۔ ابھی مجھے عمل شروع کرنے میں کچھ وقت درکار تھا اس لیے تھوڑی دیر آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا کیوں کہ رات بھر جاگنا تھا۔ کمرے کا دروازہ ابھی میں نے بند نہیں کیا تھا۔

شمبھو نے مجھے دھمکی دی تھی کہ میں کوٹھی چھوڑ کر چلا جاؤں اور یہ آج ہی کی بات تھی۔ اس وقت میں اسی دھمکی پر غور کر رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ عمل کے دوران میں یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ وہ اگلا قدم کیا اٹھا سکتا ہے؟ یہ ممکن تھا کہ سریتا نے اس سے میری جان بخشی کی التجا کی ہو اس لیے کہ وہ لڑکی بہرحال مجھ سے محبت کرتی تھی، مگر شمبھو میرے نزدیک اتنا شریف نہیں تھا جو اپنے عہد کی پاس داری کرتا۔ وقتی طور پر اپنی مطلب براری کے لیے تو وہ سریتا سے کوئی ایسا وعدہ کر سکتا تھا لیکن اس کا وعدے پر قائم رہنا ضروری نہیں تھا۔

کافی غور و خوض کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ جو لوگ کچھ کرنے پر قدرت رکھتے ہیں، انہیں دھمکیاں دینے کی ضرورت نہیں ہوتی، انہیں جو کرنا ہوتا ہے، کر گزرتے ہیں۔ کوٹھی کے اس حصے پر تصرف نہ ہونے کا ایک ہی سبب میری سمجھ میں آتا تھا، وہ کہ میں یہاں ہمزاد کا عمل کر رہا تھا اور میرا عمل رحمانی تھا۔ میں یہاں قرآنی آیات کا ورد کرتا تھا۔ میں اب تک اپنے دشمنوں کے مقابل اسی لیے جما ہوا تھا اور میرے دشمن اسی لیے مجھے زیر نہ کر سکے تھے کہ میں شیطان سے کہیں بڑی اور عظیم طاقت کی پناہ میں تھا۔ مہ پارہ بھی شیطانی علوم کی ماہر تھی اس لیے اس کی روح عذاب میں تھی، بھٹکتی پھر رہی تھی اور شمبھو وہ بھی میرے نزدیک شیطان ہی کا دوسرا روپ تھا۔ اس نتیجے پر پہنچ کر مجھے اطمینان قلب حاصل ہوا اور میں بستر سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ہمزاد کے عمل کا وقت قریب آ پہنچا تھا۔ میں نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا۔

اس رات عمل کے دوران میں صرف اتنا ہوا کہ مجھے سریتا اور دوسری ملازماؤں کے چیخنے اور چلانے کی آوازیں سنائی دیتی رہیں جن پر میں نے کان نہیں دھرا۔

دو روز اور بغیر کسی قابل ذکر واقعے کے گزر گئے۔ میں اس دوران میں اپنی پناہ گاہ سے نہیں نکلا کیوں کہ ایک تلخ تجربے سے گزر چکا تھا۔ ثمینہ ابھی تک میرے حافظے میں تھی۔ خدا جانے اس پر کیا بیتی ہو گی! اگر وہ مجھے عام حالات میں ملی ہوتی اور میں نے گناہوں سے توبہ نہ کی ہوتی تو وہ ایسی نہیں تھی کہ اسے نظرانداز کیا جا سکے۔ اتنا حسن ہر ایک کے حصے میں نہیں آتا، لیکن شاید اصل چیز انسان کے اندر کا حسن ہے! اور اس کے اندر کا یہ حسن، کردار اور عمل کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔ اب تک میں ظاہری حسن پر جان نچھاور کرتا رہا تھا، مگر شاید میں غلطی پر تھا۔ اب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا اور اس غلطی کو دہرانا نہیں چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے دانستہ ثمینہ کے خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ یقیناً وہ اندر سے حسین نہیں رہی ہو گی ورنہ گناہ کے راستے پر قدم رکھتے ہوئے اسے ایک بار یہ ضرور خیال ہوتا کہ وہ ماں بھی ہے۔ پھر شاید اس کے قدم رک جاتے۔ اگر اسے شوہر سے سکھ نہیں ملا تھا تو وہ اپنے بچوں میں اپنی خوشیاں تلاش کر لیتی۔ میرے نزدیک مجرم اس کا شوہر بھی تھا جس نے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ ایک عورت انتہائی فیصلہ کرنے پر مجبور ہو گئی۔ اس کے باوجود جانے کیوں میری یہ خواہش تھی کہ زندگی کے کسی موڑ پر اس عورت سے میری ملاقات ہو اور میں اسے راہِ راست پر لا سکوں۔ گھر بسنے میں بہت دیر لگتی ہے مگر اجڑنے میں وقت نہیں لگتا۔ لمحوں میں کیا ہوا کوئی غلط فیصلہ برسوں کے لیے عذاب جان بن جاتا ہے۔

یہ واقعہ تیسرے دن صبح کا ہے کہ ڈاکٹر امتیاز کو رخصت کر کے میں سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ قریبی تھانے کا ایس ایچ او ملک آ دھمکا۔ اس کے ساتھ اے ایس آئی اور ایک پولیس والا بھی تھا۔ اے ایس آئی کے کہنے پر وہ عقبی سمت سے آیا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی میں نے خطرے کی بو سونگھ لی تھی۔ میں ان سب کو اپنے کمرے میں لے آیا۔ اب تک دانستہ میں نے ان سے آمد کا سبب دریافت نہیں کیا تھا۔

کرسی پر آرام سے پھیل کر بیٹھنے کے بعد ایس ایچ او نے مجھے اس طرح گھور کر دیکھا جیسے پہلی بار اس سے ملاقات ہو رہی ہے۔ سپاہی، کرسی ہونے کے باوجود دروازے کے قریب کھڑا رہا تھا۔

"تم مجھ سے پوچھ نہیں رہے کہ میں کیوں آیا ہوں!" اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"یقیناً آپ کو مجھ سے کوئی کام ہو گا!" میں نے اس کے لہجے کی چبھن کو نظر انداز کرتے ہوئے نرمی اختیار کی۔

"کام ہوتا تو تمہیں تھانے بھی بلوا سکتا تھا' مجھے یہاں آنے کی ضرورت نہیں تھی!" اس نے بے تکی سی بات کی' پھر کہنے لگا۔ "تم نے یہاں کتنی لڑکیوں کو حبس بے جا میں رکھا ہوا ہے؟" اس نے بہ راہ راست یہ سوال میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کیا تھا۔ اس کے چہرے پر سختی تھی۔

"کسی کو نہیں۔ شاید آپ کو کسی نے غلط اطلاع دی ہے ملک صاحب!" میں بہ دستور نرمی اختیار کیے رہا۔

"زیادہ فری ہونے کی کوشش نہ کرو!" اس نے اپنے گول گول دیدے گھماتے ہوئے منہ بگاڑ کر کہا۔ "جو پوچھ رہا ہوں' اس کا جواب دو!"

"میں نے عرض تو کیا ناجناب' کہ ایسی کوئی بات نہیں۔"

"اسے وہ درخواست دکھاؤ جو محلے والوں نے ایس پی صاحب کی خدمت میں بھیجی تھی۔ اس نے اے ایس آئی کو مخاطب کیا جس کی بغل میں کوئی فائل دبی ہوئی تھی۔

اے اسی آئی" فائل کھول کر مطلوبہ درخواست نکالنے لگا۔ اس کیس میں تم نہیں بچ سکتے؟ ایس ایچ او نے گویا مجھے دھمکایا۔ "بہت ہو گئی! میں نے یہ سوچ کر تمہارا بہت خیال کیا کہ تم شریف آدمی ہو گے' مگر اب ..... اب میں کوئی بات نہیں سنوں گا! تم نے تو میری نوکری خطرے میں ڈال دی ہے۔" یہ کہہ کر وہ اے ایس آئی سے مخاطب ہوا۔ "ملی درخواست؟"

"جی سر! یہ ..... یہ رہی۔" اس نے فائل سے درخواست نکالتے ہوئے ایس ایچ او کی طرف بڑھائی۔

"مجھے نہیں' اسے دکھاؤ!" ایس ایچ او نے اے ایس ائی کی طرف دیکھ کر آنکھیں نکالیں۔

"جی.....جی سر! اس نے یہ کہہ کر درخواست میری طرف بڑھا دی۔

میں اس سے وہ درخواست لے کر پڑھنے لگا۔ درخواست علاقے کے ایس پی کے نام تھی اور اس کی ایک نقل آئی جی کو بھی بھیجی گئی تھی۔ ایس ایچ او گویا غلط نہیں کہہ رہا تھا کہ اس کی نوکری خطرے میں پڑ گئی تھی۔ یہ معاملہ تھانے کی حد سے نکل کر پولیس کے اعلیٰ حکام تک پہنچ چکا تھا۔ یقیناً اسے اوپر سے لتاڑ پڑی تھی اس لیے گرم تھا۔ مجھے علم تھا کہ تھانے کی حد تک کوئی ایس ایچ او جو بھی چاہے کر لے' مگر جب کوئی معاملہ حکام بالا کے علم میں بھی آ

جاتا ہے تو وہ مستقل مفاد پر عارضی مفاد کو قربان کر دیتا ہے۔ مستقل مفاد سے میری مراد نوکری کا تحفظ ہے اور عارضی مفاد میں نے "اوپری آمدنی" کو کہا ہے۔ یہی سوچتے ہوئے میں درخواست پڑھنے لگا کہ اس چکر سے کس طرح نمٹا جائے؟

درخواست میں لکھا گیا تھا کہ روز رات کے وقت میری کوٹھی سے عورتوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں آتی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے انہیں زود کوب کیا جا رہا ہو۔ اس سے محلے والوں کا سکون ختم ہو گیا تھا اور رات کے وقت آرام سے نہیں سو پاتے تھے۔ درخواست میں میرے کردار پر بھی گہرے شک و شبے کا اظہار کیا گیا تھا۔ یہ بھی لکھا تھا کہ پولیس سے میرے مراسم ہیں اور اکثر پولیس والوں کو میرے یہاں آتے جاتے دیکھا گیا ہے۔ آخر میں ایس پی سے درخواست کی گئی تھی کہ اس معاملے کی چھان بین کرائے اور علاقے کے معزز شہریوں کو اس عذاب سے نجات دلائے۔ اس درخواست پر خاصے افراد کے دستخط تھے۔

کئی دن سے عمل کے دوران میں مجھے واقعی چیخ پکار سنائی دے رہی تھی' مگر میں اسے فریب سماعت ہی سمجھا تھا۔ اب یہ درخواست پڑھ کر مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ شمبھو واقعی میری ملازماؤں پر تشدد کر رہا تھا کیوں کہ چیخنے چلانے کی آوازیں دوسروں نے بھی سنی تھیں۔ درخواست پڑھ کر میں نے واپس کر دی اور نہایت پر سکون آواز میں بولا۔ "اس درخواست میں جو کچھ لکھا ہے سراسر غلط ہے۔"

"بہت خوب!" ایس ایچ او نے طنز کیا۔ "تم نے تو سارا مسئلہ ہی حل کر دیا۔"

"آپ خود سوچیں' ان لوگوں نے لکھا ہے کہ تھانے کی پولیس سے میرے مراسم ہیں۔ کیا یہ بات غلط نہیں ہے؟" میں نے گویا اپنے حق میں دلیل پیش کی۔

"بکواس نہ کرو زیادہ!" وہ سخت لہجے میں بولا۔ "تم جیسے نہ جانے کتنے میں نے اپنی ٹانگ کے نیچے سے نکال دیے ہیں۔ چلا ہے بڑا بھولا بننے! کیا میں تجھے جانتا نہیں کہ تو کتنے پانی میں ہے! کبھی یہ چکر' کبھی وہ چکر! اب میں چکر میں نہیں آ سکتا' مجھے!" اس کے رویہ میرے ساتھ بالکل مجرموں ایسا تھا۔ اس کے منہ میں جو آ رہا تھا' کہے جا رہا تھا۔ پھر وہ ایک دم کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور مجھ سے بولا۔ "چلو اٹھو!"

"مگر کہاں؟ میں نے سوال کیا۔ میں خوف زدہ ہو گیا تھا کہ کہیں وہ مجھے تھانے لے جا کر حوالات میں بند نہ کر دے!

ابھی ڈرو مت' تھانے چلنے کی باری ابھی نہیں۔" اس نے جیسے میرے چہرے کے تاثرات اور گھبراہٹ سے اندازہ کر لیا میں کیا سوچ رہا ہوں! اس نے مزید کہا۔ "پہلے میں

تمہاری کوٹھی سے ان لڑکیوں کو برآمد کروں گا جنہیں تم نے حبس بے جا میں رکھا ہوا ہے! چل کر خود نشان دہی کرو کہ انہیں تم نے کہاں چھپایا ہے ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔ ابھی تک تم نے میری نرمی ہی نرمی دیکھی ہے ورنہ میں کھال اتار دیتا ہوں! بڑے بڑے اچھے خاں میرے سامنے ناک رگڑ چکے ہیں۔"

مجبوراً مجھے اٹھنا ہی پڑا۔ "میری کوٹھی میں ملازماؤں کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔ آپ خود چل کر دیکھ سکتے ہو اور آج کل تو میں کوٹھی کے اس حصے میں انہیں آنے بھی نہیں دیتا کیوں کہ اس سے میری عبادت میں فرق پڑتا ہے۔" میں نے اپنی صفائی پیش کی۔

"بڑا عبادت گزار بن رہا ہے......" یہ کہہ کر اس نے مجھے گالی دی۔ "ابھی تیری ساری پارسائی نکالے دیتا ہوں، بدمعاش کہیں کا! مجھے پٹی پڑھا رہا ہے!"

اپنی اس توہین پر مجھے غصہ تو بہت آیا، مگر میں بے بس تھا۔ کرتا بھی کیا! سوائے صبر کے اور کوئی چارہ نہیں۔ میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

میری کوٹھی کے جس حصے میں ملازمائیں تھیں۔ میرے نزدیک وہاں پولیس نہیں پہنچ سکتی تھی کیونکہ اس پر شبھو کا قبضہ تھا۔ یہ سوچ کر کہ خود ابھی ایس ایچ او کے سارے کس بل نکل جائیں گے، میں تن بہ تقدیر اس کے ساتھ چلنے لگا۔ وہاں میں نے یہ فیصلہ ضرور کر لیا تھا کہ پہلے خود برآمدے میں قدم نہیں رکھوں گا۔ میرے خیال میں ایس ایچ او کی ساری اکڑ فوں کچھ دیر میں نکلنے والی تھی۔ شبھو بھلا یہ کیسے گوارا کر لیتا کہ اس کی خلوت میں کوئی مخل ہو!

برآمدے کے قریب پہنچتے پہنچتے میں غیر محسوس انداز میں ذرا پیچھے ہو گیا تھا۔ مجھ سے ذرا آگے ایس ایچ او تھا۔ برابر میں اے ایس آئی اور پیچھے کانسٹیبل۔ معلوم نہیں کیسے اے ایس آئی نے یہ بات محسوس کر لی کہ میں آگے بڑھتے ہوئے جھجک رہا ہوں، یوں بھی ایسے مواقع پر پولیس والے عموماً ملزموں کو آگے رکھتے ہیں۔ اس نے مجھے آگے بڑھنے کے لیے ٹھوکا دیا۔ برامدہ اب بالکل نزدیک آ چکا تھا۔ میرے قدم رکنے لگے تو ایس ایچ او پلٹا اور کڑک کر بولا۔

"کیوں، اب پیروں میں جان نہیں رہی! چل آگے!"

"تم..... مجھے ذرا باتھ روم جانا ہے۔" مجھے اس کے سوا مفر کی کوئی اور صورت نظر نہیں آتی تھی۔

"باتھ روم جانا ہے!" ایس ایچ او نے دانت پیس کر کہا اور پھر پیچھے سے میری قمیض کا کالر پکڑ کر آگے کھینچ لیا۔ "باتھ روم تو میں ابھی تمہیں بھیجتا ہوں!" یہ کہتے ہوئے اس نے مجھے برآمدے کی طرف دھکا دیا۔

وہ اچھے خاصے تن و توش کا آدمی تھا۔ میں سنبھلتے سنبھلتے بھی اپنے جسم کا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ اس لمحے میرے جسم کے تمام اعصاب تن گئے تھے کہ اب وہ شعلہ نمودار ہوا جو مجھے جھلسا کر رکھ دے گا، مگر کچھ بھی نہ ہوا میں برآمدے کے فرش پر گر پڑا اور اس دوران میں پولیس والے بھی برآمدے میں آ گئے۔

"کوئی بہانہ نہیں چلے گا! اٹھو!" ایس ایچ او نے مجھے ٹھوکر مارنے کے لیے پیر اٹھایا۔ وہ یقیناً" اب مشتعل ہو گیا تھا۔ اس کے نزدیک شاید میں مجرموں کی طرح بہانے بازی سے کام لے رہا تھا۔

میں ٹھوکر سے بچنے کے لیے ایک دم کروٹ لے کر اٹھنے لگا۔ مجھے انتہاوی حیرت تھی کہ آخر شبھو اس وقت کیوں غافل ہو گیا ہے! کیا وہ میری طرف سے بالکل مطمئن ہو گیا تھا کہ میں اب اس طرف آنے کی ہمت نہیں کروں گا! وہ شاید ایسا سوچنے میں حق بہ جانب بھی تھا اس لیے کہ میں کئی بار اس کوشش میں ناکام ہو چکا تھا اور مجھے اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا تھا۔

"اب زیادہ ٹسُن نہ دکھا! سیدھے سیدھے اُدھر چلا چل جہاں تو نے لڑکیوں کو رکھا ہے! میں اٹھ کھڑا ہو گیا تو ایس ایچ او نے اپنی بغل میں دبا ہوا بینت ہاتھ میں لے لیا، یوں جیسے مجھے دھمکانا چاہتا ہو۔

اس وقت جو نہ ہو جاتا، تھوڑا تھا۔ مجھ سے مجرموں ایسا سلوک کرنے کے لیے اس کے پاس مناسب جواز موجود تھا۔ میں قہراً و جبراً آگے بڑھنے لگا، مگر ہر لمحہ مجھے یہی خیال تھا کہ کسی بھی وقت شبھو کی طرف حملہ ہو سکتا ہے، اور حقیقت تو یہ ہے کہ اب اس وقت کو دیکھتے ہوئے خود میری یہ خواہش تھی۔ مجھ پر تو جو گزرتی، وہ گزرتی مگر پولیس والوں کے دماغ درست ہو جاتے۔

برآمدے سے زر کر صحن میں پہنچتے ہی ایک طرف سے کراہنے کی آواز سنائی دی اور میں چونک اٹھا۔ یہ آواز یقیناً" پولیس والوں نے بھی سنی تھی۔

"اُدھر... اُس طرف سر!" اے ایس آئی نے فوراً ہی اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایس ایچ او کو مخاطب کیا۔

"میں نے تم سے پہلے سن لی ہے کہ کراہنے کی آواز!" ایس ایچ او نے آنکھیں نکالیں اور پھر تیزی سے دائیں جانب بنے ہوئے کمرے کی طرف بڑھ کر بولا۔ "آؤ میرے پیچھے!"

میں بھی حیران و سر سیمہ سا اے ایس آئی کے ساتھ اس طرف چلنے لگا۔ اس نے اب میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔

اس کمرے کا دروازہ نیم وا تھا اور مجھے علم تھا کہ وہاں میری کس ملازمہ کی سکونت تھی! ایس ایچ او نے کمرے کا پورا اور دروازہ کھول دیا اور اور اندر کے منظر دیکھ کر میرے فرشتے کوچ کر گئے۔ سامنے ہی ایک کرسی پر رکمنی، رسیوں سے بندھی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ ایس ایچ او کے منہ سے حیرت زدہ سی آواز سن کر اے ایس آئی بھی میرا ہاتھ تھامے مزید آگے بڑھا تاکہ اس دل دوز منظر کا قریب سے نظارہ کر سکے۔ کرسی کے قریب ہی فرش پر چمڑے کا ایک ہنٹر پڑا ہوا تھا۔ رکمنی کی حالت بہ ظاہر خراب معلوم ہو رہی تھی۔ وہ کراہتے ہوئے نیم وا آنکھوں سے مجھے اور پولیس والوں کو کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"دیکھ کیا رہے ہو! کھولو اسے!..... جلدی!" ایس ایچ او نے اے ایس آئی کی طرف پلٹ کر تیز لہجے میں کہا۔

ایس ایچ او کے حکم پر اے ایس آئی فوراً ہی میرا ہاتھ چھوڑ کر تیزی سے آگے بڑھا۔

"ہتھکڑی ڈال دو اس کے!" ایس ایچ او نے دوسرا حکم سپاہی کو دیا۔ اب گویا اس کی دانست میں میرے مجرم ہونے میں کوئی شک نہیں رہا تھا۔

مجھے احساس بھی نہ ہوا کہ کب سپاہی نے میرے ہتھکڑی لگا دی، میں اس وقت جیسے کہیں اور ہی تھا اب مجھ پر بڑی حد تک حقیقت واضح ہو چکی تھی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ میرے خلاف کیا چال چلی گئی ہے! شمبھو نے مجھے یا پولیس والوں کو کوٹھی کے اس حصے میں داخل ہونے سے کیوں نہیں روکا! اس بھرپور حربے کا کوئی توڑ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ مجھے اس طرح قانون کی گرفت سے پھانس دیا گیا تھا کہ مفر کی کوئی صورت نہ رہے۔

اس کے بعد بقیہ چار ملازمائیں بھی کوٹھی کے مختلف کمروں سے برآمد ہو گئیں البتہ سریتا نہیں ملی اور نہ ہی شمبھو نظر آیا۔ ان سبھی کی حالت ناگفتہ تھی۔ ان سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ ان پر کیا گزری ہے! ایس ایچ او کے حکم پر ان سب کو نشست گاہ میں لے آیا گیا۔ وہ سبھی نڈھال اور بے حال نظر آ رہی تھیں۔ سب کے جسموں پر زدوکوب کیے جانے کے آثار موجود تھے۔ پانی وانی پی کر گویا اب ان کے حواس قدرے درست معلوم ہو رہے تھے۔ ان کو نشست گاہ کے فرش پر بچھے ہوئے قالین پر بٹھا دیا گیا۔ ایس ایچ او ایک صوفے پر پھیل کر بیٹھ گیا۔ میں اس کے سامنے ہتھکڑی پہنے مجرموں کی طرح کھڑا تھا اور میرے پیچھے کانسٹیبل ایٹنشن حالت میں مجسمے کے مانند ایستادہ تھا۔ اے ایس آئی میری ملازماؤں کے قریب کھڑا ہوا گویا اپنے افسر کے حکم کا منتظر تھا۔ ایس ایچ او کی گردن اس طرح اکڑی ہوئی تھی جیسے اس نے ساری دنیا فتح کر لی ہو اور اب اپنی محکوم رعایا کی قسمت کا فیصلہ سنانے والا ہو۔

"ہاں بھئی شیخ کرامت بول اب! تو تو بڑا پارسا بن رہا تھا، نمازی، پرہیزگار، عبادت گزار!" اس کے ہونٹوں پر بڑی سفاک مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ اس کا سلوک میرے ساتھ ایسا تھا جیسے بلی، چوہے سے کھیلتی ہے۔

"میں اب بھی یہی کہوں گا جناب کہ بے قصور ہوں۔" میں اس کے تمسخرانہ لہجے کو نظرانداز کرتے ہوئے بولا۔

"بے قصور!.... بے قصور تو تجھے تھانے چل کر بتاؤں گا کہ کسے کہتے ہیں! ذرا ان لڑکیوں کے بیان ہو جائیں۔" وہ دانت پیسنے لگا۔

"بیان لے لیں آپ! خود معلوم ہو جائے گا آپ کو کہ ان پر میں نے ظلم نہیں کیا۔ میں تو خود آپ سے یہ کہنے والا تھا جناب!" میں نے ایک موہوم سی امید کے تحت کہا۔

"جناب کا بچہ!" وہ منہ بگاڑ کر بولا۔ "خود کہنے والا تھا مجھ سے! جیسے مجھے تو کچھ معلوم ہی نہیں!" یہ کہہ کر وہ اے ایس آئی سے مخاطب ہوا۔ "بیان لکھو، ان کے باری باری!" ایس ایچ او اس وقت کچھ زیادہ ہی لہر میں آ گیا تھا یا اسے میری خوب صورت نشست گاہ پسند آ گئی تھی ورنہ یہ بیان بازی تھانے چل کر بھی ہو سکتی تھی۔ عموماً ایسا ہوتا بھی ہے۔ پولیس والے، مجرم یا ملزم کو گواہوں سمیت تھانے لے جاتے ہیں اور وہیں ساری کارروائی مکمل کرتے ہیں۔

اے ایس آئی وہیں قالین پر فائل کھول کر بیٹھ گیا۔ وہ شاید سمجھ گیا تھا کہ اس وقت اس کا افسر، تیس مار خان بنا ہوا ہے، اگر وہ صوفے پر بیٹھا تو ڈانٹ کھانا پڑے گی۔

پہلا بیان رکمنی کا ہوا، جب وہ بولنے والی تھی تو میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

"میں دیناج پور کی رہنے والی ہوں۔ یہاں میں اپنے مالک کے ساتھ رہتی ہوں اور بھرے گھروں میں کام کاج کر کے اپنا پیٹ بھرتی تھی۔ باپ مر چکا ہے اور ماں، ماما کے پاس رہتی ہے۔ میں اس گھر میں بھی کام کرنے آتی تھی۔ مجھے تنخواہ کا لالچ دے کر کہا گیا کہ کوٹھی ہی میں رہنے لگوں۔ میں اپنے ماما اور ماں کی اجازت سے یہاں رہنے لگی۔ شروع شروع میں شیخ صاحب نے مجھ سے ہنسی مذاق شروع کیا، پھر اور بے تکلف ہونے لگے اور اس کے بعد پیسوں کا لالچ دینے لگے، مگر..... " رکمنی یوں بولے جا رہی تھی جیسے حالت خواب میں ہو۔ اس نے مجھ پر اپنے بیان میں بڑے سنگین الزامات لگائے۔ اس بیان سے میں ایک اذیت پسند جنونی اور بدکردار شخص ثابت ہوتا تھا۔

"جب تمہارے ساتھ یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ تم پر تشدد کیا جا رہا تھا، تم بے آبرو ہو رہی تھیں تو یہاں سے بھاگ کیوں نہیں گئیں؟" اے ایس آئی نے یہ سوال کر کے گویا اپنی

قابلیت کا اظہار کیا۔

"اوئے بس کر!" ایس ایچ او نے اسے ڈانٹ دیا۔ "زیادہ قابل بننے کی ضرورت نہیں' سمجھے اتنی سی بات تمہاری سمجھ میں نہ بیٹھتی کہ اسے دھمکی دی گئی ہو گی' کسی سے کچھ کہا یا بھاگنے کی کوشش کی تو قتل کر دیا جائے گا۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں سر' بالکل یہی بات ہو گی؟ اس ایس آئی نے فوراً اپنے افسر کی تائید کی۔ مگر اس کے باوجود ڈانٹ کھانے سے نہ بچ سکا۔

وہ جو میرے دل میں موہوم سی امید پیدا ہوئی تھی۔ اس نے دم توڑ دیا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ اس وقت میری ملازماؤں میں سے کوئی ایک بھی اپنے ہوش میں نہیں اور ابھی سحر میں گرفتار ہیں۔ بقیہ کے بیانات بھی رکمنی سے مختلف نہیں ہو سکتے تھے۔ میرا ذہن اس وقت کسی نہ کسی حل کی تلاش میں تھا حالانکہ بہ ظاہر گلو خلاصی کی کوئی راہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ رکمنی کے بیان کے بعد اے ایس آئی میری ایک اور ملازمہ کا بیان لینے والا تھا تو بالا آخر کچھ سوچتے ہوئے میں نے ایس ایچ او کو مخاطب کیا۔ "جناب! میں آپ سے تنہائی میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"نہیں!" وہ سختی سے بولا۔ "اب کوئی چکر نہیں چلے گا۔ میں پہلے تمہاری وجہ سے بہت پریشان ہو چکا ہوں۔ خاموش کھڑے رہو اور سرکاری کارروائی میں مداخلت بے جا نہ کرو!"

"آپ صرف میری بات سن لیں' پھر جو چاہے کیجئے گا۔ میں باز نہ آیا اور باز بھی کیسے آتا کہ میری تو جان پر بنی ہوئی تھی۔

"تنہائی بہت ضروری ہے کیا؟" اس نے مجھے ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی.... جی ہاں جناب!" میں اسے رام ہوتے دیکھ کر جلدی سے بولا۔

"یہ بتا دوں میں تمہیں کہ مجھ سے کوئی نرمی کی امید نہ رکھنا' ہاں!" یہ کہتے ہوئے وہ صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا' پھر اے ایس آئی سے مخاطب ہوا۔ "تم جب تک ان کے بیانات لو' میں اس کی بکواس سن کر آتا ہوں ابھی!" اس کے بعد ایس ایچ او نے کانسٹیبل کو ہتھکڑی کھولنے کے لیے کہا اور بولا۔ "یہ مجھ سے زیادہ جان دار نہیں ہے' بھاگے گا تو چٹنی بنا دوں گا۔"

کانسٹیبل نے ہتھکڑی کھول دی اور پھر میں ایس ایچ او لیے ہوئے اپنے کمرے میں آ گیا۔

"تشریف رکھیں۔" میں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"زیادہ مسکا لگانے کی ضرورت نہیں' ہاں!" وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "ان باتوں کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہو گا!"

وہ ناحق اینٹھے چلا جا رہا تھا۔ یہ میرا دل ہی جانتا ہے کہ میں کس طرح اپنی تذلیل برداشت کر رہا تھا۔

"دراصل بات یہ ہے کہ جناب میرے کچھ دشمنوں نے میرے خلاف یہ سازش تیار کی ہے۔" میں نے گفتگو شروع کی۔

"تو کیا سارے محلے والے دشمن ہیں تمہارے؟ اور یہ لڑکیاں بھی جھوٹ بول رہی ہیں؟ کیا! یہی کہنے کے لیے تم مجھے یہاں لائے تھے؟" وہ لال پیلا ہونے لگا۔

"وہ لڑکیاں اپنے ہوش میں نہیں ہیں اور...."

"اچھا تو تو ایک ہوش میں ہے!" اس نے میری بات کاٹ دی۔

اس کی بار بار مداخلت' تمسخر اور ڈانٹ ڈپٹ کے باوجود میں نے کسی نہ کسی طرح اپنی بات کہہ ہی دی۔

"تو جو یہ چکر چلا رہا ہے اور سمجھ رہا ہے کہ میں تیری باتوں میں آ جاؤں گا تو میں اتنا بڑا بے وقوف نہیں ہوں!" وہ ساری بات سن کر کہنے لگا۔ "تیرا کہنا کہ تو کوئی عمل کر رہا ہے اور کچھ لوگ نہیں چاہتے کہ تیرا عمل پورا ہو' مگر وہ لوگ ہیں کون اور ہیں کہاں؟ میں صرف تیری بکواس پر تو یقین نہیں کر سکتا۔"

"وہ لوگ نظر نہیں آتے اور چھپ کر وار کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"اور بس تجھے نظر آتے ہیں؟ کیوں خواہ مخواہ مجھے غصہ دلا رہا ہے یار بار' اقبالی بیان لکھوا دے اور زیادہ ادھر ادھر اڑنے کی کوشش نہ کر!"

"اگر میں نے ایک رات بھی عمل نہیں کیا جناب تو وظیفہ الٹا ہو جائے گا اور پھر مجھے مرنے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔" میں التجا آمیز لہجے میں بولا۔

"تو ضرورت کیا پڑی ہے کسی کو تجھے بچانے کی! جیسی کرنی ویسی بھرنی۔"

وہ کسی طرح گھاٹ پر نہ آیا تو میں نے ایک اور داؤ آزمایا۔ "دیکھیے جناب' اگر آپ ان ساری جھوٹی باتوں کو سچ بھی مان لیں تو یہ کوئی ایسا جرم نہیں ہے کہ جس کے مجرم کی ضمانت نہ ہو سکے۔ عدالت بھی مجھے ضمانت پر رہا کر دے گی۔ میں دراصل یہ چاہتا تھا کہ...."

"ضمانت پر رہا کر دے گی کا بچہ!" وہ ایک دم بگڑ گیا۔

"آپ سنیئے تو سہی! میں کچھ اور کہنا...."

"مجھے کچھ نہیں سننا اب!.... قابل ضمانت! میں بتاؤں گا تجھے کسے کہتے ہیں ضمانت! قتل عمد کی دفعہ لگاؤں گا تجھ پر تین سو دو! پھر دیکھوں گا' کیسی ہوتی ہے تیری ضمانت! اس کے علاوہ حبس بے جا میں رکھنے اور....." وہ دفعات گنوانے لگا جو مجھ پر لگائی جا سکتی تھیں' پھر بولا۔ "رگڑ کر رکھ دوں گا تجھے! سمجھ کیا رہا ہے تو اپنے آپ کو!"

میری ذرا سی غلطی نے اسے مشتعل کر دیا تھا اور مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ پہلے ہی اس سے وہ بات کیوں نہ کہہ دی جو اس پر کچھ اثر کرتی۔ بہرحال وہ بڑی خوشامد اور عاجزی سے ٹھنڈا ہوا۔ میں نے موقع پاتے ہی جو سوچا تھا نہایت نرمی کے ساتھ اس سے کہہ دیا۔

"یہ کوٹھی ہے بھی تیرے نام کہ ایسے ہی چکر دے رہا ہے؟" وہ آہستہ سے بولا۔

"میں آپ کو اس کے کاغذات دکھا سکتا ہوں۔" میں اٹھنے لگا۔ "ابھی الماری سے نکال کر....."

"اچھا اچھا!" اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

اس کی ضرورت نہیں مگر....." یہ کہہ کر وہ کچھ سوچنے لگا۔

میں اپنی گلوخلاصی کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا سکتا تھا۔ میری وسیع و عریض کوٹھی کی قیمت اس زمانے میں بھی ایک لاکھ سے کم نہیں ہو گی اور یہ کوئی ایسی معمولی رقم نہیں تھی کہ ایس ایچ او سوچنے پر مجبور نہ ہو جاتا۔ نقد رقم اب میرے پاس برائے نام رہ گئی تھی اس لیے میں نے یہ بات ہی نہیں کی۔ ایس ایچ او ایسی کوٹھی میں رہنے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

میری نگاہ اس کے چہرے پر تھی جس سے تذبذب کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس موقع پر میں نے خاموش رہنا مناسب نہ سمجھا اور بول اٹھا۔ "صرف تین دن کی مہلت چاہیے مجھے بس میں اپنا عمل پورا کر لوں' اس کے بعد میں آپ سے کچھ نہیں کہوں گا۔ پھر آپ چاہیں مجھے حوالات میں بند کیجئے گا یا جیل بھجوا دیجئے گا۔"

میری بات سن کر وہ چونک اٹھا اور اس طرح مجھے دیکھنے لگا جیسے میں جھوٹ بھول رہا ہوں۔ "صرف تین دن!" اس نے گویا مجھ سے تصدیق چاہی۔

"جی ہاں تین دن کے اندر اندر میرا عمل پورا ہو جائے گا۔ میں جلدی سے بولا۔ "پھر اور کچھ ہو تو میری زندگی خطرے میں نہیں پڑے گی۔" میں نے اسے اپنے عمل کے بارے میں کچھ نہیں بتایا کہ ہمزاد کو قابو کرنے کا عمل کر رہا ہوں اور نہ ہی اس نے تفصیل جاننا چاہی تھی۔ اسے خاموش دیکھ کر میں نے پھر التجا کی۔ "مجھے بس تین دن دے دیں' اس کے بعد آپ جو کارروائی چاہیں کیجئے گا۔"

"کارروائی تو ہو چکی ہے اور مجھے اس سلسلے میں اوپر والوں کو بھی جواب دینا ہے۔" یہ کہہ کر وہ انکار میں گردن ہلانے لگا۔ "بہت مشکل ہے یہ بات ایس پی صاحب کے علم میں ہے کہ میں یہاں چھاپہ مارنے یہاں آیا ہوں۔" یہ کہنے کے بعد وہ پھر سوچنے لگا۔ شاید پوری سروس کے دوران میں اسے اتنی بڑی رشوت کی پیش کش کبھی نہیں کی گئی ہو گی۔ چند لمحے بعد وہ مجھ سے ایک دم مخاطب ہوا' یوں جیسے اس نے سوچتے سوچتے کوئی راہ نکال لی ہو' کہنے لگا۔ "تین دن کے لیے تم فرار ہو جاؤ!"

میں نے ٹھنڈا سانس بھرا' پھر بولا۔ "یہ میرے لیے ممکن نہیں ہے مجھے یہیں اسی کمرے میں رہ کر اپنا عمل پورا کرنا ہے۔"

تو پھر صبر کرو' اس کے سوا میں کچھ نہیں کر سکتا ہوں اگر میں نے کوئی اور قدم اٹھایا تو میری نوکری خطرے میں پڑ سکتی ہے جو مجھے قطعی منظور نہیں۔" اس نے دو ٹوک جواب دے دیا۔ یہ کہتے ہوئے بہرحال اس کے چہرے سے افسوس کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس کی وجہ میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔

جس طرح گہری تاریکی میں اچانک روشنی کی کوئی کرن نظر آ جائے یہی اس وقت میرے ساتھ ہوا یہ خیال ایک دم ہی میرے ذہن میں در آیا تھا۔ اس کا سبب غالباً" یہ ہو کہ پہلے بھی میں اس پر عمل کر چکا تھا۔

"ایک اور راستہ بھی ہے جناب!" میں نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "اس طرح آپ کی نوکری بھی خطرے میں نہیں پڑے گی اور میرا مقصد بھی حل ہو جائے گا۔"

"تو پھر بک دو نہ جلدی سے!" وہ منہ بنا کر بولا یقیناً" وہ اس طویل گفتگو سے جھنجلا گیا تھا جس سے کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔

پھر میں نے اس کے سامنے جو تجویز پیش کی اس میں رنگ چوکھا ہی چوکھا آنے کے صدفی صد امکانات تھے۔ اس نے بہت کوشش کی کہ چہرے سے اظہار نہ ہو کہ تجویز پسند آئی ہے' مگر اس کوشش میں کامیاب نہ ہوا۔ اس کی باچھیں کھلی پڑ رہی تھیں۔

"چلو یہ تو ہو جائے گا' اب معاملے کی بات کرو!" اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

میں سمجھ گیا کہ وہ کیا چاہتا ہے اس لیے بولا۔ "اس کے لیے تو مجھے اور آپ کو کچہری چلنا پڑے گا پہلے تاکہ کوٹھی کی رجسٹری آپ کے نام..."

"نہیں!" وہ میری بات کاٹ کر بولا۔

"پھر؟" میں نے پوچھا۔

"کوٹھی میرے نام نہیں ہو گی۔" اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا' پھر آپ ہی آپ بڑبڑایا۔ "ہاں..... یہ ٹھیک رہے گا..... مگر..... خیر بعد میں اس سے بیگم کے نام کرالوں گا۔" وہ گویا بہ آواز بلند سوچ رہا تھا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے مجھے مخاطب کیا۔ "تم ایسا کرو کہ فی الحال اس کوٹھی کے تمام کاغذات میرے حوالے کردو۔"

مجھے بہرحال اس کے وعدے پر ہی یقین کرنا تھا اور ہر طرح اسی کے رحم و کرم پر تھا اس لیے الماری سے کاغذات نکال کر اس کے حوالے کردیے۔ اس کا کاغذات کو موڑ ماڑ کر کسی طرح اپنی پینٹ کی جیب میں ٹھونس لیا اور پھر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"اب تم سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو کہ میں کیا کرتا ہوں! بہرحال تمہارا کام ہو جائے گا۔" اس نے مجھے یقین دلایا۔

"بس یہی چاہئے مجھے جناب!" میں نے اس پر اعتماد کا اظہار کیا۔

وہ مجھے اپنے ساتھ لیے دوبارہ نشست گاہ میں آگیا۔ اس وقت تک اے ایس آئی میری ملازماؤں کے بیانات لے چکا تھا۔ اس نے اپنے افسر کو اور مجھے بڑی معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ وہ بھی اس تحصیلی کا چنا بنا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا شاید کچھ نہ کچھ سودے بازی ہو گئی ہے ورنہ اتنی دیر نہ ہوتی۔

"دیکھو ان لڑکیوں کو ڈاکٹری کے لیے اسپتال بھجوانا ہے۔" ایس ایچ او نے اے ایس آئی کو حکم دیا تو اس کے چہرے پر لحہ بھر کو حیرت نظر آئی اور پھر وہ "یس سر" کی گردان کرنے لگا۔ غالباً اس کے نزدیک یہ حکم اس بات کی دلیل تھا کہ میرے اور اس کے افسر کے درمیان معاملہ طے نہیں ہو سکا۔ دوسرا حکم اس نے یہ دیا کہ مجھے ہتھکڑی پہنادی جائے۔ اب تو گویا کوئی شک ہی نہیں رہا تھا کہ بات نہیں بنی۔

پھر کچھ ہی دیر بعد یہ سارا قافلہ' تھانے کی طرف جا رہا تھا' میری کوٹھی کو مقفل کر دیا گیا تھا اور چابیاں پولیس کی تحویل میں تھیں۔ اس بات کا علم صرف مجھے اور ایس ایچ او کو تھا کہ عقبی پھاٹک' عمارت کے عقبی دروازے اور میرے کمرے میں پڑے ہوئے تالوں کو چابیاں خاموشی اور رازداری کے ساتھ میری جیب میں پہنچ چکی تھیں۔

تھانے پہنچ کر مجھے حوالات میں بند کر دیا گیا۔ اس سے پہلے ایس ایچ او کے حکم پر حوالات کی اس کوٹھری کو صاف کر دیا گیا تھا اور اوڑھنے بچھانے کے لیے مجھے دو کمبل بھی فراہم کردیے گئے تھے' اس کے علاوہ ایک لوٹا اور مصلیٰ بھی فراہم کر دیا تھا۔ اب میرے ذہن پر کوئی بوجھ نہیں رہا تھا اس لیے آرام سے کمبل زمین پر بچھا کر لیٹ گیا۔ رات بھر کا جاگا ہوا تھا اس لیے میرا سونا بہت ضروری تھا اور اب سونا ہی چاہتا تھا۔ آنکھ لگنے والی تھی کہ میں نے حوالات کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی اور چونک کر چہرے سے کمبل ہٹایا۔ ایک سپاہی' دروازہ کھول رہا تھا۔

"چلو اٹھو' ایس پی صاحب کے پاس طلبی ہے تمہاری!" سپاہی نے مجھ سے کہا۔

میں ذرا گھبرایا اور اس سے پوچھا۔ "ملک صاحب کہاں ہیں؟"

"وہ بھی بڑے صاحب کے کمرے میں ہیں۔" سپاہی نے بتایا۔

"اچھا۔" یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ بات مجھے پہلی بار معلوم ہوئی تھی کہ ایس پی بھی اسی تھانے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اس تھانے کو مرکزی حیثیت حاصل تھی ایس پی کا کمرہ تھانے کی عقبی سمت میں تھا۔ میں سپاہی کے ہمراہ وہاں تک پہنچ گیا۔ بڑی سی میز کے پیچھے بڑی سی کرسی پر وہ دبان پان سا عمر رسیدہ باوردی شخص بیٹھا تھا۔ چہرے مہرے سے وہ بنگالی معلوم ہوتا تھا اور رنگ سے بھی' آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک اور اس کے چہرے سے سختی کا اظہار ہوتا تھا۔ میز کے سامنے اور دائیں بائیں کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ دائیں جانب ایک کرسی پر ایس ایچ او ملک بیٹھا ہوا تھا۔ سپاہی نے مجھے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا تو ایس پی نے اپنی عینک نیچے سرکاتے ہوئے اس کے اوپری حصّے سے بہ غور مجھے دیکھا' پھر ٹوٹی پھوٹی اردو میں گویا منمنایا۔ "تم سالا لوگ اور گوڑ بڑ گھٹالا کرتا! تمہارے خلاف اتنا سارا رپوٹ ہے! ام تم کو اسی لیے اور دیکھنے کو بلایا۔ ابی بولو تم اسے سب کچ کیوں کرتا؟"

"یہ کیا بولے گا سر!" ایس ایچ او بول اٹھا۔ "اسے تو میں فر فر بولنے پر مجبور کر دوں گا!" یہ کہتے ہوئے اس نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے کچا چبا جائے گا۔

"اکیالی بیان دیا ہے؟" ایس پی ایس ایچ او سے پوچھا۔

"یہ لوگ اتنے سیدھے نہیں ہوتے سر! ان کی تو کھال ادھیڑنا پڑتی ہے' جب قبولتے ہیں سب کچھ!"

"فر تم ادیڑو اس کا کھال مالک! ام کو آئی جی صاحب بی فون پر بولا کہ اور گول مال نئیں مانگتا۔!"

دو چار روز تو لگیں گے نا سر' اسے سیدھا کرنے میں۔" ایس ایچ او نے کہا۔

"اتا روز؟"

"سر! اس نے تو ہر بات سے انکار کر دیا ہے' کچھ مان کر ہی نہیں دیتا۔"

"تم کیسا پولیس والا اے! ام جوان تھا تو دو منٹ نائیں لگتا تھا جو بان کھلوانے میں!"

"آپ کی کیا بات ہے سر!" ایس ایچ او' ایس پی کو بانس پر چڑھانے لگا۔ "ہم لوگ تو ابھی آپ کے سامنے طفل مکتب ہیں۔"

ایس پی کے مرجھائے ہوئے اور چرمرے سے چہرے پر رونق سی آگئی' مگر دوسرے ہی لمحے وہ پوچھ بیٹھا۔ "یہ تم طفل مکتب کیا بولا؟"

"اسکول کے بچے سر!" ایس ایچ او نے وضاحت کی۔

"اے مالک! ام تم کو کئی بار بولا اِنّا گاڑا کمیسم کا اُردو اور نہ چلاؤ پر تم سمجھتا نئیں!" ایس پی نے گویا سرزنش کی۔

"آئندہ خیال رکھوں گا سر!" ایس ایچ او سعادت مندی سے کہا

اس کے بعد ایس پی نے مجھ پر انتہائی سختی کے احکام دے کر گویا اجلاس برخاست کر دیا۔ سپاہی نے مجھے لا کر پھر حوالات میں بند کر دیا۔ میں ذہن سے ہر خیال کو جھٹک کر دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگا اور جلد ہی اس کوشش میں کامیاب ہو گیا۔ دوبارہ آنکھ اس وقت کھلی جب سپاہی نے مجھے جھنجوڑ کر جگایا۔ میں اتنی ہی گہری نیند سویا تھا کہ حوالات کا دروازہ کھلنے سے بیدار نہیں ہوا تھا اور نہ سپاہی کے آوازیں دینے سے جاگا تھا۔ سپاہی سے معلوم ہوا کہ اس مرتبہ ایس ایچ او کے پاس میری طلبی ہے۔

"ٹھہرو ذرا میں منہ دھو لوں۔" میں نے اٹھتے ہوئے انگڑائی لے کر کہا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ ایس ایچ او نے اپنے عملے کو میرے سلسلے میں خصوصی ہدایات ضرور دی ہوں گی' کسی قسم کی سختی نہ کی جائے۔ کم از کم اس حد تک تو وہ "حق نمک" ادا کر ہی سکتا تھا۔

میرا اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا۔ سپاہی نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ دوپہر ہو رہی تھی اس لیے میں نے صرف منہ دھونے کی بجائے وضوع کر لیا تاکہ ظہر کا وقت قریب ہو تو لوٹ کر نماز بھی پڑھ لوں۔

ایس ایچ او کے ساتھ وہ گویا میری "کلوز ڈور میٹنگ" تھی۔ کمرے میں اس کے اور میرے سوا کوئی نہیں تھا اور دروازہ بھی بند کر دیا گیا تھا۔ اس نے اپنے عہدے اور تعلقات سے فائدہ اٹھا کر تمام کاغذات مکمل کرا لیے تھے اور مجھے کچہری جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ ان کاغذات کے مطابق اب سے دو ماہ قبل میں نے گویا کسی ظفر حمید کو ستر ہزار روپے کے عوض اپنی کوٹھی فروخت کی تھی۔ وہ بہت سیانا تھا اس لیے دو ماہ قبل کی تاریخ لکھوائی تھی۔ ظفر حمید اس کا سالا' بھائی یا کوئی بہت قریبی عزیز ہی ہو سکتا تھا۔ جس پر اسے پورا اعتماد ہو گا اور بعد میں اس سے کوٹھی کو اپنے یا اپنی بیوی کے نام کروا سکے گا۔ میں نے اسی لیے ظفر

حمید کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا کہ یہ کون ہے؟ کہاں اس نے کہا۔ میں نے اپنے دستخط کر دیے۔

میں نے ان کاغذات پر دستخط کر دیے تو اس نے اپنی میز کی دراز سے مزید کچھ کاغذ نکالے' پھر ایک کاغذ میرے سامنے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "اس پر بھی دستخط کر دو۔"

وہ ظفر حمید اور میری درمیان کرائے نامے کا معاہدہ تھا۔ اس کی رو سے میں نے تین ماہ کے لیے گویا اپنی ہی کوٹھی کا عقبی حصّہ کرائے پر لیا تھا۔ بس یہیں وہ غچہ کھا گیا تھا۔ لمحے بھر کو میں نے سوچا کہ اچھا ہے۔ آئندہ یہ معاہدہ میرے ہی حق میں کام آئے گا' مگر اسی کے ساتھ یہ بات بھی میرے ذہن میں آئی کہ جو کچھ میں نے سوچا ہے' خود اس کے ذہن میں بھی آ سکتا ہے۔ پھر وہ مجھ سے دوسرے معاہدے پر دستخط کرا لے گا اور معاہدہ پھاڑ دے گا۔ اس کے علاوہ کوئی اور بھی اسے یہ نکتہ سمجھا سکتا تھا۔ ایسی صورت میں اس کی مزید ہمدردی اور تعاون حاصل کرنے کے لیے خود مجھے غلطی کی نشان دہی کر دینا چاہیے۔ یہی سوچ کر میں نے اس سے سوال کیا۔ "یہ ظفر حمید صاب آپ کے کون ہیں۔"

"کیوں؟" اس کی تیوریوں میں بل پڑ گئے۔ "تمہیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے! تم بس دستخط کر دو۔"

"کوئی وجہ تھی جو میں نے یہ سوال کیا تھا جناب!"

"تم مجھ سے زیادہ قانون نہیں جانتے!" وہ اینٹھ گیا" یہ قانونی معاملات ہیں تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گے' دستخط کرو تم!"

"دستخط کرنے سے مجھے انکار نہیں' لیکن یہ عرض کر دوں کہ تھوڑی بہت مجھے بھی قانون کی شدبد ہے۔ آپ نے یہ کرایہ نامہ اسی لیے تو لکھوایا ہے کہ کوٹھی فروخت کر دینے کے بعد وہاں میرے قیام کو جواز فراہم کر سکیں؟" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے نرمی سے کہا۔

"ہاں..... پھر؟" اس کے چہرے کا تناؤ بہ دستور قائم رہا۔ "اسی لیے تو میں دستخط نہیں کر رہا۔"

"میری سمجھ سے باہر ہے کہ تم نے کوٹھی فروخت کرنے کے کاغذات اور رقم کی وصولی کی رسید پر تو بغیر کسی ہجر مجر کے دستخط کر دیے اور اب کرائے نامے پر دستخط کرتے ہوئے چالاکی دکھا رہے ہو؟ آخر اس سے میں کیا سمجھوں!"

میرا جی چاہا کہ وہ خود پھنس رہا ہے تو اسے پھنس جانے دوں' مگر پھر نظر انداز کر گیا۔

بعد میں اسے بھی میں ناکوں چنے چبوانے کا ارادہ تو کر چکا تھا' لیکن اس کے ہزار رستے ہو سکتے تھے۔ وہ میری ایک جھپٹ کا نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے میری عزّت نفس پر شدید ضربیں لگائی تھیں اور بہت مجروح کیا تھا' لیکن یہ اور وقت تھا۔ اس وقت مجھے اس کے تعاون کی ضرورت تھی۔ یہی سوچ کر میں نے کہا۔ "آپ غلط سمجھ رہے ہیں جناب! میں کوئی چالاکی نہیں دکھا رہا بلکہ آپ کو مشکلات سے بچانا چاہتا ہوں۔"

"مجھے تم مشکلات سے بچانا چاہتے ہو' تم!" اس کا لہجہ استہزائیہ تھا۔ "تم تو اس وقت خود میرے رحم و کرم پر ہو۔"

"آپ بجا فرما رہے ہیں۔" میں نے اپنے غصّے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "مگر ظاہر ہے کہ یہ ظفر حمید صاحب آپ کے کوئی قریبی عزیز ہی ہوں گے۔"

"ہیں پھر؟ تمہیں اس سے کیا غرض؟"

"غرض یہ ہے کہ آپ ان کے ساتھ اچھا نہیں کر رہے یا پھر معاملے کو سمجھ نہیں رہے۔" یہ کہہ کر رکے بغیر میں مزید بولا۔ "کرائے نامے کے معاہدے کی رو سے مجھے گزشتہ دو ماہ سے کوٹھی کا نصف عقبی حصّہ کرائے پر دیا گیا ہے جب کہ پولیس کے ریکارڈ میں یہ بات محفوظ ہے' پوری کوٹھی میرے تصرف میں رہی ہے۔ گزشتہ دنوں میرے خلاف جو رپورٹس تھانے میں کی گئیں ان سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ اگر انہیں بھی نظر انداز کر دیا جائے تو مجھ پر جو یہ نیا کیس قائم ہوا ہے' اس کی ذمے داری بھی ظفر حمید کے سر آ جاتی ہے کیوں کہ معاہدے کی رو سے میں صرف کوٹھی کے عقبی حصّے پر...." میں نے اسے پوری وضاحت سے ساری بات سمجھا دی۔

وہ میرا استدلال سن کر چونک اٹھا' پھر بولا۔ "تم تو واقعی بہت دور کی کوڑی لائے۔ ایسی صورت میں پوری کوٹھی تمہارے ہی تصرف میں ہونا چاہئے۔ ٹھیک کہتے ہو تم! خیر میں دوسرا معاہدہ لکھوا لوں گا۔" پھر وہ غالباً" اپنی خفت مٹانے کے لیے بولا۔ "بات دراصل یہ تھی کہ میں کل ہی تمہاری کوٹھی میں منتقل ہو جانا چاہتا تھا۔ صحن اور عقبی حصّے کے درمیان جو دروازہ ہے' برآمدے کے بعد اسے میں بند کر دیتا۔ میرے ذہن میں یہ تھا کہ کم از کم تین دن تو تمہیں عقبی حصے میں رہنا ہی ہے' پھر یہ کہ اس دوران میں وہاں جو واقعات ہوئے ہیں ان کی ذمے داری تم ہی پر ہے۔ یہی سوچ کر...."

اور پرانی تاریخ میں اس لیے کوٹھی خریدنے کے کاغذات تیار کرائے ہیں کہ رشوت کی لین دین پر پردہ پڑا رہے۔ میں نے یہ سوچا تو ضرور مگر منہ سے نہ کہا۔ میں تو اس وقت اپنے

ہی چکر میں الجھا ہوا تھا۔ مجھے اپنے گردن کے زخم کا خیال آ گیا تھا جس کی ڈریسنگ روزانہ ضروری تھی۔ میں نے اپنا یہ مسئلہ اس کے سامنے رکھ دیا۔

"یہ کوئی مسئلہ نہیں۔" وہ نرمی سے بولا۔ "صبح میں کسی سپاہی کی ڈیوٹی لگا دوں گا۔ وہاں کہ اس ڈاکٹر کو یہاں تھانے لے آئے۔ وہ روز یہیں تمہاری ڈریسنگ کر جایا کرے گا۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

"شکریہ تو مجھے تمہارا ادا کرنا چاہیے ورنہ جب تم پر کیس چلتا تو عدالت میں یہ نکتہ بھی اٹھایا جا سکتا تھا۔" اس نے کہا۔ "واقعی تم نے مجھے ایک مشکل سے بچا لیا۔" پھر کہنے لگا۔ "ویسے اس کا جواز بھی پیش کیا جا سکتا تھا کہ تمہیں کرائے پر تو صرف کوٹھی کا عقبی حصّہ دیا گیا تھا' لیکن تم ناجائز طور پر پوری کوٹھی کو استعمال کر رہے تھے کیوں کہ وہ خالی تھی۔ اس کے باوجود یہ زیادہ بہتر ہے کہ کرائے نامے کے معاہدے میں ترمیم کر دی جائے۔ تین ماہ کی بجائے مدت دو ماہ لکھی جائے اور عقبی حصّے کی بجائے پوری کوٹھی کا کرائے نامہ ہو۔"

"مگر یہ جو تین دن ہیں!" میں نے اعتراض کیا۔

"کیوں' کیا کوئی قانونی طور پر اس کا مجاز نہیں اپنے گھر میں کتنی ہی مدت کے لیے کسی کو بغیر کرایہ وصول کیے رکھ سکے!" وہ بری عیاری سے بولا۔

میں سمجھ گیا کہ اس طرح وہ مجھ پر اپنی بالادستی قائم رکھنا چاہتا ہے۔ میں اسی لیے مزید کچھ نہیں بولا۔ اس کے بعد "کوزڈور میٹنگ" ختم ہو گئی۔ مجھے پھر حوالات میں پہنچا دیا گیا۔

نماز کے اوقات کو چھوڑ کر میں نے وہ دن سوتے ہوئے ہی گزرا۔ عشاء کے بعد ہی حوالات کے اندر جو بلب روشن تھا' اسے دانستہ بجھا دیا گیا۔ اس سپاہی کی ڈیوٹی بھی بدل گئی تھی جو حوالات کے سامنے دن بھر پہرا دیتا رہا تھا۔ بالآخر وہ وقت آ ہی گیا جس کا مجھے بہت بے چینی سے انتظار تھا۔ ٹھیک گیارہ بجے رات کو سپاہی نے بہت احتیاط اور آہستگی کے ساتھ حوالات کا دروازہ کھول دیا۔ اس سے پہلے سپاہی نے برآمدے کی روشنی بھی گل کر دی تھی۔ میں نے اپنے چہرے کا بڑا حصّہ کمبل میں چھپا لیا تھا۔ نہ سپاہی کچھ بولا نہ میں نے اس سے کچھ کہا۔ خاموشی کے ساتھ میں حوالات سے نکل کر تھانے کے عقبی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ یہ تمام معاملات پہلے ہی ایس ایچ او سے طے ہو چکے تھے۔

تھانے سے نکلتے ہی مجھے عقب میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی' مگر میں نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میری نگرانی کی جا رہی ہے۔ یہ جاننے کے باوجود کہ میں فرار نہیں ہو سکتا' ایس ایچ او کو اپنی نوکری عزیز تھی۔ پولیس کسٹڈی سے کسی ایسے مجرم یا ملزم کا

فرار ہو جانا جس کی گرفتاری کا علم اعلیٰ حکام کو بھی ہو' ایس ایچ او کی نوکری کو خطرے میں ڈال سکتا تھا۔ غالباً" یہی سوچ کر اس نے میری نگرانی کا فیصلہ کیا تھا اور خود مجھے بھی اس کا اندازہ تھا۔ گرفتاری سے پہلے اگر میں فرار ہو جاتا تو اس کے ذمے داری ایس ایچ او پر نہ آتی۔ لیکن اب میں اس کی تحویل میں تھا۔ میرے فرار کے صورت میں اس سے جواب طلب کیا جا سکتا تھا۔

میں کسی قسم کی عجلت کا مظاہرہ کیے بغیر سکون کے ساتھ اپنی کوٹھی کے عقبی پھاٹک تک پہنچ گیا۔ میں اس دوران میں قرآنی آیات کا ورد کرتا رہا تھا۔ کہ میرے لیے پناہ وہیں تھی۔ مجھے پوری طرح احساس تھا کہ اپنی کوٹھی سے باہر میں قطعی غیر محفوظ ہوں۔ میرے ساتھ کوئی بھی ایسا واقعہ پیش آ سکتا ہے کہ اپنی کوٹھی تک نہ پہنچ سکوں۔

عقبی پھاٹک کا قفل کھول کر میں اندر پہنچا اور اسے احتیاطا" اندر سے مقفل کر دیا۔ پھر ایسا ہی میں نے عمارات کے عقبی دروازے کو کھولنے کے بعد کیا۔ اب گویا میں اپنی دانست میں محفوظ تھا۔

اپنا کمرا کھول کر میں نے ضروری سامان نکالا اور ہمزاد کے لیے روٹی ڈالنے لگا۔ اس میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ عمل کا وقت اب قریب آتا جا رہا تھا۔ میں نے لباس تبدیل کر لیا۔ ہر طرف اس وقت گہرا سکوت طاری تھا۔ اب تو وہاں شمبھو بھی نہیں تھا۔ کم از کم میرا قیاس یہی تھا۔ وہ سریتا کو اپنے ساتھ لے کر جانے کہاں چلا گیا تھا! جب تک میرا عمل پورا نہ ہو جاتا اور ہمزاد دوبارہ میرے قابو میں نہ آ جاتا' شمبھو اور سریتا کے بارے میں مجھے کچھ بھی معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔ سریتا پر بہرحال ظلم ہوا تھا اور اس ظلم کے ذمے دار میں تھا۔ میں اگر اسے تحفظ دینے کے قابل ہوتا تو شمبھو کی گرفت میں نہ آتی۔ اس سے قطع نظر یہ بات میرے ذہن میں اب کھٹک رہی تھی کہ شمبھو وہاں سے فرار کیوں ہوا؟ کیا وہ بھی یہ چاہتا تھا کہ میرا عمل پورا نہ ہو! وہ تو پہلے پوری کوٹھی پر قبضہ کرنا چاہتا تھا' پھر اس نے اپنا ارادہ کیوں بدل دیا؟

ان سوالوں نے اب مجھے ایک اور ہی نہج پر سوچنے کے لیے مجبور کر دیا تھا۔ حالات و واقعات کسی اور ہی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ سریتا کی تلاش میں شمبھو کا اتنے عرصے بعد میری کوٹھی تک پہنچ جانا' پھر انہی دنوں میں جب کہ میں ہمزاد کا عمل کر رہا تھا' بے معنی نہیں تھا۔ "شمبھو اب سے پہلے سریتا کی تلاش میں کیوں کامیاب نہیں ہو سکا تھا؟" میں بے خیالی میں بڑبڑانے لگا۔

اس وقت پونے بارہ بج رہے تھے اور مجھے ٹھیک بارہ بجے عمل شروع کرنا تھا اس لیے ان خیالات کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرنے لگا۔

عین اسی وقت میری سماعت سے ایک زہریلا قہقہہ ٹکرایا اور میں تقریباً اچھل پڑا۔ سامنے ہی دیوار کے قریب مجھے اپنی جان مہ پارہ کا چمکیلا ہیولا نظر آ رہا تھا۔

"شیخ! تم آخر اصل معاملے کی تہ تک پہنچ ہی گئے۔" ہیولے کے لب ہلے۔ "میں بتاتی ہوں تمہیں کہ شمبھو کو میں نے ہی یہاں تک پہنچایا ہے ورنہ اپنی تمام قوتوں کے باوجود کبھی سریتا کو تلاش نہ کر پاتا' مگر اس وقت میں تمہیں یہ بتانے نہیں آئی تھی۔ میں تمہیں ایک اور خوش خبری سنانے آئی تھی!" اس کے لہجے میں بڑی چبھن تھی۔ "مجھے اعتراف ہے کہ تم نے اب تک انتہائی خود اعتمادی اور ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔ تمہاری جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو اب تک میرے سامنے تک نہ پاتا' مگر اس کے باوجود تمہاری حیثیت میرے سامنے ایک حقیر کیڑے کی سی ہے۔ بالآخر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکی ہوں۔ اب میری رُوح کو قرار آ جائے گا۔ شاید اب مجھے تمہارے پاس آنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ تم خود میرے پاس آ چکے ہو گے! کیوں کہ یہ تمہاری زندگی کی آخری رات ہے!"

پھر اس سے پہلے کہ مہ پارہ سے میں کوئی سوال کرتا' کچھ کہتا اس کا ہیولا غائب ہو گیا۔

"میری زندگی کی آخری رات!" میں بے چینی کے عالم میں بڑبڑانے لگا۔

میرے اضطراب میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور اب رات کے بارہ بجنے میں صرف چند منٹ رہ گئے تھے۔ میں سوچنے لگا کہ کہیں یہی چند منٹ تو فیصلہ کن نہیں ہیں؟ کیا آج عمل شروع کرنے سے پہلے میری زندگی کا چراغ گل ہو جائے گا؟

OO......O......OO

الجھی ہوئی ساری گتھیاں ایک ایک کر کے سلجھ گئی تھیں۔ پس پردہ کون تھا' ظاہر ہو چکا تھا۔ کچھ دیر پہلے مہ پارہ خود اعتراف کر چکی تھی کہ اسی نے شمبھو کو میرے پیچھے لگایا تھا۔ اپنی مقصد براری کے لیے وہ شمبھو کو اشاروں پر نچا رہی تھی۔ شمبھو کے سامنے وہ کھل کر آئی تھی یا نہیں' فی الحال میں اس سے لاعلم تھا' مگر یہ سارے مسئلے بعد کے تھے۔ اس وقت تو میری جان پر بنی ہوئی تھی۔ میرے نزدیک مہ پارہ کی دھمکی بے معنی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس نے بڑے اعتماد سے کہا تھا کہ یہ میرے زندگی کی آخری رات ہے۔ یقیناً وہ مجھ پر اپنا کوئی آخری حربہ آزمانا چاہتی تھی' ایسا حربہ کہ میری اب تک کی ریاضت پر پانی پھر جائے۔ دھمکیاں وہ پہلے بھی دیتی رہتی تھی لیکن اس بار صورت حال کچھ مختلف نظر آ رہی تھی۔

ایک ایک لحہ مجھ پر عذاب بن کر گزر رہا تھا کہ جانے کب کیا ہو جائے! عمل شروع کرنے سے پہلے میرے لیے ذہنی یکسوئی ضروری تھی۔ میں نے اسی لیے' یعنی اطمینان قلب کی خاطر قرآنی آیات کا ورد شروع کر دیا۔ ایسا پہلے بھی کئی بار ہو چکا تھا۔ شدید ہیجانی کیفیت میں کلام الٰہی سے میرے دل کو سکون آ گیا تھا۔ اس وقت بھی مجھے مایوسی نہیں ہوئی' میں نے ہر خطرے کو ذہن سے جھٹک کر خدا سے لو لگا لی۔

میرا یہ قیاس غلط ثابت ہوا کہ عمل شروع کرنے سے پہلے ہی میری زندگی کا چراغ گل کر دیا جائے گا کیوں کہ اب ٹھیک بارہ بج رہے تھے۔ میں حصار کھینچ کر ہمزاد کا عمل شروع کر چکا تھا۔

میں نے پڑھا تھا کہ خدا' آدمی کے ظاہر کو نہیں' باطن کو دیکھتا ہے۔ جگہ جگہ ہر معاملے میں آدمی کی نیت پر زور دیا گیا ہے' وضو کے لیے نیت' نماز کی نیت' روزے کی نیت' کار خیر کی نیت وغیرہ! کچھ دن قبل میری نیت مختلف تھی' لیکن اب صورت حال بدل چکی تھی۔ اب میرے دل سے کھوٹ دور ہو چکا تھا۔ تسخیر ہمزاد کا مقصد اپنی زندگی کے تحفظ کے سوا کچھ نہیں

اور خدا نے بھی زندگی کے تحفظ کا حکم دیا ہے۔ میرے نزدیک یہ خود غرضی نہیں' خدا کے م کی تعمیل تھی۔ جب آدمی کی نیت صاف ہو تو یوں بھی خدا اسے ہمت دے دیتا ہے۔ آدمی ت کرتا ہے تو خدا اس کی مدد کرتا ہے۔ ایسے میں شر کی قوتیں اس کا راستہ ضرور روکتی ہیں' ر خیر میں بڑی قوت ہے۔ خیر یقیناً شر کے مقابل بالآخر فتح یاب ہوتا ہے۔ آج کی رات ہمزاد کا ل شروع کرتے ہوئے میرے ذہن میں یہی خیالات تھے۔ میں نہایت سکون قلب کے ساتھ ل کا ورد کر رہا تھا۔

رات کے آخر ہوتے ہوتے وہ واقعہ پیش آ ہی گیا جس کی مجھے توقع تھی' مگر اس قدر یں! میں نے اتنی تباہی کا تصور بھی نہیں کیا تھا اور میرا زندہ بچ جانا واقعی حیرت کی بات تھی۔ مگر ے اللہ رکھے' اسے کون چکھے۔

ہوا یوں کہ عمل کے آخری لمحات میں اچانک ایک زبردست دھماکا ہوا۔ یہ دھماکا یقیناً ندوق کی گولی کا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس سے میرے کان جھنجھنا گئے تھے اور لمحے بھر کو یوں کا تھا جیسے میرے کانوں کے پردے پھٹ گئے ہوں۔ ابھی چند ہی لمحے گزرے ہوں گے کہ وسرا خوف ناک دھماکا ہوا۔ یہ دھماکا مجھے نسبتاً "قریب" محسوس ہوا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے کمرے کی دیواریں مجھ پر آ رہیں گی۔ ایسے میں حواس پر قابو رکھنا انتہائی مشکل مرحلہ تھا۔ یہ ین ممکن تھا کہ بے حواسی میں عمل کا ورد چھوٹ جاتا' مگر ایسا نہیں ہوا۔ نہ میں نے عمل کا ورد چھوڑا نہ کسی طرف دیکھا۔ میری نگاہ سامنے دیوار پر جمی رہی جہاں میرا سایہ پڑ رہا تھا۔ ان چند لحوں کے دوران میں مجھے لوگوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں بھی سنائی دیں جو یقیناً انہی دھماکوں کا ردعمل تھیں۔

میں ایک زمانے میں انگریزوں کے خلاف چلنے والی ایک زیر زمیں تحریک سے بھی وابستہ رہ چکا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب برصغیر کو آزادی نہیں ملی تھی۔ میں اپنی سرگزشت کے پہلے حصے میں تفصیل کے ساتھ اس کا ذکر کر چکا ہوں۔ یہاں یہ ذکر یوں آ گیا کہ ان دھماکوں نے مجھے برسوں پہلے کی یاد دلا دی تھی۔ یقیناً یہ دستی بموں کے دھماکے تھے۔ اس سے قطع نظر کہ یہ حرکت کس کی تھی' یہ امر یقینی تھا کہ ان سے بڑی تباہی پھیلی ہوگی۔ میری کوٹھی کا شاید ہی کوئی حصہ سلامت بچا ہو' میں یہ سوچتا ہوا اپنا عمل ختم ہونے پر حصار سے باہر آ گیا اور اپنے کمرے کی دیواروں پر نگاہ ڈالی۔ دیواروں میں جگہ جگہ دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ ان دستی بموں سے میرے کمرے کے محفوظ رہ جانے کا سبب' اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ ابھی میری زندگی کے دن پورے نہیں ہوئے تھے۔ خدا مجھے دشمن کے حملے سے بچانا چاہتا تھا ورنہ تو

میری زندگی ختم ہونے میں کوئی کسر باقی نہیں رہی تھی۔ حالات کیوں، کیسے اور کس طرح پیش آئے ہوں گے، اس کے لیے مہ پارہ نے کسے آلہ کار بنایا ہو گا؟ یہ ساری باتیں بعد میں سوچنے کی تھیں۔ اس وقت تو مجھے کچھ اور ہی فکر تھی۔ مجھے عمل کی شرط کے مطابق قریبی چوراہے پر روٹی کو رکھنا تھا اور بقیہ ضمنی شرائط پوری کرنا تھیں۔ چوراہے تک پہنچتے ہوئے مجھے کسی سے گفتگو نہیں کرنا تھی، پھر واپسی میں چالیس قدم تک اسی پر عمل کرنا تھا اور اس دوران میں آتے جاتے مڑ کر بھی نہیں دیکھنا تھا۔ اس کے بعد مجھے سیدھے تھانے پہنچنا تھا۔ جسم پر مختصر لباس کی قید صرف حصار کے اندر تک تھی اس لیے میں نے پورا لباس پہن لیا کیوں کہ مجھے اب یہاں واپس نہیں آنا تھا۔

میں روز جس راستے سے قریبی چوراہے تک جاتا تھا، آج بھی مجھے وہی راستہ اختیار کرنا تھا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ روٹی ہاتھ میں لیے اپنے کمرے سے نکلا تو مجھے اصل تباہی کا اندازہ ہوا۔ میری کوٹھی کھنڈر میں تبدیل ہو گئی تھی۔ کہیں ملبا تھا، کہیں ٹوٹی ہوئی دیواریں! صرف وہی کمرا پوری طرح سلامت تھا جہاں میں عمل کر رہا تھا۔ میں ملبے کے درمیان سے گزرتا ہوا آگے بڑھا تو دور ہی سے مجھے لوگوں کا ہجوم نظر آگیا۔ یقیناً یہ محلے پڑوس والے تھے جو دھماکوں کی آوازیں سن کر وہاں جمع ہو گئے تھے۔ کچھ درخت گرنے سے رہ گئے تھے، میں ان کی آڑ لیتا ہوا اپنی راہ ہو لیا۔ میں نے کوشش کی تھی کہ کسی کی نگاہ مجھ پر نہ پڑے۔ معلوم نہیں میں اپنی اس کوشش کی تھی کہ کسی کی نگاہ مجھ پر نہ پڑے۔ معلوم نہیں میں اپنی اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوا، لیکن کسی نے نہ مجھے روکا نہ ٹوکا، نہ غالباً میری طرف اشارہ کیا۔ اس کا ایک سبب شاید یہ بھی تھا کہ وہ لوگ منتشر نہیں تھے بلکہ ایک ہی جگہ جمع تھے۔ پھر یہ کہ ابھی اندھیرا ہی تھا۔ میں ہجوم سے بچ کر گزر گیا تھا۔

چوراہے پر روٹی رکھ کر تھانے کے عقبی حصّے تک پہنچتے ہوئے مجھے کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ عقبی پھاٹک پر گزر کر میں دبے پاؤں حوالات کی طرف بڑھ گیا۔ تھانے میں مجھے اس وقت غیر معمولی نقل و حرکت نظر آئی اور میں اس کی وجہ سمجھ گیا۔ تھانہ میری کوٹھی سے زیادہ دور نہیں تھا۔ یقیناً دھماکوں کی آوازیں وہاں تک بھی پہنچی ہوں گی۔ حوالات کے باہر برآمدے کا بلب ابھی تک بجھا ہوا تھا، مگر قریب پہنچ کر میں نے اس سپاہی کے ہیولے کو محسوس کر لیا۔ جس نے بغیر کچھ کہے میرے لیے حوالات کا دروازہ کھول دیا تھا۔ میں نے جیسے ہی حوالات کے اندر قدم رکھا، اس نے آہنی دروازہ بند کر دیا۔ یوں جیسے وہ میرا ہی منتظر تھا۔

حوالات کے اندر پہنچ کر جیسے میرے ذہن کا سارا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ میں ایک سخت

آزمائش سے گزر کر بہرحال اپنی منزل تک پہنچ گیا تھا۔ کچھ دیر کے بعد میں نے نماز فجر ادا کی اور پھر زمین پر بچھے ہوئے کمبل پر دراز ہو گیا، لیکن نیند ابھی آنکھوں سے اوجھل تھی۔ گزرے ہوئے سنسنی خیز لمحات کے تصوّر کو فوری طور پر اپنے ذہن سے جھٹک دینا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ اب میرے لیے یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں تھا کہ میری دشمن جاں مہ پارہ کی دھمکی بے سبب نہیں تھی۔ اس نے اپنی دانست میں میری موت کا پورا بندوبست کر دیا تھا۔ خود میں بھی ایک بار تقریباً ایسا ہی حربہ اس پر استعمال کر چکا تھا، مگر وہ بھی بچ گئی تھی اور میں بھی زندہ تھا۔ میری اور اس کی ٹکر تقریباً برابر کی تھی۔ ہاں ان دنوں صورت حال مختلف تھی۔ ایک بھٹکی ہوئی روح کے شر سے بچنا نسبتاً مشکل کام ہوتا ہے۔

اب عمل پورا ہونے میں صرف دو ہی راتیں تو رہ گئی ہیں، اس کے بعد میں ہمیشہ کے لیے مہ پارہ کی روح کے شر سے آزاد ہو جاؤں گا۔ میں نے اپنے دل کو تسلی دی اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ گئی اور پھر میں خود نہیں جاگا۔ مجھے بیدار کرنے والا ایک سپاہی تھا۔ میں نے اٹھتے ہوئے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"صاحب کے پاس پیشی ہے تمہارا!" سپاہی نے میری سوالیہ نظروں کے جواب میں کہا۔

تھانے کے صحن میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے اس سے اندازہ لگایا کہ دن خاصا چڑھ چکا ہے۔ آنکھوں کی جلن اور بوجھل ذہن بتا رہا تھا کہ میں زیادہ دیر نہیں سو سکا۔ منہ پر پانی کا چھپکا مار کر کمبل سے منہ پونچھتا ہوا میں، سپاہی کے ساتھ ہو لیا۔

ایس ایچ او ملک کے پاس اس کے کمرے میں ایک ادھیڑ عمر شخص بیٹھا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی ایس ایچ او نے اس ادھیڑ عمر شخص کو مخاطب کیا۔ "اچھا عثمانی صاحب، میں کوشش کروں گا کہ آپ کا کام ہو جائے، مگر وعدہ نہیں کرتا۔ دراصل اس وقت میں ایک اہم کیس ڈیل کر رہا ہوں۔ آپ دو ایک دن بعد پھر مجھ سے مل لیجیے گا"۔

ادھیڑ عمر شخص غالباً سمجھ گیا کہ اس وقت ایس ایچ او اس سے مزید گفتگو نہیں کرنا چاہتا اس لیے وہ "بہت بہت شکریہ"۔ کہتا ہوا اٹھ گیا۔

وہ شخص کمرے سے نکلا تو ایس ایچ او نے سپاہی کو ہدایت دی۔ "اب کسی کو اندر نہیں آنے دینا! سمجھ گئے"!

"جی صاحب!" سپاہی نے فرماں برداری سے سر ہلایا اور مڑ گیا۔

"دروازہ بھیڑتے جانا!" ایس ایچ او نے ہانک لگائی۔

سپاہی نے باہر نکل کر کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ میں اب تک اپنی جگہ خاموش کھڑا تھا۔ مجھے کچھ کچھ اندازہ سا تھا کہ اس نے کیوں بلایا ہو گا! لیکن خاصی دیر وہ کچھ نہیں بولا' بس مجھ اپنی گول گول آنکھیں گھما کر گھورتا رہا۔ اس نے مجھ بیٹھنے کو بھی نہیں کہا۔ اس کا رویہ میرے لیے الجھن آمیز تھا۔ میں اسی لیے بولے بغیر نہ رہ سکا۔ "کیا بات ہے جناب' جناب ...... آپ کچھ ناراض...."

"ناراض کا بچہ!" وہ جیسے ایک دم پھٹ پڑا۔

"مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے جناب"؟ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں!" اس نے یہ کہہ کر ہونٹ بھینچ لیے' پھر پھنکارا۔ "غلطی تو مجھ سے ہوئی ہے کہ تیری جھوٹی سچی باتوں پر یقین کر لیا میں نے"! یہ کہہ کر اس نے گہرا سانس لیا۔

"میں کچھ بھی نہیں سمجھا جناب"!

"سمجھاؤں گا تو میں تجھے"! اس کی ناک کے نتھنے پھڑکنے لگے۔ "پہلے کیوں نہیں بتایا تھا تو نے کہ تیرا تعلق کسی تخریب کار گروہ سے ہے"؟ اس نے مجھے یوں آنکھیں نکال کر گھورا جیسے کچا چبا جائے گا۔

"تخریب کار گروہ!..... یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ جناب!" میں گڑبڑا گیا۔ معلوم نہیں یہ کیا نیا قصہ شروع ہو گیا تھا!

"تو پھر کیا ان سے میری رشتے داری تھی جنھوں نے تیری کوٹھی پر دستی بم پھینکے تھے!" اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اب بھی جناب کمال کرتے ہیں' میرا بھلا کسی تخریب کار گروہ سے کیا تعلق! کوٹھی بھی میری ہی تباہ ہوئی اور......"

"تیری کوٹھی!" اس نے میری بات کاٹ دی۔ "تھی کبھی تیری اب وہ...." کچھ کہتے کہتے وہ رک گیا۔

اب میں واضح طور پر سمجھ گیا کہ اس کے غصے کا سبب کیا ہے! مجھے یہ بھی یاد آ گیا کہ گزشتہ روز وہ مجھ سے کوٹھی میں منتقل ہونے کی بات بھی کر رہا تھا۔ کوٹھی کی تباہی گویا اس کا ذاتی نقصان تھا۔ شاید اسی کھولن میں وہ تخریب کاروں سے میرا رشتہ جوڑ رہا تھا۔

پھر ذرا ہی دیر میں اس نے وہ سب کچھ اگل دیا۔ جو اس کے دل میں تھا۔ گزشتہ شب کے واقعے کی روشنی میں وہ حقیقتاً یہ سمجھ رہا تھا کہ میں کسی تخریب کار گروہ کا سرغنہ ہوں اور کسی دوسرے گروہ سے میری ٹھن گئی ہے میری کوٹھی کو اسی لیے تباہ کیا گیا ہے۔ مجھے اس

کے انداز فکر پر کوئی حیرت نہیں ہوئی کہ عموماً پولیس والے اسی انداز میں سوچتے ہیں۔ اس نے موجودہ واقعے کی روشنی میں جو مفروضہ قائم کیا تھا' وہ واقعے کے پیش نظر بہ ظاہر معلوم نہیں ہو رہا تھا اس لیے کہ معمولی غنڈے اور بدمعاشوں کے پاس دستی بم نہیں ہوتے۔ اس واقعے نے اس کی نظر میں میری حیثیت کو مزید مشتبہ بنا دیا تھا۔ وہ اسی لیے اب میرے سچ کو بھی جھوٹ سمجھ رہا تھا۔

"یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ پورا تھانہ معطّل ہو سکتا ہے! اس سے پہلے کہ میں تیری کھال ادھیڑ دوں' زبان کھول دے!" اس نے مجھے دھمکی دی۔

مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ معاملہ سنگین نوعیت اختیار کر گیا ہے۔ یہی سوچ کر میں عاجزی پر اتر آیا۔ میری پوری کوشش تھی کہ کسی طرح اسے میری بے گناہی کا یقین آ جائے۔ میری عاجزی اور گریہ زاری پورے طور پر رائگاں نہیں گئی۔ اسی سے کم از کم یہ ضرور رہا کہ اس کے چہرے کا تناؤ ختم ہو گیا۔

"اگر تو سچا ہے تو پھر میں ایس پی صاحب کو کیا جواب دوں؟ انھوں نے میری ناک میں نکیل ڈال رکھی ہے!" اس کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔

مجھے اندھیرے میں روشنی نظر آئی تو فوراً بول اٹھا۔ "آپ ان سے بس تین دن کی مہلت لے لیں' وہ تخریب کار آپ کے قدموں میں ہوں گے"۔

"کیا"! وہ ایک دم چونک اٹھا۔ "کیا تو انھیں جانتا ہے"؟

"نہیں"۔

"پھر؟..... پھر کیا جادو کی چھڑی ہے تیری پاس کہ مجرم خود چل کر تھانے آ جائیں گے"؟

"بس میرا عمل پورا ہو جائے' پھر میں دو منٹ میں مجرموں کا سراغ لگا لوں گا۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر جو چور کی سزا وہ میری!" میں نے بہت اعتماد سے کہا۔

"رہنے دے بس! زیادہ ڈون کی نہ لے۔ تو ایسا ہی پہنچا ہوا ہوتا تو حوالات میں نہ سڑ رہا ہوتا! چلا ہے مجھے گھسّا دینے"! وہ منہ بنا کر بولا' پھر کہنے لگا۔ "بس اب میں تجھے حوالات سے نہیں نکلنے دوں گا۔ ایک رات کے لیے چھوڑا تھا تو یہ گل کھلا دیا تو نے' مزید....."

"ایسا نہ کہیں جناب"! میں بول اٹھا۔ "اس سے تو بہتر ہے کہ آپ مجھے شوٹ کر دیں۔ خود گولی مار دیں مجھے' تاکہ میں سسک سسک کر تو نہ مروں"! میں پھر آہ و بکا پر اتر آیا۔ اس وقت اسی کی ضرورت تھی۔ میں جس قدر عمدہ اداکاری کا مظاہرہ کرتا' اس پر اتنا ہی اثر

ہوتا۔ میں اس کے سامنے گڑگڑا رہا تھا۔ "آپ نے .... آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ روز رات کے وقت ....." میں اسے وہ زبانی معاہدہ یاد دلانے لگا جو اس کے اور میرے مابین ہوا تھا۔ "اسی کی خاطر تو جناب میں نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا' یہاں تک کہ اپنی کوٹھی ...."

"بس بس مزید بکواس کی ضرورت نہیں! اب میں دعویٰ کس پر کروں گا' اس کوٹھی کی تباہی کا؟ اب وہاں رہ کیا گیا ہے سوائے زمین کے!"

"لیکن .... لیکن جناب اس میں میرا..... میرا تو کوئی قصور نہیں۔ میں نے اس وقت کوٹھی کے کاغذات آپ کے سپرد کر دیے تھے جب....."

"زیادہ صفائیاں نہ دے مجھے سمجھا! اس میں بھی کوئی چال ہو گی.... ہاں!" وہ منہ بگاڑ کر بولا۔ "سارے شہر میں خوف و ہراس پھیل گیا ہے۔ فون پر فون آ رہے ہیں افسران کے! اور تو مجھے الٹی پٹیاں پڑھانے کی کوشش کر رہا ہے"!

"میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ میرا اس واقعے سے کوئی تعلق نہیں۔ میری زندگی تو خطرے میں پڑ گئی تھی۔"

"تو کیا تو یہ سمجھ رہا ہے کہ تیرے مرنے سے ہماری جان چھوٹ جاتی! افسران پوچھتے نہیں مجھ سے کہ جو بندہ حوالات میں تھا' وہ کہاں گیا؟ اور اس کی لاش حوالات سے باہر موقع واردات پر کیسے پائی گئی"؟

پھر بڑے بحث مباحثے اور منت سماجت کے بعد وہ اپنے وعدے پر قائم رہنے کے لیے آمادہ ہوا۔ اسے بھی میں خدا کی طرف سے مدد ہی کہوں گا کہ جس نے اس کے دل میں نیکی ڈال دی ورنہ تو میں گھبرا گیا تھا۔ یوں بھی قانونی طور پر مجھ سے جواب طلبی کا اس کے پاس کوئی جواز نہیں تھا کیوں کہ میں بہرحال پولیس کسٹڈی میں تھا۔ ابھی میں اسی کے کمرے میں تھا کہ معاً میری گردن میں شدید تکلیف شروع ہو گئی۔ اسی کے ساتھ مجھے یاد آیا کہ آج گردن کے زخم کی ڈریسنگ نہیں ہو سکی۔

"کیا ہوا تمہیں"؟" میرے چہرے پر غالباً تکلیف و اذیت کے آثار دیکھ کر اور میری کراہ سن کر ایس ایچ او نے پوچھا۔

"کل .... کل آپ نے .... فرمایا تھا کہ ڈاکٹر...." میں رک رک کر بہ مشکل بول رہا تھا۔ "آپ نے .... کہا تھا کہ صبح کسی سپاہی کو میری کوٹھی بھیج دیں گے اور وہ ڈاکٹر کو یہاں

"اچھا!.... یہ تو میں بھول گیا تھا"۔ اس نے اس طرح کہہ دیا جیسے یہ کوئی بات ہی نہ

ہو۔

اپنی تکلیف کے احساس پر قابو پاتے ہوئے میں نے اس سے التجا کی کہ میرے بتائے ہوئے پتے پر وہ اسی وقت کسی سپاہی کو بھیج دے۔

"آ بھی جائے گا وہ ڈاکٹر؟..... میرا مطلب ہے کہ پیسے ویسے تم نے اسے...."

"وہ میں پیشگی دے چکا ہوں۔ آپ بس مجھ پر اتنی مہربانی..... کر دیں کہ ...... کہ کسی سپاہی...." میں بات ادھوری چھوڑ کر پھر کراہنے لگا۔ تکلیف لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔

"پتہ بتاؤ!"

میں نے اسے پتہ بتا دیا اور اس نے لکھ لیا۔

"ٹھیک ہے' میں ابھی کسی سپاہی کو بھیج دیتا ہوں"۔ وہ بولا۔ شاید اسے میری حالت پر رحم آ گیا تھا۔ "تمہیں تکلیف کیا ہے؟ بیٹھ جاؤ کرسی پر! کیا کوئی پرانا زخم ہے""؟

"جی ..... جی ہاں ..... بہت .... بہت پرانا!" یہ کہہ کر میں کراہتے ہوئے آہستہ آہستہ اپنی گردن پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی کُند چھری سے میری گردن کاٹ رہا ہے۔

"تمہارا چہرہ تو پسینے میں بھیگ گیا ہے! ٹھہرو' میں بلاتا ہوں کسی سپاہی کو"۔ یہ کہہ کر اس نے وہیں سے کسی سپاہی کو اس کا نام لے کر پکارا۔

"جی سر!" سپاہی دروازہ کھول کر اندر آتے ہی اٹینشن ہو گیا۔

"اسے حوالات میں لے جا کر بند کر دو اور پھر میرے پاس آؤ"۔

"جی جناب!" سپاہی نے فرمانبرداری میں سر ہلایا' پھر میری طرف متوجہ ہوا۔

میں پہلے ہی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ گردن کی تکلیف میرے لیے ناقابل برداشت ہوئی جا رہی تھی۔ اسی کی وجہ سے میرا جسم کانپنے لگا تھا۔ سپاہی نے غالباً میری حالت کا اندازہ لگا کر میرا بازو پکڑ لیا اور چلنے کو کہا۔

ایس ایچ او کے کمرے سے نکل کر حوالات تک جاتے ہوئے راستے ہی میں میری حالت اتنی بگڑ گئی کہ قدم اٹھانا دوبھر ہو گیا۔ درد کی لہریں جیسے اب میرے سارے جسم میں دوڑ رہی تھیں۔ گردن سے خون رس رس کر اب میرے سینے کو بھگو رہا تھا۔

"کیا ہوا رک کیوں گئے!؟ چلو!" سپاہی نے میرا بازو کھینچا۔

"نن ..... نہیں"۔ میری زبان بھی لڑکھڑانے لگی اور اسی وقت مجھے چکر آ گیا۔ پھر میں سنبھلتے سنبھلتے بھی زمین پر گر پڑا۔

اس کے بعد کیا ہوا' مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میری آنکھ حوالات میں کھلی تھی اور ڈاکٹر امتیاز میرے اوپر جھکا ہوا تھا۔

"شیخ صاحب! اچھے تو ہیں اب آپ؟" میں نے آنکھیں کھولیں تو اس نے مجھے مخاطب کیا۔ "اب تو تکلیف محسوس نہیں ہو رہی؟"

"نہیں" ۔ یہ کہتے ہوئے میں اٹھ کر بیٹھنے لگا۔

"لیٹے رہیں" ۔ اس نے آہستگی سے میرے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "ابھی کچھ دیر آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ میں نے بینڈیج کر دی ہے۔ دراصل آج کیوں کہ وقت پر ڈریسنگ نہیں ہو سکی اس لیے دوا کا اثر ختم ہو گیا تھا۔ آپ فکر نہ کریں' کل میں یہیں وقت پر آجاؤں گا۔ تھانیدار صاحب سے بات ہو گئی ہے میری" ۔

ڈاکٹر امتیاز یقیناً اپنے سینے میں گداز دل رکھتا تھا اور اپنے پیشے سے بھی مخلص تھا ورنہ سبھی ڈاکٹر ایسے نہیں ہوتے۔ اسے میں نے احسان مند نگاہوں سے دیکھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میری حالت کے پیش نظر اس نے اب تک مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ اس کے دل میں تجسس ضرور ہو گا کہ میں حوالات میں کیسے نظر آرہا ہوں' مگر اظہار نہیں کیا اور اپنا بیگ اٹھا کر چلنے کی تیاری کرنے لگا۔ میری بے ہوشی کے بعد جو کچھ ہوا' اسے سمجھنا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ میں ڈاکٹر کا پتہ پہلے ہی ایس ایچ او کو بتا چکا تھا۔ اس نے کسی سپاہی کو بھیج کر ڈاکٹر کو بلوا لیا ہو گا۔

چلتے چلتے ڈاکٹر امتیاز نے صرف اتنا کہا۔ "میں حسب معمول آپ کی کوٹھی پر گیا تھا' مگر ....."

"ہاں مجھے معلوم ہو چکا ہے۔" میں اس کی بات کاٹ کر بولا۔ "کسی نے میری کوٹھی کو دستی بموں سے اڑا دیا ہے۔"

"جی یہی معلوم ہوا تھا مجھے۔" اس نے تصدیق کی' پھر بولا۔ "اچھا خدا حافظ! آپ جتنا زیادہ آرام کر سکیں' بہتر ہے آپ کے لیے" ۔ یہ کہتا ہوا وہ اپنا بیگ اٹھائے ہوئے حوالات کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

حوالات کا دروازہ' سپاہی نے مقفل نہیں کیا تھا۔ ڈاکٹر امتیاز کو دروازے کی طرف آتے دیکھ کر وہ آگے بڑھا اور پھر میں نے ڈاکٹر کو جاتے دیکھا۔ سپاہی نے اس کے نکلتے ہی دروازے پر تالا ڈال دیا۔ اب واقعی تکلیف ختم ہو چکی تھی' ہاں کم زوری ضرور تھی' مگر اتنی بھی نہیں کہ میں چل پھر نہ سکوں۔

ہر چند کہ ایس ایچ او نے اپنے وعدہ پر قائم رہنے کا اقرار کر لیا تھا' اس کے باوجود مجھے سارے دن فکر رہی ایسے لوگوں کا کچھ بھروسا نہیں ہوتا ہے کہ کب اپنی زبان سے پھر جائیں! مگر ایسا نہیں ہوا۔ گذشتہ رات کی طرح آج بھی وہی سب کچھ ہوا اور میں نے اپنی کوٹھی کے کھنڈر میں پہنچ کر مقررہ وقت پر عمل شروع کر دیا۔ وہ رات خیریت سے گزر گئی اور مجھے اس پر شدید حیرت ہوئی۔ ذہنی طور پر میں آج بھی مہ پارہ کی جانب سے کسی حملے کا منتظر تھا۔

آخری دن میرا اضطراب عروج پر تھا۔ میں عمل پورا کر کے حوالات میں پہنچ چکا تھا۔ اب آنے والی رات باقی تھی۔ ڈاکٹر امتیاز حسب وعدہ وقت مقررہ پر آگیا۔ ایک طرف میرے دل میں اضطراب تھا' دوسری یہ خوشی بھی کہ آنے والا دن میری زندگی کا نیا دن ہو گا۔ جو کچھ مجھ پر گزری ہے' میں نے جتنے دکھ جھیلے ہیں' ان کا سدِباب ہو جائے گا' مجھے میرا ہمزاد مل جائے گا! یہی سبب تھا کہ جب ڈاکٹر امتیاز میری گردن کی ڈریسنگ کر رہا تھا تو میں نے اس سے کہا۔ "کل سے آپ کو زحمت نہیں ہو گی" ۔

"جی!" وہ حیرت سے بولا۔

"جی ہاں کل سے آپ کو ڈریسنگ کی ضرورت پیش نہیں آئے گی" ۔ میں نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا" ۔ انشاء اللہ ایسا ہی ہو گا" ۔

"مگر..... مگر شیخ صاحب' آپ..... آپ کے زخم کی حالت تو....."

"جی ہاں مجھے معلوم ہے" ۔ میں مسکرایا' پھر بولا۔ "آپ عقائد پر تو یقین رکھتے ہوں گے نا؟"

"جی..... جی بالکل! میں بہ حمد اللہ مسلمان ہوں اور صاحب عقیدہ بھی" ۔ اس نے کہا۔

"عقیدے میں بڑی قوت ہے اور عقیدے ہی سے آدمی یقین کی منزل تک پہنچتا ہے۔ آپ نے ابھی پریکٹس شروع کی ہے۔ لازماً آئندہ زندگی میں آپ کو اس کے تجربات ہوں گے کہ یقین ہی زندگی اور موت کے درمیان حدِ فاصل ہے۔ غالباً ایک مثال سے میری بات زیادہ واضح ہو سکے۔ یوں سمجھیں کہ ایک مریض کو یقین آچکا ہے کہ وہ اب زندہ نہیں بچے گا تو پھر اسے بچانا آپ کے لیے تقریباً ناممکن ہو جائے گا۔ آدمی جو کچھ سوچتا ہے اس کا اثر جسم بھی قبول کرتا ہے فوری طور پر اس کا جسم' دماغ کے زیر اثر ان محسوسات کو قبول کرنے لگتا ہے جو حقیقتاً ہوتے نہیں۔ قلبی اور دماغی امراض میں عموماً یہ صورت حال پیش آتی ہے نفسیات کے رو سے بھی یہ ناممکن بات نہیں۔ ارادے کی قوت' یقین ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ غالباً آپ میرا

مطمع نظر سمجھ رہے ہیں"۔

"شیخ صاحب! آپ کی باتیں سن کر مجھے حیرت ہو رہی ہے۔ آپ کا مطالعہ یقیناً بہت وسیع ہے"۔ اس نے میری گردن کی ڈریسنگ مکمل کرتے ہوئے مرعوب لہجے میں کہا۔ "مجھے آج سے پہلے اندازہ نہیں تھا کہ آپ صاحب علم آدمی ہیں۔ بہرحال خدا کرے وہی ہو جو آپ نے کہا ہے۔ ہم لوگ تو صرف ظاہر کو دیکھتے ہیں اور اپنے تھوڑے بہت علم کے مطابق علاج تجویز کرتے ہیں، مگر اس کے باوجود شفا دینا خدا ہی کے اختیار میں ہے آپ کا حکم ہو تو میں کل سے نہیں آؤں گا"۔

"انشاء اللہ میں خود جلد ہی آپ سے ملوں گا"۔ میں بولا۔ "آپ نے جس ذمے داری اور خلوص کے ساتھ اپنا فرض ادا کیا ہے، اس کے لیے میرے پاس شکریے کے سوا کوئی اور لفظ نہیں، مگر جو خدمت ممکن ہوئی ضرور کروں گا"۔

وہ میرا اشارہ سمجھ گیا اور کہنے لگا۔ "نہیں شیخ صاحب میں نے کیا ہی کیا ہے! آپ نے پیشگی معاوضہ ادا کر دیا تھا، مجھے مزید کچھ نہیں چاہیے۔"

"خلوص کا کوئی معاوضہ نہیں ہوتا۔ خیر یہ بعد کی باتیں ہیں۔ میں آپ سے ملوں گا ضرور تاکہ میرے یقین کو آپ عملی صورت میں بھی دیکھ سکیں"۔

"یقیناً یہ میری زندگی کا بہت بڑا تجربہ ہو گا"۔ وہ اپنا بیگ بند کرتے ہوئے کہنے لگا۔ "بسر وچشم جب بھی چاہیں غریب خانے پر تشریف لائیں، مگر......" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"یہ سب چند دن کی باتیں ہیں۔ کچھ غلط فہمیاں ہو گئی ہیں، پولیس والوں کو میری طرف سے"۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کیا بات کہتے کہتے رک گیا تھا۔ اس کا اندازہ مجھے اس کے چہرے سے بھی ہو گیا تھا۔ "جلد ہی یہ غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی"۔

اس نے میری بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور رخصت ہو گیا۔ ڈاکٹر امتیاز نے ابھی زندگی گویا آغاز کی تھی۔ وہ نوجوان تھا اور اس کی آنکھوں میں بھی یقیناً مستقبل کے لیے بہتر خواب ہوں گے۔ میں اسی لیے اسے نظر انداز کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ہاں بس اتنا تھا کہ ایک رات اور یہ خیریت سے گزجاتی۔

یہ بھی اسی دن کا ذکر ہے کہ میرے ذہن میں کچھ اور بھولی بسری باتیں آئیں۔ میں اس وقت ہمزاد کی پُراسرار قوتوں کے بارے میں غور کر رہا تھا۔ وہ عبارت میرے صفحہ ذہن پر الفاظ کی صورت میں نمایاں ہو گئی جو میں نے فارسی زبان کے ایک قلمی نسخے میں پڑی تھی۔ وہ قلمی نسخہ اب تک میرے پاس موجود تھا۔ وہ الفاظ مجھے ازبر ہو چکے تھے، لیکن اس دن سے پہلے میں

نے ان پر غور نہیں کیا تھا۔ دیگر تمام باتوں سے قطع نظر اس وقت میں جس بات پر غور کر رہا تھا۔" وہ محض چند الفاظ تھے۔

میرے زیر غور اس وقت یہ مسئلہ تھا کہ ان الفاظ کی روشنی میں مجھے سرطان ایسے موذی مرض سے نجات مل سکتی ہے؟ اگر ایسا ہو جاتا تو پھر مجھے جسم تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ممکن ہے، میں نے اس بات پر پہلے غور کر لیا ہوتا تو اتنی اذیتوں سے نہ گزرتا۔ یہ مہ پارہ کے سحر کا نتیجہ تھا کہ اس نے مجھے ایسے خطرناک مرض میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس کا مقصد محض یہ تھا کہ میں سکون کے ساتھ زندگی بسر نہ کر سکوں۔

اب میری منزل بالکل قریب آگئی تھی تو مجھے یہ ساری باتیں یاد آ رہی تھیں، میں اپنے ہمزاد کو ایک بار پھر تسخیر کرنے والا تھا۔

پھر وہ اضطراب و تجسس کا دن بھی گزر گیا۔ اس دن کوشش کے باوجود میں زیادہ دیر نہ سو سکا اور میرا زیادہ وقت عبادت الٰہی میں گزرا۔ رات ہوئی تو میرے دل کی دھڑکنوں میں اور بھی اضافہ ہو گیا کہ جانے آج رات کیسی گزرے؟ رہ رہ کر مجھے مہ پارہ کا خیال آ رہا تھا۔ وہ خاموش کیوں ہے؟ کیا اس نے اپنی شکست قبول کر لی؟ کیا اس نے ہمیشہ کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دیا؟ اگر واقعی ایسا ہے تو کیوں؟ ابھی تو وقت باقی ہے، پھر کیوں وہ کوئی حربہ نہیں آزما رہی؟ ذہن میں یہی سوال گردش کرتے رہے اور وقت گزرتا رہا۔

وقت مقررہ پر میں آج رات بھی خاموشی کے ساتھ حوالات سے نکل گیا۔ ایس ایچ او ابھی تک اپنے وعدے پر قائم تھا۔ ہاں آج رات گزرنے کے بعد جو چاہتا، میرے ساتھ سلوک کرتا اور میں اس کے لیے تیار تھا۔ آج فیصلے کی رات تھی، ادھر یا ادھر، زندگی یا موت!

حوالات اور تھانے سے نکل کر اپنی حویلی کی طرف جاتے ہوئے مجھے قطعی علم نہیں تھا کہ میرے قدم زندگی کی طرف بڑھ رہے ہیں یا موت کی طرف! بہرحال میں آیات قرآنی کا ورد کرتا ہوا اپنی منزل تک پہنچ ہی گیا۔ ہر طرف سکوت اور اندھیرا تھا۔ ملبے کے درمیان اور ٹوٹی ہوئی دیواروں کے قریب سے گزرتا ہوا میں اپنے کمرے تک پہنچ گیا۔ پھر جیسے ہی میں نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا میری آنکھوں میں چکاچوندی ہو گئی۔

اندھیرے سے ایک دم تیز اور چبھتی ہوئی روشنی کے مقابل آ کر میری آنکھیں بند ہو گئیں اسی وقت مجھے ایک آشنا آواز سنائی دی۔ "آنکھیں کھولو شیخ! آخری نظارہ کر لو۔ پھر شاید تم مجھے کبھی نہ دیکھ سکو"۔ یہ آواز میری دشمن جاں مہ پارہ کی تھی۔

اس افتاد نے وقتی طور پر میرے حواس کو متاثر ضرور کیا، مگر اس قدر نہیں کہ میں

سنبھل نہ پاتا۔ یقیناً اس تیز روشنی کا مقصد مجھے بوکھلا دینا ہی تھا' مہ پارہ نے دانستہ یہ حرکت کی تھی۔

"روشنی سے ڈرتے ہو!" مہ پارہ کی آواز میں نے پھر سنی اور اسی کے ساتھ وہ زور نے سے ہنس پڑی۔

"تم اب چاہتی کیا ہو؟" میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں میرے بالکل مقابل ایک چمکیلا غبار رقصاں تھا جس کے درمیان مہ پارہ کا ہیولا نظر آ رہا تھا۔ اس کے لبوں پر بڑی سفاک مسکراہٹ تھی۔

"میں کیا چاہتی ہوں! بتا دوں؟ .... بس یوں سمجھ لو کہ جو میں چاہتی تھی' وہ پورا ہو گیا"۔

"اسے میں تمہاری شکست کی آواز سمجھوں یا دھمکی؟" میں نے جرات کا مظاہرہ کیا۔

"دھمکی' نہ شکست کی آواز! اسے تم حقیقت سمجھ سکتے ہو"۔ اس نے بڑے سکون اور اعتماد سے جواب دیا۔

مدتوں بعد یہ پہلا موقع تھا کہ میں اس سے ہم کلام تھا۔ اس سے پہلے ہمیشہ وہ میرے عمل کے دوران میں ہی آتی رہی تھی یا ایک بار عمل کے وقت سے پہلے آئی تھی تو فوراً ہی دھمکی دے کر غائب ہو گئی تھی۔ میں کچھ کہنے کی حسرت لیے ہی رہ گیا تھا' مگر آج یہ موقع تھا اور عمل کا وقت شروع ہونے میں بھی ابھی دیر تھی میں اسی لیے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے بولا۔ "پرسوں رات بھی تم نے دعویٰ کیا تھا کہ یہ میری زندگی کی آخری رات ہے!" میرے لہجے میں کاٹ تھی۔

"ہاں میں نے دعوی کیا تھا اور وہ دعوی غلط نہیں تھا' مگر.... مگر کسی ان دیکھی قوت نے تمہیں بچا لیا۔ میں نے اپنی دانست میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی کہ تم زندہ بچ سکتے' لیکن یہ ان ہونی ہو گئی۔ اس کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی کر تمہیں ہلاک کرنا' ممکن نہیں۔ مجھے تمہارے لیے کچھ اور ہی بندوبست کرنا پڑے گا کیوں کہ اب تمہارے اور میرے درمیان ہمیشہ کے لیے رابطہ ختم ہونے کا وقت قریب آ رہا ہے۔ میں اسی لیے کل رات غائب رہی اور میں نے تمہارے لیے جو کچھ سوچا تھا' اسے عملی شکل دے دی۔ اس طرح میں اپنی بیشتر قوتوں سے محروم تو ہو چکی ہوں' مگر مجھے اس کا کوئی ملال نہیں۔ اسی سبب اب میری بھٹکتی ہوئی روح ہمیشہ کے لیے قید ہو جائے گی' لیکن یہ قید میں نے خود قبول کی ہے۔ اب میں اس دنیا میں کبھی نہ آ سکوں گی۔ میں نے اسی لیے کچھ دیر قبل تم سے کہا تھا کہ آخری نظارہ کر لو۔ میں جانتی ہوں کہ

تم ایک عرصے میرے لیے تڑپتے رہے ہو اور خود بھی میں نے تمہیں تڑپایا ہے۔ میں نے اسی وجہ سے موت کو گلے لگا لیا تھا تاکہ تم زندگی بھر ایک شکست کا زخم سینے میں لیے سلگتے رہو۔ شیخ! ابھی میرے انتقام کی آگ بجھی نہیں اور بجھ بھی کیسے سکتی ہے کہ تمہاری ہی وجہ سے میں نے موت کو قبول تھا اور اب......" وہ کچھ کہتے ہوئے رک گئی۔

میں پوری توجہ اور انہماک سے اس کی باتیں سن رہا تھا' لیکن وہ چپ ہو گئی تو مجبوراً مجھے بولنا پڑا تاکہ وہ اصل بات جو اس نے نہیں بتائی' اس کی زبان پر آ جائے۔ میں نے کہا۔ "تم نے اس بندوبست کے بارے میں کچھ نہیں بتایا جس کے لیے اتنی تمہید باندھی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ بھی محض تمہاری بڑ ہے"۔ میرا مقصد اسے غصہ دلانا تھا۔ غصے میں عموماً اصل بات منہ پر آ جاتی ہے۔

خلاف توقع غصے میں آنے کی بجائے وہ عجیب سے انداز میں ہنس پڑی' پھر بولی۔ "بہت چالاک ہو تم! میں اس سلسلے میں ہرگز تمہیں کچھ نہیں بتاؤں گی"۔

میری نگاہ اسی کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ اگر وہ سب کچھ سچ تھا جو اس نے کہا تھا تو یقیناً میں اسے آخری بار دیکھ رہا تھا۔

اس نے بھی غالباً میری وارفتگی کو محسوس کر لیا اور خوابیدہ سی آواز میں بولی۔ "دیکھ لو شیخ!.... صرف چند لمحے اور دیکھ لو! کاش تم نے میری انا پر ضرب نہ لگائی ہوتی..... کاش تمہیں اپنی قوت پر غرور نہ ہوتا اور.... اور کاش تم مجھ سے نہ ٹکرائے ہوتے۔ پھر.... پھر شاید زندگی مجھ سے یوں نہ روٹھتی اور تم.... تم بھی عذابوں کے سفر میں تنہا نہ ہوتے"۔ اس کی آواز لحہ بہ لحہ مدھم ہوتی جا رہی تھی۔ چمکیلا غبار ماند پڑتا جا رہا تھا۔ اب اس کا ہیولا دھندلا گیا تھا۔

مجھ پر بھی اس وقت ایک ناقابل بیان سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ دل پر ایک بوجھ سا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے اسی کیفیت میں اسے پکارا۔ "مہ پارہ!..... مہ پارہ!"

"جانے والوں کو آواز نہیں دیا کرتے شیخ!..... وقت گزر چکا ہے۔ خدا حافظ..... ہمیشہ کے لیے خدا حافظ!" اس کی آواز جیسے کہیں بہت دور سے سنائی دی اور اسی کے ساتھ کمرے میں تاریکی پھیل گئی۔ چمکیلا غبار اور مہ پارہ کی روح کا ہیولا غائب ہو چکا تھا۔

کچھ دیر میں عجیب سے عالم میں اپنی جگہ کھڑا رہا۔ دشمنی کی بھی اپنی الگ ایک قدر ہوتی ہے اسی لیے کہا گیا ہے کہ نادان دوست سے دانا دشمن بہتر ہوتا ہے۔ مہ پارہ کا شمار یقیناً دانا دشمنوں میں کیا جا سکتا ہے۔ ایسے دشمن بھلائے نہیں بھولتے۔

وہاں مجھے احساس ہوا کہ کہیں عمل کا وقت نہ گزر جائے۔ میں نے جلدی سے آگے

بڑھ کر چراغ روشن کر دیا۔ اس وقت بارہ بجنے میں صرف دو منٹ باقی تھے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر بہ عجلت عمل کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔

ہمزاد کے عمل کی وہ آخری رات بغیر کسی ہنگامے کے گزر گئی۔ معلوم نہیں مہ پارہ نے مجھ سے انتقام لینے کی کیا صورت نکالی تھی، لیکن عمل میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوئی۔

پہلی مرتبہ جب میں نے ہمزاد کا چلّہ پورا کیا تھا تو وہ فوری طور پر میرے سامنے نہیں آیا تھا اور مجھے بڑی آزمائشوں میں ڈالا تھا جن کا ذکر تفصیلی طور پر کر چکا ہوں۔ اس مرتبہ ایسا نہیں ہوا اور اس کا سبب تھا۔ اب ہمزاد خود مسخر ہونا چاہتا تھا۔ ایک طویل عرصے ساتھ رہ کر مجھے اس سے اور اسے مجھ سے لگاؤ ہو گیا تھا کیوں کہ وہ میرا ہی پرتو تھا۔ ادھر میں نے اپنا عمل ختم کیا، ادھر وہ ظاہر ہو گیا۔

"اے شیخ! مبارک ہو آپ کو کہ آپ نے اپنے جسم لطیف کو پھر مسخر کر لیا"۔ میں نے ہمزاد کی آواز سنی۔ یہ میری ہی آواز تھی، بالکل میری آواز! وہ تھا بھی میرا ہی ہم شکل۔

میں اسے کوئی جواب دینے کی بجائے ایک ٹک دیکھے جا رہا تھا جیسے مجھے اپنی بصارت پر یقین نہ آ رہا ہو۔ انتہائی مسرت کے احساس نے گویا میری قوت گویائی سلب کر لی تھی۔ پھر جانے مجھے کیا ہوا کہ میں زور زور سے ہنسنے لگا، قہقہے لگانے لگا۔ ہمزاد میرے سامنے مودب کھڑا رہا۔

چالیس دن کے دوران میں میرے دل پر جو جو زخم لگے تھے جیسے وہ سب کے سب ایک ساتھ لو دینے لگے تھے۔ میری عزت نفس کو جس طرح مجروح کیا گیا تھا، مجھے جو آزار پہنچائے گئے تھے، غالباً انہی کے ردِ عمل طور پر میں اس وقت قہقہے لگا رہا تھا اس لیے کہ اب میں صاحب اقتدار تھا۔ میری کھوئی ہوئی قوت مجھے واپس مل چکی تھی۔ اب میں ایک ایک زخم کا حساب بہ آسانی چکا سکتا تھا۔

پہلی باز ہمزاد کے اور میرے درمیان جو شرائط طے ہوئی تھیں، ان میں صرف ایک جگہ جھول رہ گیا تھا۔ اسی وجہ سے مجھے ہمزاد کا عمل دوبارہ کرنا پڑا تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اسے سو برس کے بعد آزاد کر دوں گا۔ اس وقت میرے ذہن میں یہ تھا کہ اگر میں جیا بھی تو زیادہ سے زیادہ سو برس جیوں گا۔ میں نے اسی لیے یہ شرط مان لی تھی۔ اب پھر وہی مرحلہ تھا۔ تمام شرائط جوں کی توں برقرار رہیں، صرف یہ شرط کہ میں نے اسے کتنی مدت کے لیے مسخر کیا ہے؟ اس میں تبدیلی ہوئی۔ میں نے اس سے کہا۔ "مدت کی قید اس بار نہ لگاؤ! یہ مدت کم بھی ہو سکتی ہے اور زیادہ بھی۔ یہ تم مجھ پر چھوڑ دو، میں جب چاہوں گا، تمہیں آزاد کر دوں گا"۔

اس نے کسی حجت کے بغیر میری بات مان لی۔

"میں نے تمہاری قوتوں کے بارے میں یہ بھی پڑھا تھا کہ تم سخت اور مہلک بیماریوں کے علاج بھی تجویز کر سکتے ہو"۔ میں نے ہمزاد سے کہا۔ "پھر کیا وجہ ہوئی کہ تم مجھے سرطان ایسے مرض سے بچا نہ سکے؟ یقیناً اس کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ہو گی؟!"

"ہاں وجہ تھی"۔ ہمزاد نے جواب دیا۔ "اول تو خود آپ نے اس خواہش کا اظہار نہیں کیا۔ دوم یہ کہ اگر آپ مجھ سے ایسا کہتے بھی تو میں اس کا مشورہ نہ دیتا"۔

"وہ کیوں؟" میں نے نرمی سے پوچھا۔

"اس لیے کہ آپ کی دشمن مہ پارہ پھر کوئی اور خطرناک حربہ آزماتی جس کا تجربہ پہلے بھی آپ کو ہو چکا ہے۔ ایک مرتبہ اس نے آپ کو دونوں ٹانگوں سے معذور کر دیا تھا۔ یہ بھی ہوا تھا کہ آپ کے ہاتھ بیکار ہو گئے تھے۔ میرے نزدیک سرطان کم عذاب تھا۔ اس میں کم از کم فوری طور پر آپ کو جسم تبدیل کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی جو بہ ہر حال ایک مسئلہ ہوتا۔" ہمزاد نے تفصیل کے ساتھ میرے سوال کا جواب دے کر مجھے مطمئن کر دیا۔

"خیر اب صورت حال بدل چکی ہے"۔ میں طویل سانس لے کر بولا۔ "مجھے گویا نئی زندگی مل گئی ہے اور میں نے تمہیں بھی دوبارہ حاصل کر لیا ہے"۔ یہ کہہ کر میں، ہمزاد کو ان باتوں سے آگاہ کرنے لگا جو میرے اور مہ پارہ کے درمیان آج رات ہوئی تھیں۔ اس کے بعد میں نے کہا۔ "اب وہ ہمیشہ کے لیے میرا پیچھا چھوڑ چکی ہے۔ باقی تمام باتوں سے قطع نظر فی الحال میں یہ چاہتا ہوں کہ مکمل طور پر صحت یاب ہو جاؤں۔ نئی زندگی ملنے کے بعد اسے تم میری پہلی خواہش بھی سمجھ سکتے ہو"۔

"یہ کوئی مشکل کام نہیں"۔ اس نے کہا۔ "آپ سات دن کے اندر اندر اس موذی مرض سے مکمل طور پر نجات حاصل کر لیں گے"۔

"اس کے لیے مجھے کیا کرنا پڑے گا؟"

"کچھ نہیں۔ یہ میرا مسئلہ ہے۔ میں آج ہی کسی وقت دوا فراہم کر دوں گا"۔

"دوا؟" میں حیرت سے بولا۔

"ہاں۔ وہ دوا چند جڑی بوٹیوں اور مخصوص قسم کے ایک خود رو پودے کی پتیوں پر مشتمل ہو گی۔ یہ خود رو پودا اونچے پہاڑوں کی چٹانوں کے درمیان نسبتاً نرم جگہ میں اگتا ہے جہاں کسی انسان کی رسائی نہیں ہوتی۔ یہ قدرت کے راز ہیں۔ اس نے جو مرض بھی پیدا کیا ہے، اس کا علاج بھی رکھا ہے، سوائے موت کے! اور موت کا سبب کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

بہر حال میں وہ بوٹیاں اور مخصوص پودے کی پتیاں لے آؤں گا۔ آپ انہیں پیس کر سفوف بنالیں، پھر اس سفوف کے سات حصے کرلیں۔ روزانہ آپ کو ایک خوراک سوتے وقت پانی سے کھانا ہے انشاء اللہ آپ کو شفا ہو جائے گی"۔

"کیا یہ ممکن نہیں کہ تم یہ جڑی بوٹیاں اور پتیاں زیادہ تعداد میں لے آؤ تاکہ ...."

"میں سمجھ رہا ہوں کہ آپ کا مقصد کیا ہے! آپ یقیناً خلق خدا کی بھلائی کے لیے یہ دوا زیادہ مقدار میں تیار کرنا چاہتے ہیں، لیکن میں آپ کو اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔" ہمزاد بولا۔

"کیوں، اس میں حرج بھی کیا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"ممکن ہے کہ اس طرح وہ دوا اپنی تاثیر کھو بیٹھے"۔ ہمزاد وضاحت کرنے لگا۔ "اس سے ایک خطرہ یہ پیدا ہو جائے گا کہ پھر وہ آپ کو بھی فائدہ نہ کرے۔ دوا تو ایک ذریعہ ہے ورنہ شفا دینے والی ذات خدا کی ہے۔ دوا میں تاثیر بھی اسی ذات نے پیدا کی ہے اور وہ اس کی تاثیر ختم کرنے پر بھی قادر ہے۔ یہ دوا صرف اسی کے لیے کارگر ثابت ہو سکتی ہے جو اپنے ہمزاد کو مسخر کرلے۔ غالباً میں نے اپنی بات پوری طرح سمجھا دی ہے۔ بغیر جدوجہد اور بغیر کوشش کے کچھ نہیں ملتا"۔

میں نے اس کی وضاحت سن کر طویل سانس لیا، پھر بولا۔! "اگر ایسا ہے تو پھر مجبوری ہے۔ بہر حال میرے لیے وہ جڑی بوٹیاں اور پتیاں لا دینا"۔

اس نے اقرار میں گردن ہلا دی، پھر کہنے لگا۔ "اجازت ہو تو اب میں جاؤں؟"

"نہیں"۔ میں نے جواب دیا، پھر خود ہی اجازت نہ دینے کی وضاحت کی۔ "دراصل تمہارے بغیر چالیس دن یوں گزرے ہیں جیسے چالیس برس ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ آج تو تم زیادہ سے زیادہ وقت میرے ساتھ رہو"۔

"جو آپ کا حکم"۔

"چلو اب تھانے چلتے ہیں"۔ میں نے کہا۔ "اس وقت تک فجر کا وقت بھی ہو جائے گا۔ نماز پڑھ کر میں کچھ دیر کے لیے سو جاؤں گا، پھر سوچوں گا کیا کرنا ہے۔ اس دوران میں تم میرے لیے جڑی بوٹیاں وغیرہ لے آنا۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"بہتر ہے"۔

"مجھے تم سے کچھ تفصیلی گفتگو اور مشورہ بھی کرنا ہے، لیکن میں پہلے کچھ دیر آرام کر لینا چاہتا ہوں"۔

"یہ حق تو نہیں مجھے کہ آپ سے کوئی سوال کروں، لیکن فی الحال یہاں بھی تو آرام کیا

جاسکتا ہے"۔ ہمزاد بولا۔ "اب تو کوئی مسئلہ نہیں"۔

"تمہاری غیرموجودگی میں مجھ پر کیا کیا گزر چکی ہے، تمہیں نہیں معلوم"۔ میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ "فی الحال میں اپنے دشمنوں کو غفلت میں رکھنا چاہتا ہوں۔ ان سے حساب تو چکانا ہے، مگر ذرا سکون و اطمینان کے ساتھ! میں بھی ان کی بے بسی پر اسی طرح ہنسنا چاہتا ہوں جس طرح انہوں نے میرا تماشا بنا کر مذاق اڑایا تھا۔ آؤ چلیں .... مگر ٹھہرو، میں پہلے کپڑے بدل لوں اور گردن سے لپٹی ہوئی یہ پٹیاں بھی کھول کر پھینک دوں"۔

میرا ہمزاد ادب کے ساتھ ایک طرف کھڑا رہا۔ توقع کے مطابق میری گردن پر اب زخم کا معمولی سا نشان بھی نہیں تھا اور نہ کسی قسم کی تکلیف تھی۔ عمل پورا ہوتے ہی میری گردن اور بقیہ جسم کے درمیان رابطہ بحال ہو چکا تھا۔ پٹیاں کھول کر میں نے اپنی گردن پر ہاتھ پھیرا اور سکون کا گہرا سانس لیا۔

کچھ ہی دیر بعد میں اپنی حویلی کے کھنڈر سے نکل رہا تھا۔ آج فضا کچھ اور تھی، میرے محسوسات مختلف تھے۔ میرے دل میں نہ کوئی خوف تھا نہ اندیشہ! اب میں پھر وہی شیخ کرامت تھا، وہ جس نے کبھی بڑے سے بڑے خطرے کی پروا نہیں کی تھی اور وہ جو پُراسرار قوتوں کا مالک تھا۔ ہمزاد میرے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل رہا تھا، ہمزاد میرا ہی جسم لطیف، میرا ہی عکس، میرا ہی ہم آواز، میرا ہی ہم شکل! وہ اس وقت تک میرے سوا کسی اور کو نظر نہیں آسکتا تھا جب تک میں خود اسے یہ حکم نہ دیتا کہ دوسروں پر بھی اپنے وجود کو ظاہر کردے۔

تھانے کی طرف جاتے ہوئے مجھے بڑی طمانیت کا احساس ہو رہا تھا۔ آج میں مجبور نہیں مختار تھا، محکوم نہیں حاکم تھا، بے بس نہیں، صاحب اقتدار تھا۔

میں اس روز بھی حسب معمول تھانے کے عقبی پھاٹک سے گزر کر حوالات کے دروازے تک پہنچا اور سپاہی نے فوراً ہی میرے لیے دروازہ کھول دیا۔ ہمزاد بھی میرے ساتھ ساتھ حوالات میں داخل ہو گیا۔ اسی وقت کسی قریبی مسجد سے فجر کی اذان سنائی دینے لگی۔ حوالات کا دروازہ باہر سے مقفل کیا جا چکا تھا۔

"اب تم چاہو تو جاسکتے ہو۔ جب ضرورت ہوئی بلا لوں گا"۔ میں نے اپنے ہمزاد سے کہا۔

دوسرے ہی لمحے وہ میری نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ ہمزاد کو مخاطب کرتے ہوئے میری آواز نسبتاً بلند تھی۔ مجھے اس وقت یہ احساس نہیں ہو سکا تھا اور نہ میں اس سپاہی کی طرف متوجہ تھا جو دروازے کی سلاخوں ہی سے لگا کھڑا تھا۔ میں چونکہ اس وقت جب سپاہی نے

مجھے مخاطب کیا۔ "تم کس سے باتیں کر رہے ہو؟"

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور ہنستے ہوئے سپاہی کی بات کا جواب دیا جو زیادہ غلط بھی نہیں تھا کیوں کہ ہمزاد تو میرے ہی وجود کا حصّہ تھا۔ میں نے جواب میں کہا تھا۔ "میرے بھائی! میں تو خود سے ہی بات کر رہا تھا"۔

"جھوٹ بول رہے ہو تم!" سپاہی کی آواز میں قدرے سختی آگئی۔ "میں نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے کہ تم کسی سے جانے کے لیے کہہ رہے تھے!" یہ کہتے ہوئے اس نے دیدے گھما گھما کر حوالات کا جائزہ لیا کہ کہیں میرے علاوہ بھی کوئی اور تو وہاں چھپا ہوا نہیں۔

"کیوں میری جان، نظر آیا کوئی؟" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ وہ خواہ مخواہ مجھ پر رعب گانٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"بکواس مت کرو زیادہ!" وہ بگڑ کر بولا۔ "ملک صاحب کا حکم نہ ہوتا تو ابھی سیدھا کر دیتا دو منٹ میں!"

"نہیں بھئی، یقین دلاؤ!" میں نے اسے برہم دیکھ کر مزید چڑایا، پھر آگے بڑھ کر لوٹا اٹھانے لگا تاکہ وضو کر سکوں۔ پھر لوٹے میں گھڑے سے پانی بھرتے ہوئے میں نے مزید کہا۔ "ویسے اب خود تمہارے ملک صاحب کے سیدھے ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ تم تو خیر چیز کیا ہو جو اینٹھ رہے ہو، میں تمہارے صاحب بہادر کی دم میں دھاگا باندھ دوں گا"۔

یہ جملے میں نے محض ازرہ تفنّنِ طبع کہہ دیے تھے اس لیے کہ اب میں قطعی طور پر بے خوف تھا۔ سپاہی آپے سے باہر ہو گیا۔ گویا اب اسے میرے خلاف زبان کھولنے کا حق حاصل ہو گیا تھا۔ چاہے وہ خود دل ہی دل میں اپنے افسران کو برا بھلا کہتا ہوں، لیکن بھلا ایک قیدی کی یہ مجال کیسے ہو سکتی تھی! اب تو مجھ پر برسنے کے لیے اس کے پاس نہایت عمدہ اور مضبوط جواز تھا کہ میں نے اس کے افسر کی شان میں گستاخی کی تھی۔

"آ جانے دے ملک صاحب کو! تیری کھال نہ اتروا دی تو میرا نام اللہ داد نہیں!" وہ مجھے برا بھلا کہہ کر اور دھمکیاں دینے کے بعد دوبارہ حوالات کے باہر مٹر گشت کرنے لگا۔ غالباً اب اسے بے چینی سے اپنے افسر کی آمد کا انتظار تھا۔

مجھے معلوم تھا کہ اول تو ایس ایچ او ملک نو ساڑھے نو بجے تھانے نہیں آئے گا اور اگر آ بھی گیا تو سپاہی کی بات کا یقین نہیں کرے گا۔ میں اسی لیے نماز پڑھ کر آرام و سکون کے ساتھ گہری نیند سو گیا۔

میں مشکل سے تین چار گھنٹے ہی [illegible] مجھے جگانے والا وہ سپاہی [illegible] تھا جو رات کی

ڈیوٹی پر تھا۔ اس کے باوجود اس کا رویہ خاصا بدلا ہوا اور لہجہ درشت تھا۔ "اب اٹھے گا بھی نہیں کہ لات جماؤں کمر پہ!" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی دائیں ٹانگ بھی اٹھالی تھی جیسے مجھے دھمکانا چاہتا ہو۔

غصّے کے ساتھ ہی مجھے شدید حیرت ہوئی کہ ایک دم پولیس والوں کا رویہ میرے ساتھ تبدیل کیوں ہو گیا؟ کچی نیند سے اٹھا تھا اسی لیے ابھی ذہن پر غنودگی چھائی ہی تھی۔

"بات کیا ہے؟ [illegible] کیوں ہو رہے ہو تم اتنے؟" میں نے اپنے غصّے اور حیرت پر قابو پاتے ہوئے اٹھ کر کہا۔

"یہ تو تیرا باپ بتائے گا جسے تو نے [illegible] تھیں اللہ داد کے سامنے!" سپاہی نے انتہائی بد تمیزی کا مظاہرہ کیا، پھر مزید بولا۔ "صاحب نے اللہ داد کو بھی رول لیا ہے تاکہ تو مکر نہ جائے"۔

سپاہی کی اس بات نے سارا معمّا حل کر دیا۔ میں نے ایس ایچ او کو گالی نہیں دی تھی۔ معاملے کو بڑھانے اور تمسخر کا بدلہ لینے کی خاطر سپاہی اللہ داد نے یہ جھوٹ بولا تھا۔ گالیوں کے ذکر نے ایس ایچ او کو یقیناً بے مزہ کر دیا ہو گا کیوں کہ وہ بہرحال ان میں سے نہیں تھا جو گالیاں کھا کے بے مزہ نہیں ہوتے اور نہ ہی میرا شمار شیریں دہنوں میں تھا۔ پھر بھلا وہ کیوں نہ بنگ پر چڑھ جاتا۔

جب میں حوّالات سے نکل کر ایس ایچ او کے کمرے میں پہنچا تو میری پہلی نظر سپاہی اللہ داد پر پڑی۔ وہ ایس ایچ او کی میز سے کچھ فاصلے پر دائیں جانب اٹینشن کھڑا تھا۔ اس کے بعد میں نے ایس ایچ او کو دیکھا۔ اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے اور سختی [illegible] ساتھ دانت پر دانت جمانے کے سبب دونوں کلّے پھولے ہوئے سے لگ رہے تھے۔ وہ بھی میری ہی جانب دیکھ رہا تھا، یوں جیسے اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے ہوں جو مجھے پل بھر میں جلا کر خاک کر دیں گے۔

"تم نے مجھے اللہ داد کے سامنے گالیاں دی تھیں؟ بولو!" آخری لفظ کہتے ہوئے اس کی آواز خاصی تیز ہو گئی۔ تھانیداری کے سارے رعب کا اظہار وہ اس ایک لفظ "بولو" کے ذریعے کر دینا چاہتا تھا۔

"یہ غلط کہتا ہے، میں نے گالیاں نہیں دیں"۔ میں نے سکون سے جواب دیا۔

"سر! یہ آپ کے سامنے جھوٹ بول....."

"تم چپ رہو الّو کے....." تھانیدار ملک نے سپاہی کو گالی دی۔ "مجھے اس سے پوچھنے

"- یہ کہہ کر وہ پھر میری طرف پلٹا۔ "اللہ داد نے قسم کھا کر کہا ہے کہ تم نے مجھے گالیاں دی
ں۔ اسے کیا پڑی تھی کہ جھوٹی قسم کھاتا؟"

"میں اب بھی یہی کہوں گا کہ اللہ داد مجھ پر غلط الزام لگا رہا ہے۔ میں نے کچھ اور کہا
۔"

"تا تو کہا کیا تھا تم نے؟" وہ چڑانے والے انداز میں منہ بگاڑ کر بولا۔

"میں نے کہا تھا کہ میں تمہارے صاحب بہادر کی دم میں دھاگا باندھ دوں گا"۔ میں
نے اس طرح کہہ دیا جیسے یہ کوئی بات ہی نہ ہو۔ یہ کہتے ہی میں نے ہمزاد کو طلب کر لیا تھا۔

"کیا؟"

وہ گلا پھاڑ کر چیخ اٹھا۔ یہی میں چاہتا بھی تھا۔ "میری دم میں دھاگا!"

"ہاں ہاں یہی کہا تھا میں نے!" میں پر سکون آواز میں بولا۔ "دھاگا کوئی گالی نہیں
ہے"۔ میرا مقصد اسے مزید تاؤ دلانا تھا۔

"گالی تو میں تجھے ابھی بتاتا ہوں"۔ یہ کہتے ہوئے اس نے میز پر رکھا ہوا اپنا بینت اٹھا
یا اور ایک دم کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر زلزلے کے سے آثار تھے۔

ادھر ایس ایچ او اپنا بینت لہراتا ہوا میری طرف جھپٹا' ادھر میں نے ہمزاد کو اشارہ کر دیا
۔ میرے ہی اشارے کا منتظر تھا۔ دوسرے ہی لمحے ایس ایچ او کے ہاتھ سے بینت نکل کر اللہ
د کی کھوپڑی پر پڑا۔ یہ اشارہ بھی میں نے ہی کیا تھا تاکہ تھوڑی بہت سزا اللہ داد کو بھی مل
ائے جس نے جھوٹی قسم کھائی تھی۔ وہ "ہائے مرگیا" کہتا ہوا زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔ ضرب شاید
زوردار تھی۔

ایس ایچ او کچھ بوکھلا سا گیا۔ غالباً اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر ایک دم ہوا کیا؟
ں ابھی اس سے دور تھا تو پھر اس کے ہاتھ سے کسی نے بینت چھین کر سپاہی اللہ داد کی
کھوپڑی کو نشانہ بنا دیا؟ اسی سبب وہ اپنی جگہ ساکت کھڑا رہ گیا تھا۔

"شرافت سے اپنی جگہ بیٹھ جاؤ ملک جی ورنہ تمہاری کھوپڑی کو بھی طبلہ بنا دیا جائے
گا"۔ میں نے خاموشی کو توڑا۔

میرا یہ فقرہ بھی بھس میں چنگاری لگا دینے کے مترادف تھا۔ ایس ایچ او کو جیسے ہوش
گیا اور پھر وہ بے نقط سنانے لگا۔

"چپ ہو جا خبیث کی اولاد ورنہ تیری زبان کھینچ لوں گا!" میں اس کی
گالیاں برداشت نہ کر سکا۔

"میری زبان تو.... تو کھینچے گا!" وہ شدید غصے کی وجہ سے ہکلانے لگا۔

"پکڑ تو اس حرام زادے کو!" اس نے اللہ داد اور دوسرے سپاہی کو حکم دیا جو مجھے
حوالات سے وہاں تک لے کر آیا تھا' پھر دانت پیستے ہوئے کہنے لگا۔ "ابھی میں اس کی چٹنی بناتا
ہوں!" اس کے بعد وہ قریب ہی زمین پر پڑا ہوا اپنا بینت اٹھانے آگے بڑھا۔

اللہ داد ابھی تک دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑے بیٹھا تھا۔ وہ اپنے افسر کا حکم سن کر
ایک دم کھڑا ہو گیا۔ دوسرا سپاہی میرے برابر ہی موجود تھا' اس نے میری کلائی پر ہاتھ ڈال دیا
اور اسے یہ کوشش بہت مہنگی پڑی۔ وہ اپنا پیٹ پکڑ کر ڈکراتا ہوا دور جا گرا۔ ہمزاد کا گھٹنا اس
کے پیٹ پر پڑا تھا۔ اللہ داد کے بڑھتے ہوئے قدم اچانک رک گئے۔ وہ حیرت سے اپنے ساتھی
کو زمین پر پڑے تڑپتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ایس ایچ او نے بھی جھک کر اپنا بینت اٹھاتے
ہوئے چونک کر تڑپتے ہوئے سپاہی کو دیکھا اور اسی لمحے ہمزاد اس کے پیچھے پہنچ گیا۔ پھر اس سے
پہلے کہ ایس ایچ او سیدھا کھڑا ہو پاتا' چیختا ہوا اوندھے منہ فرش پر گرا۔ گرتے گرتے اس نے
اپنی کہنیاں آگے کر دیں تھیں ورنہ صورت نہ پہچانی جاتی۔

میں تیزی سے آگے بڑھ کر اس کے پاس پہنچ گیا اور اسے مخاطب کیا۔

"اور ٹھکائی کی ضرورت ہے یا کافی ہے اتنی ٹھکائی؟"

میری بات کا جواب دیے بغیر وہ کراہتا ہوا اٹھنے لگا۔ اس کی دونوں کہنیوں پر یقیناً شدید
چوٹیں آئی تھیں کیوں کہ اس کے بھاری جسم کا سارا بوجھ انھی پر پڑا تھا۔

"اپنے ماتحتوں کے سامنے اور ذلیل ہونے سے بہتر ہے' انہیں یہاں سے چلتا کر دو
تاکہ میں اکیلے میں تم سے اپنا حساب چکا سکوں"۔ میں پھر بولا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا تو میں
نے ہمزاد کو مخاطب کیا۔ "ان دونوں کو اٹھا کر باہر پھینک دو!"

میرے حکم کی دیر تھی کہ ہمزاد نے ان دونوں سپاہیوں کو بہ یک وقت گردنوں سے پکڑ
کر اٹھا لیا اور پھر وہ گویا فضا میں تیرتے ہوئے باہر جا کے گرے۔ یہ منظر بھی ایس ایچ او کی عقل
گم کر دینے کے لیے کافی تھا۔ اس کے چہرے پر خوف کے آثار نمایاں طور پر نظر آنے لگے
تھے۔

"دروازہ بند کر کے اندر سے چٹخنی چڑھا دو!" میں نے ہمزاد کو دوسرا حکم دیا۔

تعمیل حکم میں دیر نہ ہوئی۔ ایس ایچ او نے یقیناً یہی دیکھا ہو گا کہ دروازہ خود بہ خود بند
ہوا اور پھر خود ہی چٹخنی چڑھ گئی۔ اب وہ میرے ہی قریب کھڑا ہوا حیرت سے سب کچھ دیکھ رہا تھا
اور غالباً حیرت کی زیادتی نے تکلیف کے احساس کو ختم کر دیا تھا۔

"جاکر اپنی کرسی پر بیٹھ جاؤ ابھی تمہیں ایک کے دو نظر آنے لگیں گے"۔ یہ جملہ میں
نے دانستہ کہا تھا اور اسی کے ساتھ ہمزاد کو ظاہر ہو جانے کا اشارہ کیا تھا۔ ہمزاد میرے قریب ہی
ند قدم دور ایس ایچ او کے بالکل سامنے کھڑا تھا۔ میں نے ایس ایچ او کا شانہ تھپتھپایا اور بولا۔
نی نہیں تم نے میری بات!"

اس نے میری طرف دیکھا" پھر اپنے سامنے کھڑے ہوئے ہمزاد پر نگاہ ڈالی اور پھر
شت سے چیخ اٹھا۔ "نن.... نہیں!"

"میں کہہ رہا تھا نا تم سے کہ تمہیں ایک کے دو نظر آنے لگیں! اب بھی بیٹھ جاؤ اپنی
کرسی پر!"

وہ اتنا بے حواس ہو چکا تھا کہ پلٹ کر لرزتے کانپتے قدموں سے اپنی کرسی کی طرف
یھا اور اسی وقت میں نے ہمزاد کو اس کی نظروں سے اوجھل ہو جانے کا اشارہ کر دیا۔ وہ میز کا
سہارا لیتا ہوا آخر کار اپنی کرسی پر بیٹھ ہی گیا۔

میں اس کی میز کے سامنے کھڑا تھا۔ "اب دیکھو' میں تمہیں ایک ہی نظر آ رہا ہوں گا!"

"وہ..... وہ دوسرا..... تمہا..... تمہارا ہم شکل.... کال..... کہاں گیا؟" وہ خوف کے
سبب ٹھیک طرح بات نہیں کر پا رہا تھا۔

"یہاں تو میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ دراصل تمہارا دماغ چل گیا ہے"۔ یہ کہہ کر میں
میز کے سامنے پڑی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔

ایس ایچ او کی حالت اس وقت کسی ایسے خوف زدہ شخص کی سی تھی جسے اپنی جان کا
خطرہ ہو اور موت اس کے سامنے کھڑی ہو۔ کبھی اس کے رخسار پھڑک رہے تھے' کبھی
مونچھیں اور کبھی گول گول دیدے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔

اچانک دروازے پر زور کی دستک ہوئی۔ اسی کے ساتھ ہی مجھے اے ایس آئی کی جانی
پہچانی آواز سنائی دی۔ "دروازہ کھولیے سر!"

میں نے کچھ سوچتے ہوئے اس سے کہا۔ "جاؤ دروازہ کھول دو جا کر اور صرف اس
اے ایس آئی کو اندر بلا لو! چلو اٹھو!" میں نے ڈانٹ پلائی' پھر بولا۔
"دروازہ کھول کر اگر بھاگنے کی کوشش کی تو پھر زبردستی اسی کمرے میں لے آئے جاؤ گے! سمجھ
گئے!" میں اس کے چہرے پر پائے جانے والے تاثرات سے سمجھ گیا تھا کہ اس کا کیا ارادہ ہو سکتا
ہے! اسی لیے دھمکی دی تھی۔

وہ ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا اور پھر باری باری اپنی کہنیاں سہلاتا ہوا کراہنے لگا۔ اسی دوران

میں دوبارہ دستک ہوئی۔ میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا' جن دو سپاہیوں کو ہمزاد نے کمرے
سے اٹھا کر باہر پھینکا تھا انہوں نے اندر کا آنکھوں دیکھا حال باہر "نشر" کیا ہو گا۔ اسی سبب
دروازے پر دستکیں سنائی دے رہی تھیں۔

"چلو جلدی کرو!" میں پھر سختی سے بولا۔

ایس ایچ او مجھے خوف زدہ نظروں سے دیکھتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے
اپنی کرسی کو ذرا سا آڑا کر لیا تاکہ دروازہ میری نظر میں رہے۔ ایس ایچ او نے دروازے کے
قریب پہنچ کر چٹخنی گرا دی۔ دروازہ اندر کی طرف کھلتا تھا۔ دوسری جانب کھڑے ہوئے لوگوں
سے یہ حماقت سرزد ہوئی کہ انہوں نے چٹخنی گرنے کی آواز سنتے ہی ایک دم دونوں پٹ کھول
دیے۔ ان کا افسر ابھی دروازے کے سامنے سے ہٹ نہیں سکا تھا کہ یہ واقعہ پیش آ گیا۔ نتیجہ یہ
ہوا کہ دروازے کے پٹ اس کی پیشانی پر لگے اور وہ اپنے جسم کا توازن نہ سنبھال سکا اور زمین
پر آ رہا۔

دروازہ کھلتے ہی بہت سے پولیس والے بھرّا مار کر اندر آ گئے۔ آگے آگے اے ایس
آئی تھا۔ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر اپنے افسر کو اٹھنے میں مدد دی جس کے منہ سے گالیوں
کا طوفان ابل رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر بڑا سا گومڑا پڑ گیا تھا۔ غصے کی وجہ سے اس کا خوف غائب
ہو گیا تھا۔

"تم سب کو کس نے بلایا تھا نمک حرامو!" ایس ایچ او زمین سے اٹھتے ہوئے چیخنے لگا۔

"سر!..... سر! وہ اللہ داد اور....."

ایس ایچ او نے اے ایس آئی کی بات کاٹ کر سپاہی اللہ داد اور دوسرے سپاہی کو
گالیاں دیں' پھر چیخا۔ "نکل جاؤ تم سب میرے کمرے سے!"

"مگر سر!....."

"سر کا بچہ!" اس مرتبہ بھی اس نے اے ایس آئی کی بات پوری نہ ہونے دی۔

سپاہیوں کی کیا مجال تھی کہ اس کے بعد وہاں رک سکتے۔ وہ سب ایک ایک کر کے
وہاں سے کھسکنے لگے۔ اے ایس آئی بھی پلٹ کر جانے لگا تو میں چپ نہ رہ سکا۔ "ملک صاحب
کو تم سے بات کرنا ہے' تم نہیں جاؤ گے!"

اے ایس آئی نے سوالیہ نظروں سے اپنے افسر کی طرف دیکھا جو اپنی پیشانی کو آہستہ
آہستہ سہلاتے ہوئے "ہائے ہو" کر رہا تھا۔ میری آواز سن کر وہ چونکا' پھر اس کا چہرہ دوبارہ
تاریک ہونے لگا۔ اس نے مردہ سی آواز میں بات کی تصدیق کر دی۔

"سپاہیوں سے کہہ دو کہ ملک صاحب تفتیش کر رہے ہیں' کوئی ادھر نہ آئے!" میں
نے اے ایس آئی سے حکمیہ لہجے میں کہا۔ "اور پھر دوبارہ دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا دو!"
اس نے میرے لہجے پر برا سا منہ بنایا اور ایک بار پھر تصدیق طلب انداز میں اپنے افسر
کی طرف دیکھا۔

پھر اس سے پہلے کہ ایس ایچ او میرے الفاظ اپنی زبان سے دہراتا' میں بول اٹھا۔ "ابے گھامڑ! میں تجھے جو حکم دے رہا ہوں' وہ تیری عقل میں نہیں بیٹھ رہا اور اپنے ابّا حضور کی
طرف احمقوں کی طرح دیکھے جا رہا ہے!"

اس کا چہرہ غصّے سے سرخ ہو گیا۔ "سس..... سر! آ.... آپ دیکھ رہے ہیں کہ..... کہ
یہ شخص....." غصّے کی وجہ سے اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ اپنے افسر کی موجودگی میں اس کی
یہ ہمت تو نہ ہوئی کہ مجھ سے بہ راہ راست کچھ کہتا' ہاں شکایت کرنے لگا۔

"ابے رشوت خور! تیرا سر کیا بولے گا اور کیا دیکھے گا! جو کہہ رہا ہوں' وہ کر ورنہ بعد
میں پچھتائے گا۔ دیکھ نہیں رہا تیرے سر کے سر پر ایک اور سر نمودار ہو گیا ہے!" میرا لہجہ
انتہائی توہین آمیز تھا اور وہ شخص' وہ راشی اسی قابل تھا۔

"جو یہ کہہ رہے ہیں کرو!..... جلدی!" آخر ایس ایچ او کو بولنا ہی پڑا۔ پھر وہ میری
طرف ملتجی نظروں سے دیکھ کر بولا۔ "تم.... تم آخر چاہتے کیا ہو؟"

"جلدی کیا ہے' ابھی بتا دوں گا' اپنی کرسی پر تو آ کر بیٹھ میرے چاند!" میں نے
مسکراتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔

اے ایس آئی غالباً سمجھ گیا تھا کہ معاملہ گمبھیر ہے کیوں کہ اس کے سامنے ایس ایچ او
کی "کھنچائی" بھی ہو رہی تھی۔ اس نے اسی لیے فوراً "تعمیل حکم کی اور پھر دروازے کو بند
کر کے چٹخنی چڑھا دی۔ اس کے بعد وہ میز کی ایک جانب مستعد ہو کر آ کھڑا ہوا۔ اس دوران میں
ایس ایچ او اپنی کرسی پر آ کر بیٹھ چکا تھا۔ میں نے اے ایس آئی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے
اس کے افسر کو مخاطب کیا۔ "اس نے بھی مجھ سے رشوت لی تھی۔ تمہیں حصّہ دیا تھا؟"

"کب؟..... کب کی بات ہے یہ؟" ایس ایچ او نے مردہ سی آواز میں پوچھا۔

"سر! دراصل اُس..... بہت..... بہت دن کی بات ہے۔ آپ..... آپ اس روز دیر
سے آئے تھے میں اسی لیے بھول....." اے ایس آئی اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔

"تم چپ رہو اُلّو کی دُم!" میں نے اسے ڈانٹ پلائی اور اسی کے ساتھ ہمزاد کو اشارہ
کیا۔

تڑاخ سے اے ایس آئی کے منہ پر چانٹا پڑا اور اس کی گردن گھوم گئی۔ وہ اپنا رخسار
سہلاتے ہوئے حیرت سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"اب درمیان میں بولے تم تو دوسرے رخسار پر بھی انگلیوں کے نشان بن جائیں
گے!" میں نے اے ایس آئی کو گھور کر کہا' اور وہ بدحواس نظر آنے لگا۔ پھر میں ایس ایچ او کی
طرف متوجہ ہوا۔ "تم شاید یہ سمجھ رہے ہو گے کہ میں بے وقوف ہوں' مجھے کچھ خبر نہیں اور
تم اسی طرح حرام کا مال ہضم کر جاؤ گے! تم اتنے گرے ہوئے اور گھٹیا آدمی ہو کہ اس غریب
نرس نادرہ کو بھی نہیں بخشا۔ تم نے مجھ سے رم اینٹھی تو اینٹھی' اس غریب پر بھی تمہیں رحم
نہیں آیا۔ کان کھول کر سن لو" - یہ کہہ کر میں نے اے ایس آئی کی طرف دیکھا۔ "اور تم بھی
اے چھوٹے حرام خور! اب تک میرے سلسلے میں جتنا روپیہ اینٹھا ہے' ایک گھنٹے کے اندر
اندر مجھے واپس مل جانا چاہیے! اس کے علاوہ نرس نادرہ کی رقم بھی اسے بھجوانا ہے۔ ایک گھنٹہ
گزر جانے کے بعد میں کوئی رعایت نہیں کروں گا' تم لوگوں کے ساتھ! باقی باتیں بعد میں ہوں
گی..... اور ہاں وہ تمہارے ابّا جی کی حویلی نہیں تھی جو اب کھنڈر بن چکی ہے' اس کے تمام
کاغذات بھی مجھے واپس چاہئیں! اگر اس کے خلاف ہوا یا تم نے کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی
تو حشر خراب کر دوں گا! سپاہی کو بلاؤ یہ ایک گھنٹہ میں تمہاری قید ہی میں گزاروں گا۔ مجھے
حوالات میں بند کرا دو" - آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے میرے لہجے میں چبھن تھی۔ خصوصاً"
لفظ قید پر میں نے زور دیا تھا۔

خلاف توقع میرے آخری الفاظ کا اثر ایس ایچ او پر الٹا ہوا۔ اس کی بجھی بجھی سی
آنکھوں میں روشنی آ گئی۔ غالباً وہ احمق یہ سمجھ رہا تھا کہ حوالات میں بند کرنے کے لیے کہہ کر
گویا میں نے خود اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری ہے۔ اس کا ثبوت اس کا چاپلوسانہ انداز بھی تھا اور
لہجے کی عیّاری بھی! اس نے بہ ظاہر بڑے خلیقانہ انداز میں نیم تبسم کے ساتھ کہا۔ "جناب!
پیسوں کی واپسی کا معاملہ تھا تو پہلے ہی بول دیتے آپ! ہم تو خادم ہیں آپ کے ہمارے لیے آپ
سے زیادہ روپیہ تو نہیں ہے نا! میں ابھی اپنے بینک سے روپیہ نکلواتا ہوں" - پھر وہ اے ایس
آئی سے مخاطب ہوا۔ "تم سے تو میں سمجھوں گا اچھی طرح! ساری رقم اکیلے ہضم کر گئے! یہ
بھی نہیں سوچتے تم لوگ کہ شریف شہریوں سے کیا سلوک کرنا چاہیے! اب اگلو دو سارا مال جو
ہضم کیا ہے' ہاں!" یہ کہہ کر وہ خود اپنی سیٹ سے اٹھا اور اے ایس آئی کو ساتھ آنے کا اشارہ
کرتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہی وہ اے ایس آئی سے کُھسر پُھسر کرنے لگا' پھر ایک سپاہی کو

زور سے آواز دی۔
میں اس کی بے وقوفی پر دل ہی دل میں ہنس رہا تھا۔
"میرے لیے کیا حکم ہے؟" ہمزاد نے سرگوشی کی۔
"ابھی رہو ساتھ"۔ میں نے جواب دیا۔
"بہت بہتر ہے"۔ اس نے ادب سے کہا۔
وہ میرے اشاروں کو اچھی طرح سمجھتا تھا اور انہی پر عمل کرتا تھا۔ میرا ہمزاد، میرا مزاج شناس تھا۔ اس کے لیے معمولی سا اشارہ کافی ہوتا تھا کہ میں کب کیا چاہتا ہوں!
ایس ایچ او لوٹ کر آیا تو اے ایس آئی کی بجائے اس کے پیچھے پیچھے ایک سپاہی تھا۔ کمرے میں گھستے ہی اس نے سپاہی سے کہا۔ "یہ سمجھ لو اچھی طرح کہ یہ بہ طور مہمان حوالات میں ہیں انہیں ذرا بھی پریشانی ہوئی یا ان کے آرام میں کوئی کسر رہ گئی تو تم جانتے ہو مجھے!"
"یس سر! حکم کی تعمیل ہو گی جناب عالی!" سپاہی مستعدی سے کھڑا ہو گیا اور ایس ایچ او اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔
"انہیں عزت کے ساتھ حوالات تک لے جاؤ"۔ ایس ایچ او نے حکم دیا۔
"میں اٹھ کر کھڑا ہوا، پھر چلتے چلتے کہا۔ "تمہیں یاد ہے نا جو کہا ہے میں نے؟"
"بالکل جناب!" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ایک گھنٹے کے اندر اندر سب کام ہو جائے گا۔ آپ بالکل بے فکر رہیں"۔
ایس ایچ او کے کمرے سے نکل کر میں نے فضا میں ایک تناؤ سا محسوس کیا۔ جس چہرے پر بھی نظر پڑی، اس پر کھنچاؤ سا تھا، مگر اے ایس آئی مجھے نظر نہ آیا۔ برآمدے سے گزر کر میں، سپاہی کے ساتھ تھانے کے صحن میں آیا، پھر حوالات کی طرف بڑھنے لگا۔
"ذرا ہوشیار رہنا، کچھ گڑبڑ معلوم ہوتی ہے"۔ میں نے ہمزاد سے سرگوشی کی۔
"جی ہاں میرا بھی یہی خیال ہے"۔ میرے ساتھ ساتھ چلنے والے سپاہی نے چونک کر میری طرف دیکھا۔
"کچھ مجھ سے فرمایا جناب!" میرے ساتھ ساتھ چلنے والے سپاہی نے چونک کر میری طرف دیکھا۔
"نہیں"۔ میں نے صرف اتنا ہی کہنے پر اکتفا کیا۔
اب حوالات کا دروازہ سامنے ہی نظر آ رہا تھا۔ سپاہی کے ساتھ دو تین سیڑھیاں چڑھ کر میں برآمدے میں پہنچا اور پھر سپاہی نے آگے بڑھ کر حوالات کا آہنی دروازہ کھول دیا۔

ابھی میں نے حوالات میں قدم رکھا تھا کہ اچانک نہ جانے کدھر سے سات آٹھ پولیس والے لاٹھیاں سنبھالے تیزی سے حوالات میں گھس آئے اور پھر ان کی لاٹھیاں بلند ہوئیں۔ میں ان کے نرغے میں تھا، مگر لاٹھیاں میرے جسم کی بجائے زمین پر پڑیں اور میں ان سے دور کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ہمزاد نے اگر ایک لمحے بھی تاخیر کی ہوتی تو میں اس وقت لہولہان زمین پر پڑا ہوتا۔ وہ میرے جسم کو اٹھا کر ان کے نرغے سے نکال لایا تھا۔
لمحہ بھر میں ایک ناقابل یقین واقعے نے سپاہیوں کو چکرا کر رکھ دیا تھا۔ وہ پھر میری طرف پلٹے۔
ہمزاد نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
"یہ کٹھ پتلیاں ہیں، اور اپنے افسر کے حکم کی تعمیل کر رہے ہیں اس لیے ان کے لیے معمولی سزا کافی ہے"۔ میں نے ہمزاد سے سرگوشی کی۔
اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور میرے سامنے آ گیا۔ دوسرے ہی لمحے حوالات میں ایک دلچسپ تماشا شروع ہو چکا تھا اور میں یہ تماشا حوالات کے دروازے کے قریب کھڑا ہوا دیکھ رہا تھا۔ وہ سب اب ایک دوسرے سے الجھ پڑے تھے۔
ذرا ہی دیر میں دو ایک کے سر پھٹ گئے۔ وہ بڑے جوش و خروش کے ساتھ ایک دوسرے پر لاٹھیاں برسا رہے تھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ان پر دیوانگی طاری ہو گئی ہے۔ پھر میں نے ایک کو زخمی ہو کر زمین پر گرتے دیکھا۔
"بس کرو!" میں نے ہمزاد کو حکم دیا۔
معاً یوں لگا جیسے ان سب کو ہوش آ گیا ہو۔ ان کے ہاتھ رک گئے اور پھر اگلے لمحے وہ اس طرح حوالات سے نکل کر بھاگے جیسے موت ان کا پیچھا کر رہی ہو۔ زمین پر پڑا ہوا زخمی بھی اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے سارے چہرے پر خون پھیلا ہوا تھا جس کے سبب وہ بہت بھیانک معلوم ہو رہا تھا۔ وہ بھی گرتا پڑتا حوالات سے نکل گیا۔
حوالات کے باہر اب بھی وہ سپاہی موجود تھا جو مجھے ایس ایچ او کے کمرے سے یہاں تک لایا تھا۔ اس کے چہرے پر دہشت کے آثار تھے۔
"دروازہ باہر سے بند کر کے تالا ڈال دو!" میں نے اسے حکم دیا۔
"جج..... جی بہ..... بہتر جناب عالی!" اس نے فوراً ہی میرے حکم کی تعمیل کی اور پھر دروازے سے الگ ہٹ گیا۔ اس کا سبب یقیناً خوف ہی تھا۔ اس نے تو سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا، پھر بھلا اس پر اثر کیوں نہ ہوتا!

میں اطمینان کے ساتھ فرش پر بچھے ہوئے کمبل پہ بیٹھ گیا۔ ہمزاد میرے سامنے مودب کھڑا تھا۔

"ذرا معلوم کرو کہ ایس ایچ او پر کیا ردِ عمل ہوا ہے!..... اور ہاں یہ خیال رکھنا کہ وہ راہ فرار اختیار نہ کرپائے اور وہ اے ایس آئی بھی نہ بھاگنے پائے"۔ میں نے ہمزاد سے کہا۔

"ابھی جو واقعہ پیش آیا اس میں یقیناً ایس ایچ او کا ہاتھ ہے۔ وہ مجھ پر پولیس کے مخصوص حربے آزما رہا ہے۔ بعد میں کہہ دیتا کہ میری زبان کھلوانے کے لیے اس نے مجھ پر تشدّد کیا تھا اور میں اسی دوران میں اللہ کو پیارا ہو گیا یا شدید زخمی ہو گیا۔ بہرحال اس نے یہ حرکت کر کے اپنے ہی لیے گڑھا کھودا ہے، تم جاؤ"۔

ہمزاد غائب ہو گیا اسے قابو میں کرنے کے بعد روپیہ پیسہ یا بڑی سے بڑی دولت میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی تھیں میں نے ایس ایچ او، اور اے ایس آئی سے رقم کی واپسی کا مطالبہ اس لیے کیا تھا کہ وہ رقم بہرحال ان دونوں کے لیے ناجائز اور حرام تھی میں وہ رقم کسی بھی ضرورت مند کو بخش سکتا تھا، مگر ان حرام خوروں کے پاس نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اس کا بھی امکان تھا کہ انہوں نے رقم کا بڑا حصّہ یا کچھ رقم خرچ کر دی ہو، مگر مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ مجھے پوری رقم مطلوب تھی چاہے وہ کسی بھی طرح اس کا بندوبست کرے۔ میں نے انہیں ایک گھنٹے کی مہلت دی تھی اور میرے نزدیک یہ کافی تھی۔ اب یہ ان پر منحصر تھا کہ وہ اس ایک گھنٹے کی مہلت کو میرے خلاف سازشیں کرنے میں گزارتے یا رقم کا بندوبست کرتے۔

معاً مجھے یہ خیال آیا کہ ہمزاد کہاں ہو گا؟ اور اسی خیال کے ساتھ مجھے اپنے تصور کی قوّت یاد آئی۔ میرے ذہن میں ایک سوال ابھرا۔ کیا یہ قوت بھی بے حال ہو چکی ہے؟ تصوّر کی قوّت بھی معمولی نہیں تھی۔ اس سے میں نے بہت سے کام لیے تھے۔ میں آنکھیں بند کر کے جس شخص یا جس جگہ کا بھی تصوّر کرتا، وہ مجھے نظر آنے لگتی۔ نہ صرف یہ بلکہ وہاں ہونے والی گفتگو بھی مجھے صاف سنائی دیتی اور سارا منظر بھی واضح نظر آتا، یوں جیسے میں خود وہاں موجود ہوں۔ اس میں مختصر یا طویل فاصلے کی کوئی قید نہیں تھی۔ اپنی اسی قوّت کو آزمانے کی خاطر میں نے آنکھیں بند کر کے ایس ایچ او کا تصوّر کیا کیوں کہ میرے ہمزاد کو اسی کے پاس ہونا چاہیے تھا۔ اس کے لیے مکمل ذہنی یک سوئی کی ضرورت تھی کہ جو کچھ سوچا جا رہا ہے، اس کے سوا کوئی اور خیال ذہن میں نہ آئے۔ مجھے اس کی مشق تھی۔ ذرا ہی دیر بعد میرے صفحۂ ذہن پر ایس ایچ او ملک کی صورت کے نقوش واضح ہونے لگے۔ پھر جب چند لمحے بعد اس کی شکل مجھے

واضح طور پر نظر آنے لگی تو میں نے اپنے تصوّر کے دائرے کو مزید پھیلا دیا۔

اب میں واضح طور پر سب کچھ دیکھ اور سن رہا تھا۔ مجھے اپنا ہمزاد بھی وہیں نظر آگیا تھا۔ اس حالت میں اپنے ہمزاد سے بھی گفتگو کر سکتا تھا جسے کوئی اور نہیں سن سکتا تھا۔ وہ کمرا میرے لیے نیا نہیں تھا جہاں اس وقت ایس ایچ او ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ یہ ایس پی کا کمرا تھا جو اس وقت اپنی کرسی پر موجود تھا۔ میرا ہمزاد ایس پی کے قریب ہی کھڑا تھا۔

"نہیں تم جھوٹ بولتا اے"۔ ایس پی کہہ رہا تھا۔

"سر آپ یقین کریں، میری بہن کی طبیعت بہت خراب ہے۔ مجھے آج ہی کی کسی فلائیٹ سے ڈھاکہ پہنچنا ہے"۔ ایس پی کو یقین دلانے کی خاطر ایس ایچ او پر زور لہجے میں بولا۔

"تم کو اِل آم ہوا کہ تمہارا ابین کا طوبیعت کھوراب اے؟"

"آج صبح ٹیلی گرام ملا ہے سر!"

"فیر ٹیلی گرام ہتاؤ کدر اے!"

میں نے محسوس کر لیا تھا کہ میرا ہمزاد ایس پی پر مسلط ہے اور وہی ایس پی کے دماغ میں یہ باتیں ڈال رہا ہے اسی کے ساتھ مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ ایس ایچ او، چاٹگام سے فرار ہونے کا منصوبہ بنا چکا ہے وہ اسی لیے ایس پی کے پاس نظر آرہا تھا کہ چھٹی لے کر غائب ہو جائے اور میں تلملاتا رہ جاؤں۔

ایس پی نے ٹیلی گرام دکھانے کے لیے کہا تو ایس ایچ او لحہ بھر کو سٹپٹا گیا، مگر پھر سنبھل کر فوراً" ہی بولا۔ "سر! ٹیلی گرام گھر کے پتّے پر آیا تھا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ میری بات کا یقین نہیں کریں گے تو میں ٹیلی گرام ساتھ لے کر آتا گھر سے!"

"ٹیلی گرام تو تم کو ہتانا پوڑے گا! کسی کانسٹیبل کو ادھر بھیج کر مونگالو"۔ ایس پی نے اسے گھور کر کہا۔ "گوڑ بوڑ گھٹالا نئیں چلے گا سمجھا!"

"ٹھیک ہے سر! ایس ایچ او مردہ سی آواز میں بولا۔ "اگر آپ کو میری بات کا یقین نہیں تو مجھے ایسی چھٹی نہیں چاہیے!" وہ اپنا جھوٹ چھپانے کے لیے اداسی کی اداکاری کرنے لگا اور پھر ایک دم کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"بیٹو ابی! ایس پی کے لہجے میں سختی تھی۔

ایس ایچ او نے اپنے افسر کے تیور دیکھ کر فوراً گرگٹ کی طرح رنگ بدل لیا اور عاجزی کے ساتھ "یس سر" کہتا ہوا دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ابی بوم کا داما کا ہوا، تم نے کیا کیا؟ تم موزریم کو گرپتار کیا؟ آئی جی صیب ام کو پھون

پر بولا، "آمارا سیت سب کو ٹرمنیٹ کردے گا! ابی بولو تم کیا بولتا اے!"

"تفتیش جاری ہے سر! یہ کوئی بہت بڑا تخریب کار گروہ معلوم ہوتا ہے۔ وہ اتنی جلدی ہاتھ نہیں آئیں گے سر! پھر ہمارے پاس نفری بھی کم ہے"۔

"تم اِدر اُدر کا بات کر کے گول مال نئیں کر سکتا۔ نپری مپری ام کچھ نئیں سنے گا سمجھا! موزریم مانگتا بس!"

"میں نے ناکا بندی کر دی ہے سر! وہ بچ کر نہیں نکل سکتے سر! ایک مخبر نے اطلاع دی ہے کہ ان کا اڈا چاٹگام ہلز میں ہے وہ جلد ہی پکڑے جائیں گے۔ الجھی ہوئی ڈور کا سرا مل گیا ہے سر! بس اب چھاپا مارنے کی دیر ہے۔ بس مجھے اطلاع کا انتظار ہے کہ وہ اپنے اڈے پر موجود ہیں"۔

"اُر جس کا کوئی تھا..... سیکھ کو رامت، اس کا تم نے کیا کیا؟ ایس پی نے سوال کیا۔

"سر! وہ بہت پکا ہے۔ اس نے اب تک زبان نہیں کھولی"۔

ایس پی نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ "ام کو لگتا ہے تم نے اس کو بے کسور بند کیا اے"۔

"نئیں سر، ایسا نہیں ہے اس کے خلاف ہمارے پاس کئی ثبوت موجود ہیں محلے والوں نے اس کے بارے میں جو درخواست بھیجی تھی اس کی تفتیش کے نتیجے میں وہاں سے لڑکیاں برآمد ہوئی ہیں ان پر تشدد کیا گیا تھا۔ انہیں حبس بیجا میں رکھا گیا تھا سر! اور..... اور سر ان کی عزت بھی....."

"تم نے بیان لیا ان کا؟"

"لیس سر! ان سب کے بیان موجود ہیں"۔

"کیس کی فائل مونگواؤ"

"میں خود ابھی لے کر آتا ہوں سر! اسے مَیں نے اپنی کسٹڈی میں رکھا ہے اور خود ذاتی طور پر اس کی تفتیش کر رہا ہوں"۔ ایس ایچ او اپنے نمبر بڑھانے کے لیے جلدی جلدی کہنے لگا۔ پھر وہ واپس کا اشارہ پا کر میرے کیس کی فائل لینے چل دیا۔

میں نے اسی وقت ہمزاد کو وہاں سے غائب ہوتے دیکھا میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے! میرے اطمینان کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ میں نے اپنے تصور کا سلسلہ منقطع کیا اور آنکھیں کھول دیں۔ میرا ہمزاد ایس ایچ او کو مناسب سزا دے رہا تھا۔ مجھے ایس ایچ او پر بالکل ترس نہیں آیا کیوں کہ وہ مجھ پر ابھی کچھ دیر پہلے قاتلانہ حملہ کرا چکا تھا۔ بالفرض میں زندہ بھی رہ جاتا

تو اپنے ہاتھ پیروں سے ضرور محتاج ہو جاتا۔ دوسری جانب اس طرح کوئی ثبوت نہ ہونے کی صورت میں پولیس کے پاس کوئی جواز نہ رہتا کہ مجھے زیرِ حراست رکھا جا سکتا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ہمزاد میرے پاس واپس آگیا۔ اس نے مجھے آتے ہی بتایا کہ "میں نے وہ تمام ثبوت تلف کر دیے ہیں جو آپ کے خلاف پولیس کے پاس موجود تھے"۔

"میں بھی یہی سمجھ رہا تھا کہ تم ایسا کرو گے"۔ میں بولا، پھر کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "مگر شاید ایک جگہ تک تمہاری رسائی نہیں ہوئی....."

"آپ غالباً اس درخواست کے بارے میں کہہ رہے ہیں جس کی ایک نقل آئی جی کو بھی آپ کے محلّے والوں نے بھیجی تھی!" ہمزاد میری بات کی تہ تک پہنچتے ہوئے فوراً ہی بولا۔

"تم بالکل ٹھیک پہنچے"۔ میں نے اسے ستائشی نظروں سے دیکھا۔

وہ مسکرایا، پھر کہنے لگا۔ "جب آئی جی کے دفتر میں اس درخواست کی نقل کو تلاش کیا جائے گا تو وہ بھی نہیں ملے گی۔ میں ہر کام پورا کرتا ہوں کہ کوئی گنجائش نہ رہے۔ آئی جی، ایس پی اور ایس ایچ او کسی کے پاس بھی آپ کے خلاف کوئی تحریری ثبوت نہیں"۔

"زندہ باد!" میں نے خوش ہو کر کہا۔ "اسی لیے تو میں تم پر فخر کرتا ہوں، پھر معاً" مجھے اپنی ان ملازماؤں کا خیال آگیا جنھوں نے مہ پارہ کے سحر میں آکر میرے خلاف پولیس کے سامنے بیانات دیے تھے، مگر اب مہ پارہ کا سحر ٹوٹ چکا تھا۔ اگر پولیس دوبارہ ان سے رابطہ قائم کرتی کہ میرے خلاف بیان حاصل کرے تو وہ میری بجائے شمبھو کا نام لیتیں جبکہ حقیقت بھی یہی تھی۔ ان پر میں نے نہیں شمبھو نے تشدد کیا تھا گویا اصل مجرم میں نہیں شمبھو تھا۔ پولیس اسے تلاش کرتی۔ اس نکتے پر سوچتے ہوئے مجھے مظلوم سرتیا یاد آگئی جو شمبھو کے قبضے میں تھی۔ شمبھو اور سرتیا، دونوں ہی غائب ہو گئے تھے۔ مجھے انہیں بھی تلاش کرنا تھا، لیکن میں ابھی سب سے پہلے پولیس کے چکّر سے نکلنا چاہتا تھا۔ اس کے بعد ہی کچھ اور سوچا جا سکتا تھا میں اپنے سابق شریک کار نصیر الدّین کو بھی بھولا نہیں تھا جس بے ایمان نے میری شرافت اور مجبوری سے فائدہ اٹھا کر سارے کاروبار پر قبضہ کر لیا تھا یہی نہیں بلکہ اس نے مجھے اپنا مقروض ظاہر کر کے مجھ پر دعویٰ بھی دائرہ کر دیا تھا۔ پولیس سے نمٹنے کے بعد میں اس جعل ساز کو سبق دینا چاہتا تھا۔ رہا دوسرا کیس جس کا تعلق چاٹگام کی بلدیہ سے تھا تو مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی میرے وکیل نے عدالت میں کوٹھی کے ری اسسمنٹ کی جو درخواست دی تھی۔ اس کا مقصد محض وقت گزاری تھا تاکہ میں اپنے عمل کی مدّت پوری کر لوں۔ اگر بلدیہ مجھے حرجانہ ادا کر کے وہاں سے سڑک نکالنا چاہتی تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ یوں بھی اب میری

کوٹھی کھنڈر بن چکی تھی۔ ہاں مجھے وہاں سے اپنی اہم اور نایاب کتابیں ضروری نکالنا تھیں۔ اس کے سوا نہ مجھے جگہ کی قیمت سے دلچسپی تھی نہ کسی اور بات سے۔ تسخیر ہمزاد کے بعد اب میرے لیے کوئی مسئلہ 'مسئلہ' نہیں رہ گیا تھا۔

"آپ خاموش کیوں ہو گئے؟ کیا کوئی خاص بات ہے جس پر غور کر رہے ہیں؟" ہمزاد نے پوچھا۔

"ہاں"۔ یہ کہہ کر میں نے اسے مختصر حالات سے آگاہ کر دیا کہ چالیس دن کے دوران میں مجھ پر کیا کیا ستم ٹوٹے ہیں!"

اس نے میرے ہمت و حوصلے کی داد دی اور پھر وہی مشورہ دیا جس کے بارے میں پہلے ہی میں فیصلہ کر چکا تھا' یعنی دشمنوں سے ایک ایک کر کے نمٹا جائے فی الحال پولیس کا معاملہ اس کے نزدیک بھی اولیت کا حامل تھا آخر میں اس نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ آج یہ معاملہ نمٹ جائے گا۔ میں ایس پی کے ذہن میں مزید شکوک و شبہات پیدا کر دوں گا اور پھر حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی۔ آپ کے کیس کی فائل غائب ہو جانے کے بعد یوں بھی ایس ایچ او کی نوکری خطرے میں پڑ گئی ہے۔ اس وقت ایس پی اس پر برس رہا ہو گا"۔

ہمزاد غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ ایس ایچ او کا بچنا اب محال ہی تھا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی کہ پولیس کی تحویل سے کسی کیس کے تمام ثبوت اور شواہد غائب ہو جاتے' اس کا ذمے دار بہرحال ایس ایچ او تھا۔

"اجازت ہو تو میں جاؤں تاکہ اس راشی ایس ایچ او کا معاملہ نمٹ ہی جائے"۔ ہمزاد مجھے خاموش دیکھ کر بولا۔

"ہاں جاؤ"۔ میں نے اسے اجازت دے دی' پھر فوراً ہی کہا"۔ ٹھہرو اس اے ایس آئی کا کیا ہوا؟ وہ کہاں ہے؟"

"وہ اپنے گھر گیا ہے"۔ ہمزاد نے بتایا۔ رشوت کی ساری رقم اور اپنی پوری تنخواہ وہ اپنی بیوی کے ہاتھ میں لے جا کر دے دیتا ہے وہ انہی لوگوں میں سے ہے جن پر ان کی بیویاں حکومت کرتی ہیں"۔

"تو گویا اس کی بیوی کو بھی معلوم ہو گا کہ اس کا شوہر راشی ہے!"

"یقیناً اس وقت وہ اپنی بیوی کے سامنے گھگیا رہا ہو گا کہ مطلوبہ رقم واپس کر دے۔ وہ آپ سے بے حد خوف زدہ ہو گیا ہے اور رقم لینے ہی گھر گیا ہے۔" "چلو ایک کے تو کس بل نکلے!" میں طویل سانس لے کر بولا"۔ اب تم دوسرے کو سنبھالو جا کر! یہ کہتے ہوئے

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی' طمانیت کی مسکراہٹ!

اب ظہر کا وقت قریب تھا اس لیے میں نے وضو کر لیا۔ اسی دوران میں اذان ہو گئی۔ پولیس کے خلاف یہ سب کچھ کر کے میرے ضمیر پر بوجھ نہیں تھا۔ میں نے ایس ایچ او اور اے ایس آئی کو جو مہلت دی تھی کبھی کی گزر چکی تھی۔ اس کے علاوہ یہ کہ کم از کم ایس ایچ او کی نیت صاف نہیں تھی اس نے میری دی ہوئی مہلت سے فائدہ اٹھانے کی بجائے انتقامی کارروائی شروع کر دی تھی جس کا نتیجہ اسے بھگتنا پڑ رہا تھا۔ میرا ضمیر مطمئن تھا کیونکہ میں نے نہ کوئی گناہ کیا تھا نہ خلاف قانون کوئی کام۔ مجھے مہ پارہ نے خواہ مخواہ اپنی مطلب براری کے لیے پولیس کے چکّر میں پھنسا دیا تھا اور ایس ایچ او نے اس موقع سے پورا فائدہ اٹھایا تھا اس نے نہ صرف میری کوٹھی اور رقم ہڑپ کر لی تھی بلکہ میری عزّت نفس کو بھی شدید مجروح کیا تھا۔ وہ لالچی' خود غرض اور راشی شخص اب میرے نزدیک کسی رعایت کا مستحق نہیں تھا۔ میں نے اسی لیے ہمزاد کو اجازت دے دی تھی۔ اگر ایس ایچ او میری دی ہوئی مہلت سے فائدہ اٹھا کر معاملے کو راستی کے ساتھ ختم کر دیتا تو شاید میں اسے معاف کر دیتا' مگر اس نے طاقت و اقتدار کے نشے میں میری زندگی سے سے کھیلنا چاہا تھا۔ وہ یقیناً مجرمانہ ذہنیت کا مالک تھا اور ایسے لوگوں کو معاف کر دینا' سزا نہ دینا گناہ ہے۔ یہ لوگ اس سانپ کی طرح ہوتے ہیں جو موقع ملتے ہی ڈس لیتا ہے۔ وہ اس کا اہل نہیں تھا کہ اسے قانون کا محافظ کہا جا سکے۔ میں اس کے پنجے سے نکل جاتا تو وہ کسی اور بے گناہ کی گردن اپنی گرفت میں لے لیتا۔

اطمینان و سکون کے ساتھ نماز پڑھنے کے بعد میں دعا مانگ کر فارغ ہوا تھا کہ حوالات کا دروازہ کھلا۔ آنے والا اے ایس آئی تھا۔ وہ آتے ہی میرے پیروں پر گر گیا۔

میں نے اسے شانوں سے پکڑ کر اٹھایا اور سخت لہجے میں بولا۔ "سیدھے بیٹھو! تمہارا ایمان مجھے بہت کم زور معلوم ہوتا ہے۔ خدا کے سوا بندے کو کسی کے آگے نہیں جھکنا چاہیے!"

"میں..... میں دراصل دیر سے آنے کی معافی....."

"معافی مانگنے کا یہ طریقہ نہیں ہے!" میں اس کی بات کاٹ کر بہ دستور سخت بنا رہا۔ "معافی مجھ سے نہیں' خدا سے مانگو! گڑگڑاؤ اس کے سامنے اور توبہ کرو اپنے گناہوں سے!"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں"۔ وہ گلوگیر سی آواز میں بولا' پھر اپنی پھولی ہوئی پینٹ کی جیب سے سو سو روپوں کے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگا"۔ یہ..... یہ ساڑھے تین ہزار ہیں۔ خدا کے لیے انہیں قبول کر لیجیے! باقی..... باقی رقم میری بیوی

سے خرچ ہو گئی ہے اور یہ ..... یہ بھی اس نے بڑی منت سماجت کے بعد دیے ہیں۔ مجھے اسی
..... اسی لیے دیر ہو گئی تھی"۔

"زن مرید! بے غیرت!" مجھے اس پر غصّہ آ گیا۔ "جھوٹ بولا ہو گا اس عورت نے تم
سے! جب تم پوری تنخواہ اور حرام کی ساری کمائی اس کے ہاتھ میں لے جا کر دے دیتے ہو تو پھر
کہاں جاتی ہے وہ ساری رقم؟ ..... چپ کیوں ہو' جواب دو!"

وہ حیرت اور خوف سے میری طرف دیکھے جا رہا تھا۔ میں نے جب آخری الفاظ ادا کیے
تو وہ ہکلانے لگا۔ "اسے ..... سے ..... میری بیوی کو زیورات کا بہت شوق ہے"۔

"اور تم نے اسے بے لگام چھوڑ دیا ہے! قصوروار وہ بھی ہے' مگر اس سے زیادہ تم
قصوروار ہو کہ تم نے اسے حرام کی کمائی کا چسکا لگایا ہے' اپنی چادر سے باہر پاؤں پھیلانے کی
کوشش کی ہے!"

"تن ..... تنخواہ اتنی کم ملتی ہے کہ ..... کہ اس میں گزر نہیں ہوتی سرکار! میرے پانچ
بچے ہیں اور بوڑھے ماں باپ کی ذمے داری الگ ہے"۔ وہ روہانسی آواز میں اپنی صفائی پیش
کرنے لگا۔ یہ وہی اے ایس آئی تھا جس نے مجھے بغیر کسی جرم کے ایک مرتبہ بند کر دینے کی
دھمکی دی تھی اور زبردستی رشوت وصول کی تھی۔

"تم آنے والی نسلوں کو بھی جرم کی راہ پر ڈال رہے ہو۔ سوچو جس اولاد کو تم حرام کی
کمائی کھلا کر پرورش کر رہے ہو' وہ بڑی ہو کر کیا بنے گی! حرام کھانے کا یہ جواز نہیں کہ تنخواہ کم
ملتی ہے! رزق حلال کا ایک لقمہ' ایک سوکھی روٹی' حرام خوری سے کہیں بہتر ہے۔ تم نے اپنی
اوقات کیوں بھلا دی کہ ہو کیا! اپنی حدود میں کیوں نہیں رہے! زیادہ کی ہوس کیوں کی! کیا تم
صرف نام کے مسلمان ہو! کیا تم اس کے امتی کہلانے کا حق رکھتے ہو جو اپنے پیٹ سے پتھر
باندھ کر سو جاتا تھا! ہوس نے تمہیں اندھا کر دیا ہے' تم بھول بیٹھے ہو کہ تم کون ہو! چند روزہ
دنیا کی خاطر تم نے اپنی عاقبت خراب کر لی! کیا جواب دو گے تم اپنے خدا کو! یہی کہ تمہاری تنخواہ
کم تھی اور ذمے داریاں بہت تھیں! یہی کہ تمہاری بیوی کو زیورات کا شوق تھا! تمہیں جہنّم کی
آگ سے خوف نہیں آتا! تم گناہ کی دلدل میں ڈوب رہے ہو اور اپنے ساتھ اپنے لواحقین کو
بھی جہنّم کی طرف دھکیل رہے ہو۔ یہ ان سے تمہاری محبّت نہیں' تم ان کے لیے اچھا نہیں کر
رہے! برا کر رہے ہو' تو اس کی تمام تر ذمّے داری تم پر ہے' صرف تم پر!"

میں اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے دیکھ رہا تھا۔ برف پگھل رہی تھی اور یہی میرا
مقصد بھی تھا۔ یقیناً اس کے اندر سویا ہوا انسان جاگ اٹھا تھا اور شیطان کو شکست ہو چکی تھی۔

میں خاموشی سے اسے روتے ہوئے دیکھتا رہا' یہاں تک کہ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔
حوالات کا دروازہ ابھی تک نیم وا تھا' مگر سپاہی وہاں نظر نہیں آ رہا تھا۔ یا تو اے ایس
آئی نے اسے وقتی طور پر دروازے کے سامنے کھڑے رہنے سے منع کر دیا تھا یا پھر وہ خود ہی
وہاں سے ہٹ گیا تھا۔ اگر دروازہ کھول کر وہ خود وہاں سے ہٹا تھا تو اس کی یہی وجہ ہو سکتی تھی کہ
مجھ سے بے حد مرعوب ہو چکا ہے۔ میں نے دراصل اس طرف اسی لیے نگاہ کی تھی کہ کہیں
اے ایس آئی کی ہچکیاں سن کر وہ سپاہی یا کوئی اور ادھر متوجہ نہ ہو گیا ہو۔ ادھر سے مطمئن ہو کر
میں نے اے ایس آئی کا شانہ تھپکا اور پہلی بار نرمی سے اسے مخاطب کیا۔ "مجھے روپوں کی
ضرورت نہیں تھی۔ میں نے محض تمہارے باطن کو بیدار کرنے کے لیے یہ مطالبہ کیا تھا۔
چپ ہو جاؤ! اور جیسا میں نے کہا ہے' خدا کے حضور آنسو بہاؤ۔ وہ گناہوں کو معاف کرنے والا
ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اب تم اپنی زندگی کا رخ بدل دو گے۔ ان روپوں کا اختیار میں تمہیں دیتا
ہوں جس طرح چاہو خرچ کرنا۔ انہیں ایک دوست کی طرف سے نذرانہ سمجھ کر قبول کر لو۔
میں اپنی مرضی سے بہ طور امداد تمہیں یہ رقم دے رہا ہوں۔ یہ اب تم پر حلال ہے' مگر اس کے
علاوہ تمہارے پاس جو کچھ تمہاری محنت کی کمائی سے ہٹ کر ہے' اسے راہ خدا میں خیرات کر
دو۔ ممکن ہے تمہاری اس نیکی کا اجر تمہیں مل جائے اور ممکن ہے نہ ملے کیوں کہ خدا کی راہ
میں دیا جانے والا مال بھی حلال ہونا چاہیے۔ تم اجر کی توقع نہ رکھنا' ہاں خدا کو تمہارا یہ عمل
پسند آیا تو یقیناً تمہیں اس کا بھی اجر دے گا۔ اس کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ بس
توبہ شرط ہے"۔

میرے بدلے ہوئے رویے نے اس پر اچھا اثر مرتّب کیا۔ کچھ دیر بعد اس کی حالت
سنبھل گئی۔ ندامت کے آنسوؤں نے اس کے چہرے سے جیسے گناہوں کی سیاہی کو دھو دیا تھا۔
وہ اب حقیقتاً مجھے کچھ بدلا بدلا سا لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اب وہ کرختگی نظر نہیں آ رہی
تھی جو پہلے اس کی شخصیت کا حصّہ تھی۔

"آپ نے مجھے راہِ راست دکھا کر یقیناً مجھ پر احسان کیا ہے"۔ وہ جذبات سے مغلوب
آواز میں بولا۔ "میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا"۔

"یہ احسان نہیں' ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اپنے دینی بھائی کو نیکی کا راستہ دکھائے۔
یہ روپے اٹھا کر واپس جیب میں رکھ لو اور جاؤ۔

اس نے روپے لینے سے انکار کیا' مگر میرا اصرار بڑھا تو وہ راضی ہو گیا۔ اس کے چہرے
سے اب بھی خجالت کا اظہار ہو رہا تھا۔

اے ایس آئی حوّالات سے نکل کر جا رہا تھا کہ میں نے ہمزاد کو اندر آتے دیکھا، مگر اس نے حوّالات کا دروازہ بند ہو جانے کے بعد ہی لب کشائی کی۔ اس کی اطلاع کے مطابق کچھ دیر بعد ہی مجھے رہا کیا جانے والا تھا۔

"یہ کیسے ہو گیا؟ اور تمہیں واپسی میں اتنی دیر کیوں ہو گئی؟" میں نے ایک ہی سانس میں اس سے دو سوال کر دیے۔

ہمزاد مجھے تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا۔ ہوا یہ کہ جب کیس کی فائل گم ہو گئی تو ایس پی نے ایس ایچ او سے تحریری جواب طلب کر لیا، اسی کے ساتھ زبانی بھی اسے بہت لتاڑ پلائی۔ ایس ایچ او نے اس کی خوشامد در آمد کر کے یہ اجازت لے لی کہ میری جو ملازمائیں ابھی تک اسپتال میں زیرِ علاج تھیں، ان کے بیانات دوبارہ لے سکے۔ پھر وہ سیدھا اسپتال کی طرف دوڑا۔ میری ملازماؤں نے اس مرتبہ وہی بیانات دیے جن کی مجھے توقع تھی۔ اب وہ مہ پارہ کے سحر سے آزاد تھیں اس لیے انہوں نے سچّی بات کہہ دی۔ سارا الزام انہوں نے شمبھو پر لگایا جس نے زبردستی میری کوٹھی پر قبضہ کر لیا تھا۔ ایس ایچ او نے انہیں لاکھ دھمکیاں دیں اور ڈرایا کہ وہ مجھ پر الزام لگا دیں، مگر ایسا ممکن نہ ہوا کیوں کہ ہمزاد وہاں موجود تھا۔ اس طرف سے مایوس ہو کر ایس ایچ او نے میرے محلے والوں سے رابطہ قائم کیا، لیکن کوئی بھی میرے خلاف دوبارہ بیان دینے پر راضی نہ ہوا۔ انہوں نے اس سے بھی انکار کر دیا کہ ہم نے شیخ کرامت کے خلاف پولیس کو کوئی درخواست دی تھی۔ اس طرح وہ درخواست بھی مشتبہ قرار پائی جس کی بنیاد پر پولیس نے میرے خلاف کارروائی کی تھی۔ نتیجتہً ایس ایچ او مایوس ہو کر تھانے لوٹ آیا۔ اس کی ان حرکات کا مقصد یہ تھا کہ اب بھی وہ اپنے دفاع میں مجھے پھنسوانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ ہمزاد کی کارگزاری کے سبب وہ واقعہ بھی ایس پی کے علم میں آ گیا جو مجھے حوّالات میں پیش آیا تھا۔ اس نے ان تمام سپاہیوں کو طلب کر لیا جنہوں نے ایس ایچ او کے حکم پر مجھے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے ایس پی کو واضح الفاظ میں بتا دیا کہ ان کے ایس ایچ او نے انہیں کیا حکم دیا تھا۔

ایس پی کے نزدیک یہ معاملہ سنگین نوعیت اختیار کر گیا تھا۔ اس نے فون پر آئی جی سے احکام لیے اور پھر ایس ایچ او پر پولیس کیس قائم کر کے اسے گرفتار کر لیا۔ اس پر الزام تھا کہ اس نے دیدہ دانستہ اپنے اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ایک زیرِ حراست شخص کو قتل کرانے کا حکم دیا تھا۔ یہ قتلِ عمد کا کیس تھا۔ فی الوقت ان تمام سپاہیوں کو بھی گرفتار کر لیا گیا تھا جنہوں نے اپنے افسر کے حکم پر قانون کو ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اسی کے ساتھ ایس پی نے میری

رہائی کے احکام جاری کر دیے تھے۔ اس کے خیال میں یہ ساری سازش خود ایس ایچ او کے ذہن کی پیداوار تھی جس نے ایک فرضی درخواست ایس پی کو بھیجی اور اس کی ایک نقل آئی جی کو روانہ کی، پھر میری ملازماؤں کو ڈرا دھمکا کر میرے خلاف بیانات لیے اور مجھے حوالات میں بند کر دیا۔ اس کے بعد جب اسے افشائے راز کا اندیشہ ہوا تو اس نے کیس کی فائل غائب کر دی اور اسی کے ساتھ مجھے قتل کرانا چاہا۔

پولیس ہیڈ آفس سے فوری طور پر ایک دوسرے ایس ایچ او کو اس تھانے کا چارج لینے کے لیے روانہ کر دیا گیا تھا جو کچھ دیر بعد پہنچنے والا تھا۔ اس کے چارج لیتے ہی مجھے رہا کر دیا جاتا۔

ہمزاد سے ساری رُوداد سننے کے بعد میں نے ایک اور بات کی وضاحت چاہی۔ "ایس پی کے نزدیک ایس ایچ او نے میرے خلاف یہ قدم کیوں اٹھایا۔ اس سلسلے میں بھی تو اس نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہو گا!"

"جی ہاں" ۔ ہمزاد نے جواب دیا۔ "اس نے فون پر آئی جی سے گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ سارا کھیل مجھ سے کوئی بڑی رقم اینٹھنے کے لیے کھیلا گیا ہو گا"۔

"ظاہر ہے کہ نیا ایس ایچ او میرا بیان بھی لے گا۔ تمہارے خیال میں میرا کیا بیان ہونا چاہیے؟" میں نے کچھ سوچتے ہوئے سوال کیا۔

"وہی جو ایس پی کا خیال ہے" ۔ ہمزاد نے مشورہ دیا۔

"مگر یہ حقیقت تو نہیں ہے۔ یہ تو سراسر جھوٹ ہو گا!" میں نے اعتراض کیا۔

"لیکن اس نے آپ سے رشوت تو بہرحال لی تھی نا؟"

"ہاں، مگر ترغیب دینے والا بھی تو میں ہی تھا!"

ہمزاد میری بات سن کر سوچ میں پڑ گیا، پھر کچھ دیر بعد بولا۔ "میں محسوس کر رہا ہوں کہ اب آپ کا اندازِ فکر یکسر بدل گیا ہے۔ پہلے تو آپ اس طرح نہیں سوچتے تھے"۔

"ہاں تم ٹھیک سمجھے۔ میں اب گناہوں سے توبہ کر چکا ہوں۔ یقیناً ایس ایچ او نے اپنے اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھایا ہے، رشوت بھی لی ہے اور مجھے قتل بھی کرانا چاہا ہے، لیکن یہ بات قطعی غلط ہے کہ اس نے میرے خلاف یہ ساری سازش کی تھی۔ اسے صرف اسی جرم کی سزا ملنا چاہیے جو اس سے حقیقتاً سرزد ہوا ہے" ۔ میں نے صاف صاف الفاظ میں کہہ دیا۔

"پھر جو آپ کے نزدیک سچ ہے، اسی کا اظہار کیجیے گا"۔

ہمزاد کا جواب سن کر میں اپنے ذہن میں واقعات کو ترتیب دینے لگا۔

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ نئے ایس ایچ او کے سامنے میری طلبی ہو گئی۔ ایک سب انسپکٹر بھی میرا بیان لکھنے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ نئے ایس ایچ او کے چہرے سے قدرے خوف اور سراسیمگی کا اظہار ہو رہا تھا۔ غالباً ماتحت عملے نے اسے میرے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ اس کے علاوہ اُسے شاید ایس پی کا مطمع نظر بھی معلوم ہو گیا تھا جس کے نزدیک میں بے قصور تھا۔

میں جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "آیئے تشریف لایئے جناب!" اس کی تقلید سب انسپکٹر نے بھی کی تھی۔ اس نے میری طرف مصافحے کے لیے بھی ہاتھ بڑھایا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملایا تو وہ بولا۔ "مجھے سراج الدین کہتے ہیں اور آپ یقیناً شیخ کرامت ہیں!" اس نے گرم جوشی سے میرا ہاتھ دبایا۔ "تشریف رکھیں"۔ اس نے میز کے سامنے پڑی ہوئی کرسیوں کی طرف اشارہ کیا اور پھر جب تک میں ایک کرسی پر بیٹھ نہ گیا، وہ کھڑا ہی رہا۔

عموماً" پولیس والے اتنے با اخلاق نہیں ہوتے، مگر اس وقت صورت حال مختلف تھی۔ میں اس کے اخلاق تہذیب اور شائستگی کا سبب اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔

نئے ایس ایچ او سراج الدّین نے میرا بیان قلم بند کرانے سے پہلے مجھے بتا دیا تھا کہ بیان لینے کے بعد آپ کو باعزّت طور پر جانے کی اجازت ہے۔ میں نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

پھر میرا بیان قلم بند کیا جانے لگا جو حقائق پر مبنی تھا۔ "اب سے چالیس دن قبل میں نے ایک وظیفہ شروع کیا جس کے لیے مقررہ وقت اور جگہ کی قید تھی ورنہ وظیفہ الٹا ہو جاتا اور میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔ کوئی بھی وظیفہ بہ آسانی پورا نہیں ہو جاتا۔ اس کے دوران میں عامل بڑے پُراسرار اور ناقابل یقین حالات سے گزرتا ہے، لیکن لگن سچّی ہو، عامل میں خود اعتمادی کا فقدان نہ ہو تو خدا اسے کامیابی عطا کر دیتا ہے کہ سب کچھ اسی کی ذات عطا کرنے والی ہے۔ انسان میں جتنی بھی ظاہری اور باطنی قوّتیں ہیں اسی ذات واحد کا عطیہ ہیں"۔

"بے شک ..... بے شک!" ایس ایچ او سراج الدّین درمیان میں بول اٹھا جو مجھے گراں گزرا اس لیے بھی کہ اس کا لہجہ الفاظ کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔

"اگر آپ درمیان میں نہ بولیں تو ممنون ہوں گا میں!" میں نے شائستگی کے ساتھ اسے ٹوک دیا۔

"جی بجا فرمایا آپ نے!" وہ فوراً ہی گردن ہلا کر بولا۔ "اب یہ گستاخی نہیں ہو گی"

کچھ دیر توقف کے بعد میں نے پھر اپنا بیان شروع کیا۔ "تو گویا میں یہ عرض کر رہا تھا کہ خدا کی ذات ہر قوّت کا سرچشمہ ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے بندوں کی آزمائش کے لیے انہیں کچھ محدود اختیارات سے بھی نوازا ہے۔ کچھ ایسے ہیں جو ان اختیارات ہی کو سب کچھ سمجھ کر اختیارات عطا کرنے والی ذات کو بھول جاتے ہیں۔ اسی انداز فکر اور غفلت سے ساری برائیاں جنم لیتی ہیں۔ میرے ساتھ یہ ہوا کہ عمل کے دوران میں مجھے کچھ پُراسرار واقعات پیش آئے جنہیں میں اپنی آزمائش کا نام دیتا ہوں۔ پہلی ہی شب میرے چند ملازمین کی حماقت سے معاملہ پولیس تک پہنچ گیا۔ پولیس کے پاس میرے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا، مگر اس کے باوجود سابق ایس ایچ او ملک فیروز دین نے مجھے تھانے بلا کر ڈرایا دھمکایا اور پانچ ہزار کی رقم اینٹھ لی۔ میں اس دوران میں زیر علاج تھا اور اپنے عمل کے سبب گھر ہی پر پڑا رہنا ضروری تھا۔ اس کے لیے میں نے اپنی کوٹھی میں ایک ڈاکٹر اور دو نرسوں کو رکھا ہوا تھا۔ انہی میں سے ایک نرس نادرہ، ایک شب میرے خلاف دست درازی کی رپورٹ کرنے تھانے پہنچ گئی۔ اس مرتبہ بھی مجھے اپنے عمل کی شرائط پوری کرنے کی خاطر مجبوراً پولیس کے مطالبے کو پورا کرنا پڑا۔ دوسرے دن صبح نرس نادرہ کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور وہ میری صفائی پیش کرنے تھانے پہنچ گئی کہ مجرم وہ ہے، میں نہیں۔ لطف کی بات یہ کہ ایف آئی آر ہی نہیں لکھی گئی تھی، مگر ایس ایچ او ملک فیروز دین نے سمجھوتے کی آڑ میں اس غریب نرس نادرہ سے بھی پانچ سو روپے رشوت لے لی اور مجھے موٹی آسامی سمجھ کر اس نے اچھی طرح رگڑا۔ مختصراً" یہ کہ اس نے مجھ سے پندرہ ہزار روپے اینٹھ لیے۔ اسی دوران میں پُراسرار قوّتوں کا مالک ایک شخص شمبھو زبردستی میری کوٹھی پر قابض ہو گیا۔ کوٹھی کا صرف عقبی حصّہ میرے قبضے میں رہ گیا۔ شمبھو ذہنی مریض اور اذیت پسند تھا۔ میں اپنی ملازماؤں پر ظلم و تشدّد ہونے کی آوازیں سنتا تھا، مگر اس وقت بے بس تھا۔ میں خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا۔ اب میرا عمل پورا ہونے میں صرف چند دن رہ گئے تھے۔ چالیس دن پورے ہونے میں صرف تین راتیں باقی تھیں کہ ایک دن صبح سابق ایس ایچ او پھر آدھمکا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ محلے والوں نے میرے خلاف درخواست دی ہے۔ وہ درخواست خود میں نے بھی پڑھی تھی جو ایس پی صاحب کے نام تھی اور اس کی ایک نقل آئی جی صاحب کو بھی بھیجی گئی تھی۔ وہ درخواست جعلی تھی یا نہیں، اس سلسلے میں میری رائے محفوظ ہے۔ بہرحال ایس ایچ او ملک فیروز دین نے میری کوٹھی سے میری ہی ملازماؤں کو برآمد کر لیا جن پر دراصل شمبھو نے تشدد کیا تھا، میں نے نہیں۔ خود شمبھو میری ایک ملازمہ سریتا کو لے کر فرار ہو گیا تھا۔ بہرحال ایس ایچ او نے میرے بیان پر یقین نہیں کیا کہ

میں بے گناہ ہوں۔ اس کا سب میری ملازماؤں کے بیانات بھی تھے جو اس وقت سحرزدہ تھیں۔ انہوں نے اپنے بیانات میں مجھی پر تشدد کا الزام لگایا تھا۔ اب گویا میں پوری طرح پھنس چکا تھا۔ میری مشکل یہ تھا کہ مجھے ہر حال میں مقررہ وقت اور مقررہ جگہ پر اپنا وظیفہ جاری رکھنا تھا ورنہ میں زندہ نہ بچتا۔ میری اسی مجبوری سے ایس ایچ او نے پھر فائدہ اٹھایا۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے اپنی زندگی بچانے کے لیے ایس ایچ او ملک فیروز دین کو رشوت کی ترغیب دی"۔ پھر میں نے وہ سب کچھ بیان کر دیا جو ایس ایچ او اور میرے درمیان طے ہوا تھا' یعنی یہ کہ ایس ایچ او رات کے وقت مجھے عمل کرنے کے لیے جانے دے گا اور صبح ہوتے ہوتے میں پھر تھانے لوٹ آؤں گا"۔ اسی دن ایس ایچ او نے میری کوٹھی کسی شخص ظفر حمید کے نام کرالی جو غالباً اس کا کوئی قریبی عزیز ہو گا۔ میں میں نے کاغذات پر دستخط کر دیے۔ میری کوٹھی کے تمام کاغذات ابھی تک ایس ایچ او ملک فیروز دین کے پاس ہیں۔ میری کوٹھی اس نے بطور رشوت ہتھیالی تھی' صرف یہ رعایت دینے پر کہ رات کے وقت میں وظیفہ پڑھنے اپنی کوٹھی جا سکتا ہوں۔ میں نے زبانی معاہدے کی پابندی کی اور وقت مقررہ پر تھانے پہنچتا رہا تاکہ اس پر کوئی حرف نہ آئے۔ گزشتہ شب آخری تھی۔ میرا وظیفہ پورا ہو گیا اور اس طرح میری زندگی بچ گئی۔ اب میں مجبور نہیں تھا۔ ایس ایچ او ملک فیروز دین نے اپنے اختیارات اور میری مجبوری سے بہرحال ناجائز فائدہ اٹھایا تھا۔ میں نے اسی لیے آج صبح اس سے رشوت کی واپسی کا مطالبہ کیا تھا۔ اس نے بہ ظاہر ہامی بھر لی' مگر دوسری طرف اس نے تفتیش اور میری زبان کھلوانے کی آڑ میں مجھے قتل کرانا چاہا۔" پھر میں نے اپنے اوپر ہونے والے قاتلانہ حملے کی تفصیل بیان کی اور کہا۔ "مگر خدا جسے بچانا چاہتا ہے' ہر حال بچا لیتا ہے۔" زندگی اور موت کسی کے اختیار میں نہیں۔ پھر خدا ہی نے میری مدد کی اور دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو گیا۔ حقیقت کھل کر سامنے آ گئی۔ میں اس پر خدا کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔" میں نے دانستہ اپنے بیان میں اے ایس آئی کو بھی رشوت دینے کا ذکر نہیں کیا تھا کیوں کہ وہ اب توبہ کر چکا تھا۔

نیا ایس ایچ او میرا بیان سن کر اور اسے قلم بند کرانے کے بعد کچھ دیر تک سوچتا رہا' پھر محتاط لہجے میں بولا۔ "آپ کے بیان نے بڑی حد تک کیس کی صورت حال کو بدل دیا ہے۔ ایس پی صاحب نے مجھے جو کچھ بتایا تھا' آپ کے بیان سے اس کی نفی ہوتی ہے۔ دوم یہ کہ خود آپ نے اپنے بیان میں یہ اعتراف کیا ہے کہ ایک مرتبہ بلکہ..... دو بار رشوت کی ترغیب آپ نے دی تھی' اس کا سبب خواہ کچھ بھی ہو۔ بہرحال رشوت لینا اور رشوت دینا دونوں ہی قانون کی نظر میں جرم ہیں۔ ممکن ہے کہ آپ کا یہ تحریری بیان پڑھ کر ایس پی صاحب اپنا یہ حکم واپس

لے لیں کہ آپ کو رہا کر دیا جائے۔ آپ تشریف رکھیں' میں ابھی ایس پی صاحب سے مل کر آتا ہوں"۔

میں اپنے تحریری بیان پر دستخط کر چکا تھا۔ ایس ایچ او نے سب انسپکٹر سے وہ بیان لے لیا اور اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ہمزاد مودب ایک طرف کھڑا تھا۔ اس نے میر جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ میں نے اسے خاموش کھڑے رہنے کا اشارہ کر دیا۔ میں اس معاملے میں ہمزاد کی مداخلت نہیں چاہتا تھا' خواہ ایس پی مجھے رہا کیے جانے کا حکم واپس ہی لے لیتا۔ حالات کچھ بھی رہے ہوں' مجرم بہرحال میں بھی تھا۔ میں نے رشوت کی ترغیب دی تھی اور اس کی سزا بھگتنے کے لیے تیار تھا تاکہ میرے ضمیر پر کوئی بجھ نہ رہے۔

میں یہ بھی سمجھ چکا تھا کہ نیا ایس ایچ او سراج الدین غیر ضروری طور پر اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ وہ بھی بہرحال پولیس ہی کے محکمے سے تعلق رکھتا تھا اور ملک فیروز دین ہی کا بھائی بند معلوم ہوتا تھا ورنہ خواہ مخواہ اپنی قابلیت نہ چھانٹتا۔ پھر جب تک وہ واپس نہ آ گیا' میں بے چینی سے اس کا انتظار کرتا رہا۔ اس مرتبہ اس کے ساتھ ایک سپاہی بھی تھا اور اس سپاہی کو میں اچھی طرح پہچانتا تھا۔ اس کی ڈیوٹی حوالات کے دروازے پر تھی۔

کمرے میں میں داخل ہوتے ہی اسے نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے سپاہی سے کہا۔ "انہیں لے جا کر حوالات میں بند کر دو!"

اسرار و فسوں کی محفل
ابھی سجی ہوئی ہے
اپنے وقت کی مقبول ترین سرگزشت
ابھی جاری ہے
بقیہ واقعات دوسرے
حصے میں پڑھیں